AUGUST
2026

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ
بیاض
لاہور

نون میم راشد
AUGUST 01

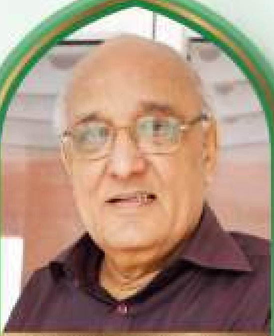

امجد اسلام امجد
AUGUST 04

سالگرہ مبارک

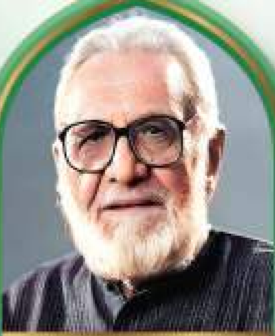

اشفاق احمد
AUGUST 22

ادا جعفری
AUGUST 22

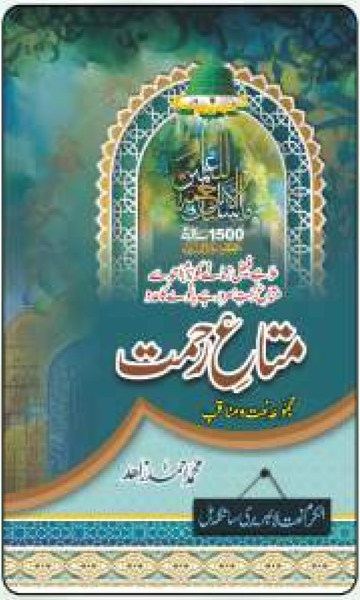
متاعِ رحمت

زرِ اشک
سلام و کلام

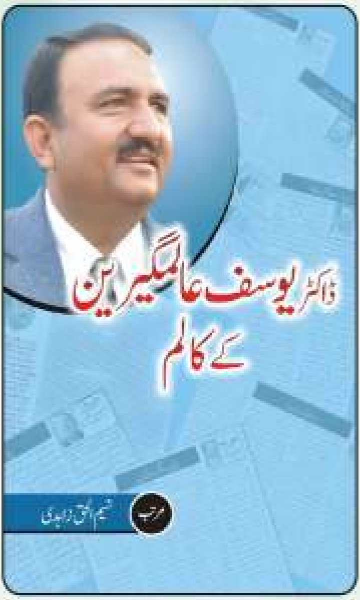
ڈاکٹر یوسف عالمگیرین
کے کالم
مرتب

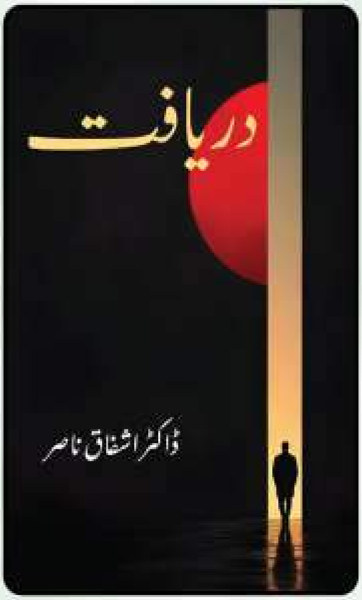
دریافت
ڈاکٹر اشفاق ناصر

بانی مدیر: خالد احمد

غزل

بن کر سپردگی کا تصور پگھل کے آ
مجھ تک تو اپنے جسم کے شعلوں پہ چل کے آ

پیکر پہ سج سکے ترے معیار کا لباس
اپنے تصورات کے سانچے میں ڈھل کے آ

عرفان حد وہم ، تو ، وجدان حد فہم،
احساس کی حدود سے آگے سنبھل کے آ

جلدی نہ کر ، نظر سے اتر ، دیکھ بھال کر،
کہسار کے فراز کے نیچے سنبھل کے آ

شہر عمل میں بھاگتے لمحوں کے ساتھ بھاگ
خالد حصار فکر سے باہر نکل کے آ

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL

Freight Forwarding

Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

Karachi: (021) 34541301-7 Lahore: (042) 37080901-9
Sialkot: (052) 3554301-6 Rawalpindi/Islamabad: (051) 5162704-5
Faisalabad: (041) 8542924 Peshawar: (091) 5252311 Multan: (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ
بیاض
لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 34 - اگست 2026 - شمارہ نمبر: 8

مدیر اعلیٰ: عمران منظور

مدیر: نعمان منظور

مجلس ادارت	اعجاز رضوی	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران
کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: ن م راشد، امجد اسلام امجد، اشفاق احمد، ادا جعفری
قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور
A/c Title: Monthly BAYYAZ
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور-53700
فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517
Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر، پبلشر اور پرنٹر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر نزد فارمیسی متصل اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	سید ریاض حسین زیدی ، خاور اعجاز ، محمد افضال انجم	7 تا 9
2	نعت	جلیل عالی، نسیم سحر، نبیل احمد نبیل، سرور حسین نقشبندی، نوید عاجز	10 تا 14
3	سلام	سید افسر ساجد، راحت سرحدی، شبہ طراز، ارشد محمود ارشد، احمد نواز	15 تا 19
4	عقیدت	فیض رسول فیضان، مرزا آصف رسول، زعیم رشید	20 تا 22
5	رباعیات	خاور اعجاز، گلزار بخاری، محمد نصیر زندہ، سعید اشعر	23 تا 26
6	ہائیکو	آفتاب خان	27 تا 28
7	ماہیے	سیما پیروز	29
8	افسانے	سیما پیروز، حامد یزدانی، کلیم خارجی، عامر عباس ناصر اعوان، سید تحسین گیلانی، بابر امین ابر، عمران امین، کومل شہزادی، رانا محمد شاہد، سدرہ عندلیب، نعمان منظور	30 تا 84
9	غزلیں	خالد احمد، جلیل عالی، اعجاز کنور راجہ، نسیم سحر، صفدر صدیق رضی، خاور اعجاز، شریف ساجد، محمد انیس انصاری، اقبال سرو بہ	85 تا 149

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
9	غزلیں	قیوم طاہر، راحت سرحدی، شوکت محمود شوکت، افتخار شاہد اجمل اعجاز، مسعود احمد، افضل ہزاروی، سعد اللہ شاہ اکرم ناصر، جسارت خیالی، افروز رضوی، محمد سلیم ساگر عافر شہزاد، شاہنواز زیدی، فرخندہ شمیم، شبہ طراز، تنویر قاضی سعید راجہ، رخشندہ نوید، محمد افضال انجم، خالد انور ہمایوں پرویز شاہد، نبیل احمد نبیل، علمدار حسین، افشاں سجاد افتخار الحق، عاشق جعفری، سرور فرحان، شفیق آصف، اعجاز دانش اصغر علی بلوچ، شبیر نازش، آفتاب خان، علی حسین عابدی ارشد محمود ارشد، آسناتھ کنول، الماس شبی، راجہ عبدالقیوم احمد مسعود قریشی، اکرم جاذب، میتھیو محسن، شاہ روم خان ولی انصر منیر، امر مہکی، تابش ردولوی، ظہور چوہان، فیض رسول فیضان انوار انجم، محمد اشفاق بیگ، حیا قریشی، عابد معروف مغل، عبدالرؤف زین کرن گوندل، حافظ الیاس حافظ، شمع ملک، طلحہ غفور	85 تا 149
10	مضامین	جلیل عالی، سلمیٰ اعوان، منور ہاشمی، نذر عابد، نذیر قیصر شوکت محمود شوکت، جمیل احمد عدیل، افتخار الحق، حسین سحر، طاہر شبیر ارشد محمود ارشد، انصر منیر، یاسمین، ہمایون خان	150 تا 215
11	طنز و مزاح خاکہ	نور کمال شاہ	216 تا 220
12	نظمیں	خالد احمد، جلیل عالی، سید افسر ساجد، تسنیم سحر، گلزار بخاری حامد یزدانی، خورشید ربانی، فیاض تحسین، محمد انیس انصاری، طلعت شبیر شاہنواز زیدی، فیض رسول فیضان، سمیع اللہ عرفی، دانش عزیز نائلہ راٹھور، امجد بابر، عابد خان عابد، محمد عبداللہ، عمران شاہد	221 تا 241

حمد

کشت جان و دل پہ برسا ٹوٹ کر ابر کرم
یوں عنایت کی ہوئی بارش کہ صحرا بس گیا

تو محیط کل جہاں، تیرے ازل، تیرے ابد
تو کہ لامحدود ہے، موجود ہر جا برملا

کوئی ہے حرکت میں ہر پل، منجمد کوئی وجود
جو ہے جس بھی حال میں، وہ تیرے ہی دم سے ہوا

سب تری تعریف میں رطب اللساں پائے گئے
چاند تارے، کہکشائیں اور یہ ارض و سما

چہچہاتا ہے پرندہ، لہکی مچھلی زیر آب
اپنے اپنے دائرے میں ہر کوئی محو ثنا

تو ذرا سا دیکھ لے اشک ندامت آنکھ میں
تیرے جام عفو سے اس کو ملے آب شفا

بھاری پتھر کے تلے ہے کیڑا کیسا مطمئن
رزق حسب حال اس کو تو نے ایسا دے دیا

آشیاں کے درپے آزار تھی برق تپاں
ایک تیرا ہی اشارہ تھا کہ طوفاں تھم گیا

یہ وبائیں روز افزوں باعث آزار ہیں
ٹال دے ساری بلائیں، ان سے تو ہم کو بچا

ہر طرح کی ہر صعوبت کو ملی آسودگی
صدق دل سے جو پکارا رحم کر میرے خدا

اس نے عرض مدعا کی لاج رکھی ہے ریاض
اس نے تو میری طلب سے بھی زیادہ دے دیا

سید ریاض حسین زیدی

حمد

راہِ دشوار کو ہموار بنا دیتا ہے
ہر اندھیرے میں کوئی شمع جلا دیتا ہے

اشک در اشک عبادت کا سفر رہتا ہے
حجرۂ دل میں ترا ذکر مگر رہتا ہے

مسجدِ روح میں بیٹھا ہُوں کہ توصیف لِکھوں
سجدۂ شوق مکمل ہو تو تعریف لِکھوں

چاہتا ہُوں تری رحمت کی نظر ہو مجھ پر
مَیں سنور جاؤں ترا لطف اگر ہو مجھ پر

حشر میں کاش کے دیدار ترا ہو جائے
مجھ سے ناچیز کو رتبہ یہ عطا ہو جائے

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ تو محور ہے ، کل تعریفوں کا
چمکانے والا ، بجھتی سطروں کا

حمد

کب نہیں رب سے اپنا رہا رابطہ
اس سے اپنا ہے سب سے جدا رابطہ

خوف اور اس کی الفت دلوں میں رہے
یہ بھی ہے اصل میں اک بجا رابطہ

جب بھی گھبرائیں سجدے میں جا گریں
پھر یہ سمجھو کہ بس ہوگیا رابطہ

شکر ہے اس کی تعریف ہونٹوں پہ ہے
ہم میں اور اس میں ہے یہ ثنا رابطہ

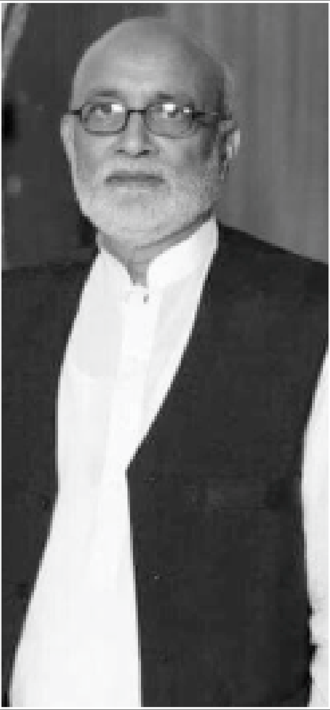

اس کی جانب توجہ جو کر لے کوئی
اس سے کرتا ہے خود بھی خدا رابطہ

ذکر اس کا زبانوں پہ جاری رہے
ہے یہی اس سے، سب سے بڑا رابطہ

اس سے کرتا ہوں تجدید ہر ربط کی
روز ہوتا ہے اس سے نیا رابطہ

جب بھی ہاتھ اپنے بے ساختہ اُٹھ گئے
بن گئی اپنے ربّ سے دعا رابطہ

محمد افضال انجم

نعتؐ

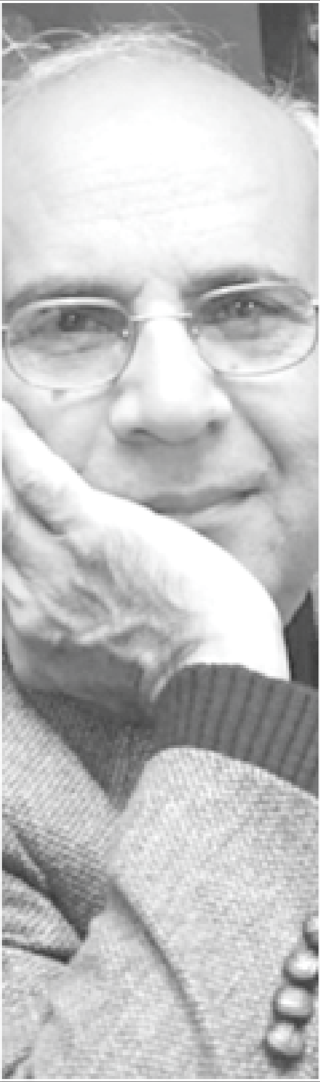

جتنا ہے نام اتنا کہاں نقدِ کام ہے
یہ سب عطائے نسبتِ خیرؐ الانام ہے

بس ایک اُسؐ کی یاد ہے آہنگِ زندگی
دھڑکن کی دُھن پہ وردِ محمدؐ مدام ہے

معجز نمائیاں کہیں کیا اُسؐ کے ذکر کی
ہر درد سے نجات کا اک اسمِ تام ہے

قبلہ نما بصیرتِ سیرت نہیں جسے
وہ رہروِ خیال و خبر کج خرام ہے

اُس نورِ خیر و خوب کا احساں ہے سربسر
دل آشنائے فرقِ حلال و حرام ہے

اپنے قلم کو نعت کا منصب ہوا عطا
فرض اس کا ہم پہ اور بھی اب احترام ہے

عالی ہمارے حرف دیوں میں اُسی کی لَو
روشن سرِ نگاہ جو ماہِ تمام ہے

جلیل عالی

نعتؐ

آقاؐ، ترے الطاف کی بس ایک نظر کی
''محتاج ہے یہ ساری خدائی ترے در کی''

سمجھوں گا کہ پہنچی ہے ٹھکانے پہ بالآخر
گر خاک مدینے میں ملے خاک بسر کی

جانا ہو جدھر بھی، ہو مدینے میں پڑاؤ
اے کاش کہ صورت نکل آئے یہ سفر کی

ہوتا ہوں مدینے میں مَیں مہمان انہیؐ کا
حاجت ہی نہیں ہوتی کوئی زادِ سفر کی

مکے میں بھی انوار کی رحمت ہے برستی
کیفیتیں کچھ اور ترے نور نگر کی !

آئینِ محبت جو کیا آپؐ نے نافذ
تقدیر بدلتی ہے وہاں نوعِ بشر کی

اللہ کا بھی مجھ پہ کرم ہونے لگے گا
جس لمحہ مرے حال پہ آقاؐ نے نظر کی

جب واپسی ہوتی ہے نسیمؔ اُن کے نگر سے
حالت نہ کوئی پوچھے مرے دیدۂ تر کی

یہ معجزہ بھی اُنؐ کی سفارش سے ہوا ہے
تقدیر کی گرتی ہوئی دیوار بھی سَر کی

پوچھے نہ کوئی مجھ سے کہ کیا ہوتی ہے صورت
انوار کی بارش میں مرے شام و سحر کی

معراج پہ جب جانے لگے ہوں مرے آقاؐ
رفتار بدل جاتی ہے تب شمس و قمر کی

نسیمِ سحر

نعتؐ

ترے کرم کا طلب گار اے شہِؐ ابرار
ہر ایک بندۂ نادار اے شہِؐ ابرار

اندھیری رات میں بھی راستہ دِکھاتا ہے
ترا یقیں ترا کردار اے شہِؐ ابرار

ترے لیے سبھی عالم وُجود میں آئے
ہمارے مالک و مختار اے شہِؐ ابرار

بکھرنے والا ہے شیرازۂ مسلمانی
غمِ جہاں کی ہے یلغار اے شہِؐ ابرار

پڑی ہے برسوں سے اُمت یہ خوابِ غفلت میں
کہ اب تو کیجیے بیدار اے شہِؐ ابرار

ٹھہرنے دیتا نہیں شوقِ حاضری، لیکن
کھڑی ہے راہ میں دیوار اے شہِؐ ابرار

کہ اُٹھ رہی ہے زمانے کی اُنگلیاں ہم پر
بدل دیں فتح میں اب ہار اے شہِؐ ابرار

نہ دیکھے آنکھ اُٹھا کے زر و گہر کو کبھی
ترے کرم کا طلب گار اے شہِؐ ابرار

پڑا ہوا ہے ترے دَر پہ اِک زمانے سے
نبیل خستہ و نادار اے شہِؐ ابرار

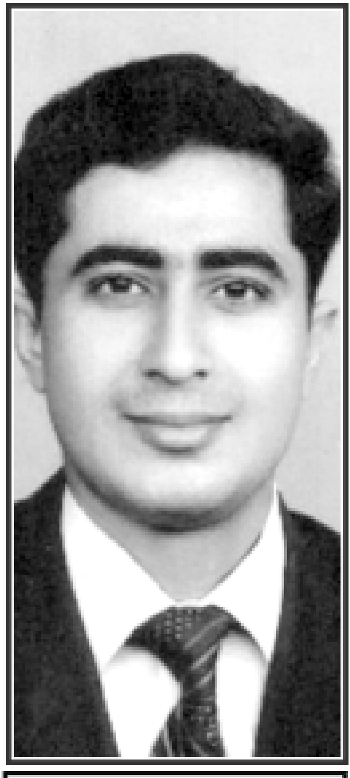

نبیل احمد نبیل

نعتؐ

گردش و رنج ماہ و سال کا رنگ
مجھ تک آتا نہیں ملال کا رنگ

نظر آتا ہے ان کی سیرت میں
رحمت رب ذوالجلال کا رنگ

جب رخِ والضحیٰ کی باتیں ہوں
کون دیکھے گلوں کے گال کا رنگ

کتنا پھیکا ہے ان کے گنبد سے
حسن دنیا ترے جمال کا رنگ

جتنی کوشش ہوئی مٹانے کی
اتنا نکھرا نبی کی آل کا رنگ

ان لبوں نے وہ قدردانی کی
سب کو بھانے لگا بلال کا رنگ

جو چڑھاتی ہے آپ کی نسبت
کون لائے گا اس مثال کا رنگ

مدحت مصطفیٰ کی نسبت سے
خوب نکھرا مرے خیال کا رنگ

بھیج کر دیکھیے درود و سلام
ہجر میں آئے گا وصال کا رنگ

نعت خیر الورا کی برکت سے
تجھ پہ سرور چڑھا کمال کا رنگ

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

پہلے بتاؤ نورِ حرا کس کے ساتھ ہے
پھر مَیں بتاؤں گا کہ خدا کس کے ساتھ ہے

نورِ خدا کے روپ میں آیا جہاں میں کون؟
"تاریک راستوں میں ضیا کس کے ساتھ ہے"

بلبل سے پوچھتا ہے چمن کا ہر ایک پھول
جنت کے راستے کی ہوا کس کے ساتھ ہے

جس سے رسول روک دے، رک جاؤ مومنو
قرآن میں ہے، رب کی رضا کس کے ساتھ ہے

کہہ دوں گا بے گمان کہ اُمی نبی کے ساتھ
پوچھیں گے جب لحد میں، بتا کس کے ساتھ ہے

محشر میں اذن دے گا شفاعت کا خود خدا
سوچو ذرا وہ اذنِ خدا کس کے ساتھ ہے

میں امتی ہوں آخری مرسل کا اے نوید
میں جانتا ہوں میری وفا کس کے ساتھ ہے

نوید عاجزؔ

سلام

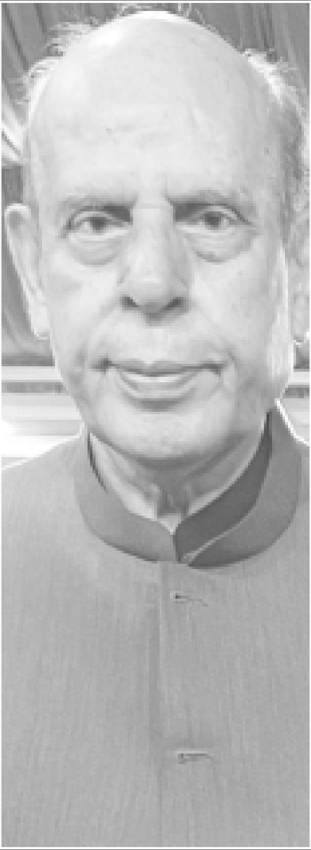

سید افسر ساجد

حسینؓ آپ نے جاں دی
زمیں لہو کر دی
کہ قدر کوئی تو زندہ رہے زمانے میں
حسینؓ آپ اصولوں پہ ہو گئے قرباں
عدو کو مات ہوئی ______

حسینؓ آپ کی عظمت کو ہم سلام کریں
کہ کربلا ہے علامت
عروجِ آدم کی
زوال اُس کو ہُوا
جس نے جبر و دہشت سے
صداقتوں کے تقدس کو پائمال کیا

پھر رات کی دلدل میں سرِ شام دھنسا ہوں
پھر صبح کے رَستے پہ مرے پاؤں پڑے ہیں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سلام

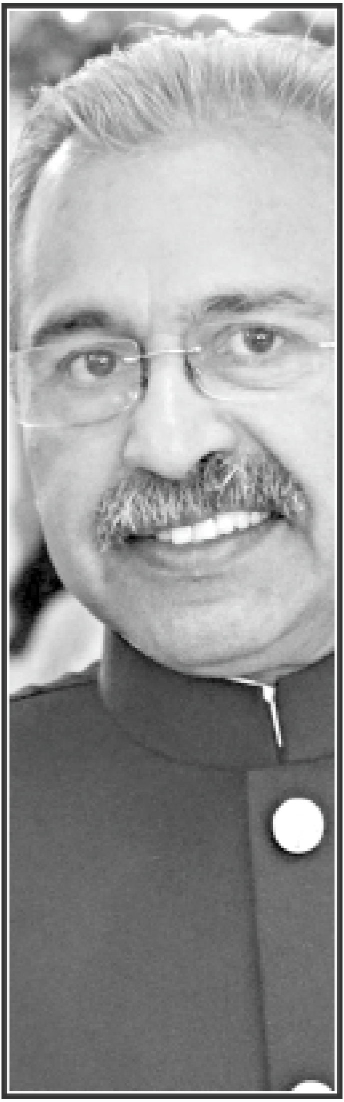

یوں اختتام کو پہنچا سفر بہتّر کا
کہیں پہ دھڑ تھا کہیں پر تھا سر بہتّر کا

تڑپ رہی ہے ادھر خاکِ کربلا اب تک
رکا تھا قافلہ آ کر جدھر بہتّر کا

چراغِ راہ ہے جویانِ راہِ حق کے لیے
حسین صرف نہیں راہ بر بہتّر کا

خدا کا ہوتا تو آتی کبھی نہ یہ نوبت
دلِ یزید میں جتنا تھا ڈر بہتّر کا

یہ مشورہ ہے کہ شمرانِ عہدِ نو کے خلاف
اٹھیں وہ لوگ ہو جن میں جگر بہتّر کا

رٹی رٹائی ہوئی گنتی بھول جاتا ہوں
میں گنتے گنتے عدد سوچ کر بہتّر کا

مبالغہ نہیں اس میں اگر کہوں راحت
بہشت کہتے ہیں جس کو ہے گھر بہتّر کا

راحت سرحدی

سلام

جب تک چلے، جہاں تلک نوعِ بشر چلے
تاریخ کے اوراق میں نیزوں پہ سر چلے

کچھ مستورات و نوجواں، کچھ شیر خوار تھے
لے کر نظامِ نَو کی اک تازہ لہر چلے

صدیوں پہ نقش آپ کے قدموں کے رہ گئے
صدیوں پہ نقش کرنے کو اپنا سفر، چلے

کھلتی کلی نے مسکرا کے ہونٹ سی لیے
دشوار تھا جو کام وہ بے شیر کر چلے

مشکل نہیں تھا ان کو اشارہ فرات کو
جن کی رضا سے آسمان و بحر و بر چلے

جنگل ہرے ہوئے کبھی اذنِ امام سے
گویا ہوئے حجر کبھی کوہ و شجر چلے

مشکِ سکینہ چھد گئی عباس گر پڑے
اشکوں کے موتیوں سے ان آنکھوں کو بھر چلے

نانا سے وعدہ پورا کیا، چل دیے حسین
کربل کا بوجھ کاندھوں پہ زینب کے دھر چلے

شبہ طراز

سلام

درِ حسین کا خود کو غلام کرتے ہوئے
دیارِ عشق میں نکلا ہوں نام کرتے ہوئے

میں ایک روز تو جاؤں گا سوئے دشتِ نجف
زمینِ کرب و بلا کو سلام کرتے ہوئے

مری نجات ہی جب ذکرِ اہلِ بیت میں ہے
کما رہا ہوں میں دنیا کے کام کرتے ہوئے

یزیدی فوج نے ہارا ہے دین و دنیا کو
غبارِ کربل و کوفہ کو شام کرتے ہوئے

درِ حسین کے چاکر کبھی نہیں بکتے
یہ بات ذہن میں رکھ لینا دام کرتے ہوئے

ہمیشہ نعت کہی میں نے باوضو ہو کر
لکھا ہے نوحہ بھی صد احترام کرتے ہوئے

عجب سرور سا ارشد غمِ حسین میں ہے
کہ پی رہا ہوں میں اشکوں کو جام کرتے ہوئے

ارشد محمود ارشد

سلام

خاک اور خون کے منظر کی ستائی آنکھیں
کربلا تک ہی رہیں شام کو آئی آنکھیں

غمِ شبیرؑ میں چند اشک بہائے میں نے
مل گئیں رونقِ دُنیا میں گنوائی آنکھیں

ذوالجناح! اب مرے بابا کو نہ لے کر جاؤ
دے رہی تھیں کسی کمسن کی دُہائی آنکھیں

اب تو وہ ماہِ امامت نظر آ جائے ہمیں
کب سے بے تاب ہیں درشن کو فدائی آنکھیں

عصرِ عاشور تلک دھرتی مسلسل روئی
شام آئی تو فلک کی بھی بھر آئی آنکھیں

پھیر لیں اجنبی صحرا نے جب آنکھیں اپنی
شاہؑ نے اصغرِ تشنہ کو پلائی آنکھیں

قحط الابصار کے اُس عہدِ سیہ بختی میں
زادے نے سرِ دشت اُگائی آنکھیں

خون آشام تھی وہ شام کہ جب نیزے پر
ایک مہتاب نے ظلمت کو دکھائی آنکھیں

احمد نواز

عقیدت

غم کے ماروں، بے سہاروں کے سہارے آگئے
جو خدا کی ذات کو سب سے ہیں پیارے آگئے

کیوں نہ ہم خوشیاں منائیں آپ کے میلاد پر
آگئے، ہاں آگئے، آقا ہمارے آگئے

یوں ہوئی دھرتی پہ ماہِ طیبہ کی جلوہ گری
وجد میں آکاش کے سب چاند تارے آگئے

عاصیوں نے "ربِ ھب لی امتی" جس دم سنا
سامنے آنکھوں کے، جنت کے نظارے آگئے

محفلِ میلاد پر ہوتی ہیں نازل رحمتیں
یہ بشارت سن کے سارے غم کے مارے آگئے

آمنہ کا لعل بھر دیتا ہے سب کی جھولیاں
سارے منگتے اپنے دامن کو پسارے آگئے

صاحبِ قرآن کے اخلاق کی کیا بات ہے
آپ کی صورت میں ڈھل کر تیس پارے آگئے

سابقہ نبیوں میں تھے فیضان جتنے معجزے
مصطفیٰ کی ذات میں سارے کے سارے آگئے

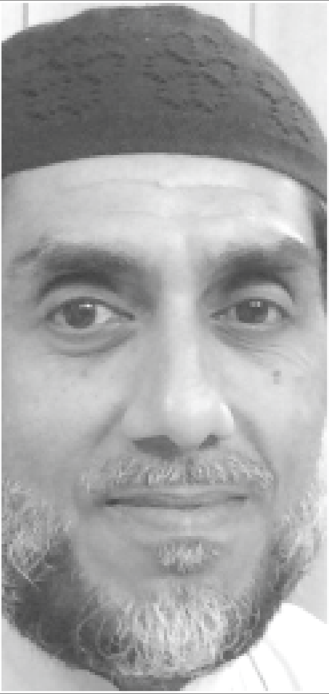

فیض رسول فیضان

عقیدت

رسولِ اسوۂ احساں کہ عدل کی ضو نے
تلف کیا ستم و تیرگی کا سرمایہ

ہے اِذنِ ربِ محمدؐ کا اُجرت و قیمت
حلال کس پہ ہے ورنہ؟ کسی کا سرمایہ

دلوں کو دولتِ تقویٰ جو مصطفیٰؐ سے ملے
ہے چشمِ حق میں وُہی برتری کا سرمایہ

خوئے یقیں میں خلوص و توکل و ایثار
ہے مصطفیٰ کی کرم گستری کا سرمایہ

نہ تنگ ہوتی معیشت کہ ہم اگر لیتے
درِ حضورؐ سے خود آگہی کا سرمایہ

بنائے معرفتِ حق ہے عشق سرورِ دیں
اِسی خزینے میں ہے بندگی کا سرمایہ

ہے نعت حرفِ زرِ عشق اور مزید کرم
کہ حرفِ زر ہے مری شاعری کا سرمایہ

ہے نفع بخش تجارت کی راہ وہی آصف
جہاں رسول کی ہے پیروی کا سرمایہ

نہ رکھنا غیرتِ دیں رہن اپنی غیر کے ہاں
کہ پھر بچے گا تو بس بے بسی کا سرمایہ

جہاں میں رزقِ مساواتِ مصطفیٰؐ کے سوا
ہے ظلم و دجل ہر اک مدعی کا سرمایہ

اگر سمجھتا وہ ملکیتِ محمدؐ کو
تو بٹتا اور طرح فلسفی کا سرمایہ

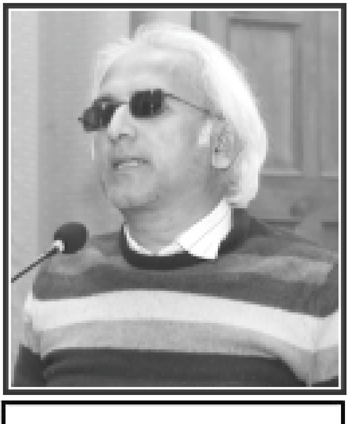

مرزا آصف رسول

عقیدت

زعیم رشید

سرکارِ دو عالم کی ثناء کرتے ہیں ہم لوگ
چھوٹے ہیں مگر کام بڑا کرتے ہیں ہم لوگ

سینے سے لگا لیتی ہے اللہ کی رحمت
جب صلے علیٰ صلے علیٰ کرتے ہیں ہم لوگ

تقریمِ نبی ، آلِ نبی ہم کو ہے مقصود
سادات سے ہر لمحہ وفا کرتے ہیں ہم لوگ

قرآن میں ہیں شانِ محمد کے حوالے
اِس شان سے قرآن پڑھا کرتے ہیں ہم لوگ

جب جب بھی دعا کے لیے ہم ہاتھ اٹھائیں
تب تب ہی مدینے کی دعا کرتے ہیں ہم لوگ

رہتے ہیں زعیم ایسے صبح و شام مدینے
صد شکر، بصد شکر ادا کرتے ہیں ہم لوگ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کون کرے ، ہریالی کو غالیچہ تنکوں کا
کون ترختے تھل پر ڈالے چار لیل و نہار

رباعیات

بُھولے ہُوئے ویرانے میں جگنو کی طرح
اک یاد تھی صحراؤں میں خوشبو کی طرح
مدت سے جسے دیکھا نہ تھا آنکھوں نے
وہ شخص تھا ٹھہرے ہُوئے آنسو کی طرح

کچھ پرسشِ احوال کی تکریم تو ہو
تقریبِ ملاقات کی تفہیم تو ہو
بیمارِ محبت کی یہ اِک خواہش ہے
اَب درد ہی اُٹھے تری تعظیم تو ہو

بُھولے ہُوئے نغموں کی صدا آئی ہے
بارش ہے کہ صحرا میں صبا آئی ہے
بھیگے ہوئے موسم میں ہے کیسی خوشبو
تم ہو کہ یہ ساون کی ہَوا آئی ہے

یوں نارِ جہنم کو ہَوا دیتے ہیں
ہاتھوں سے دعاؤں کو گِرا دیتے ہیں
مِل جائے اگر ساعتِ مقبول کہیں
ہم لوگ تذبذب میں گنوا دیتے ہیں

خاور اعجاز

رباعیات

اس راہ پہ جب جان گنوائے گا کوئی
پھر کس لیے قندیل جلائے گا کوئی
توقیر اندھیروں کی اگر کم نہ ہوئی
کیا روشنی والا اِدھر آئے گا کوئی

ظلمت میں یہاں سخت مقام آئیں گے
انوار کہاں سے ترے نام آئیں گے
تو دن میں چراغوں کو حقارت سے نہ پھینک
جب شام پڑے گی یہی کام آئیں گے

کچھ تیرگیاں صرف مٹاتے ہیں چراغ
اس واسطے دن میں بھی جلاتے ہیں چراغ
کرتے نہیں غافل کبھی ہمت ایسی
بیدار ہی سورج کو دکھاتے ہیں چراغ

کُنبہ ہے اجالوں کو یگانہ سارا
ہے اس لیے مشتاق زمانہ سارا
تنویر ہے اول سے وہی آخر تک
ہے نور علی نور گھرانہ سارا

اللہ کے ہی اسم سے آغاز کریں
اکرام و عنایات کا در باز کریں
ہے ذات ازل سے وہی رحمان و کریم
اس کے ہی کرم سے سخن اعجاز کریں

وابستہ اسی فیض کے در سے رکھنا
محفوظ ندامت کے خطر سے رکھنا
یا رب ہو ضروری بھی اگر حشر و حساب
محفوظ محمد کی نظر سے رکھنا

سستی نے کیا مرتبہ کامل میرا
ہے نام بڑے لوگوں میں داخل میرا
احباب مجھے کہتے ہیں بحرالکاہل
ہے کاہلی میں کون مقابل میرا

میں ایک معالج سے ملا تھا فی اللہ
دیکھا جو مجھے اس نے کہا بسم اللہ
جب میں نے کہا مفت دوا چیخ اُٹھے
لاحول ولا قوۃ الا باللہ

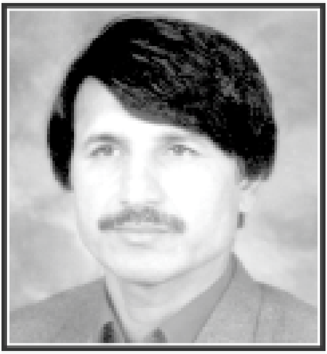

گلزار بخاری

رباعیات

خورشید نظر حرفِ عبارت رکھئے
تلوار کے لہجے میں حرارت رکھئے
آئندہ زمانے کی خبر دیتے ہوں
الفاظ کی آنکھوں میں بصارت رکھئے

فتنے جو اس کی چال پر جھوم اٹھے
دل حسنِ پائمال پر جھوم اٹھے
رنگ اس کے لمس سے مہکتے جائیں
گل بوٹے اس کی شال پر جھوم اٹھے

راحت ڈھونڈی شہر میں مجبوری کی
حسرت جینے کی بھوک میں پوری کی
آنکھوں نے لئے کرائے پر خالی خواب
دل نے آنسو ڈھونے کی مزدوری کی

جینا بھی تو مرنے کا تقاضا ہے یہاں
ایسا دریا ہے دل کہ پیاسا ہے یہاں
روتی خوشیوں کے غم سے ڈرتا کیوں ہے
اٹھ ناچ کہ آدمی تماشا ہے یہاں

آنچل کی دھنک کو دے رہے ہیں لو چراغ
لب سوختہ ہیں بوسۂ لب سے دو چراغ
ہوتی ہے ہجومِ دید میں روشنی ایک
جلتے ہیں گو بارہ دری میں سو چراغ

بارود قبا شہر تمنا نہ بنا
شعلے کی گرہ کھول معما نہ بنا
یہ بھوک تری رزقِ جہنم کا نصیب
ابلیس کو تُو اپنا تماشا نہ بنا

دل روٹھ نہ جانے کہیں مرنے کے لئے
گھر چاہیے آسمان دھرنے کے لئے
سوچا ہے مشینوں نے تمنا کا نصیب
ایجاد نئے آدمی کرنے کے لئے

سینے میں غم سجائے جاتے ہیں یہاں
یعنی نئے دل لگائے جاتے ہیں یہاں
ساقی کے اشارے پہ سبو پھرتا ہے
ذرے سورج بنائے جاتے ہیں یہاں

محمد نصیر زندہ

رباعیات

ساری تری چیزیں ہیں تسلی کر لے
خالی مری جیبیں ہیں تسلی کر لے
یہ ہونٹ ہیں، یہ گال ہیں، یہ آنکھیں تری
صبحیں ہیں، یہ شامیں ہیں تسلی کر لے

....

ہم بھاڑ میں رہتے ہیں بجا کہتے ہیں
بے طور بھی سہتے ہیں بجا کہتے ہیں
کوئی بھی ہماری نہیں ہے سیدھی بات
جو جو بھی وہ کہتے ہیں بجا کہتے ہیں

....

چپ چاپ ہے حیراں ہے خلافِ معمول
وہ آج پریشاں ہے خلافِ معمول
شاید کہیں بھولا ہے وہ خود کو رکھ کے
بکھرا ہوا ساماں ہے خلافِ معمول

....

پردیس کو جانا ہے تو آرام سے جا
جب وقت لگانا ہے تو آرام سے جا
جیون کا بھروسہ نہیں یہ کب تک ہے
کچھ مال کمانا ہے تو آرام سے جا

....

کردار نئے بیٹھا کبھی فرصت میں
گفتار ذرا سجا کبھی فرصت میں
قصوں میں ترے جان نہیں ہے بالکل
تاثیر کہیں سے لا کبھی فرصت میں

....

چندا ترے ماتھے پہ ہے ما شاء اللہ
چمکا ترے ماتھے پہ ہے ما شاء اللہ
صحرا مری قسمت کے ستاروں میں ہے
سبزہ ترے ماتھے پہ ہے ما شاء اللہ

....

گزری ہوئی باتوں کے لیے وقت نکال
ٹوٹی ہوئی یادوں کے لیے وقت نکال
پھر ہاتھ نہ آئیں گے کبھی تیرے یہ
مرتے ہوئے لمحوں کے لیے وقت نکال

....

چلتی ہے ہوا کام ہی ایسا ہے یہ
جلتا ہے دیا کام ہی ایسا ہے یہ
بیٹھا ہوں میں کھڑکی میں تری خاطر اب
نظروں کو اٹھا کام ہی ایسا ہے یہ

سعید اشعر

ہائیکو

کس نے یہ دشت پھر سجایا ہے
اُس کے دیدار کی بڑھا کے طلب
کیوں ہمیں چارسُو گھمایا ہے

راز جانا نہیں حقیقت کا
اُس نے مانی ہے اپنے دل کی بات
راستہ چُن لیا طریقت کا

اُس نے بولا کہ سر کو خم کر دو
کر دیا مَیں نے جب اُسے انکار
یہ دیا حکم ، سَر قلم کر دو

دل کو راہِ نجات مل جائے
سلسلہ چل پڑے گا جینے کا
پھر وہ جانِ حیات مل جائے

ذہن اپنا ، دماغ اپنا ہے
جس پہ نظریں ہیں شہر سارے کی
وہی جلتا چراغ اپنا ہے

مرشدی ! مجھ پہ دم کیا جائے
ضبط کا حوصلہ بڑھے کچھ اور
تاکہ گِریہ تو کم کیا جائے

شبد ہونٹوں پہ آ کے رُک سے گئے
وہ ستارے و شب گزار ہیں سب
میرے قدموں میں جیسے جھک سے گئے

حق ادا کر دیا پرستش کا
خود ہی توبہ کی مِل گئی توفیق
راز اُس پر کھلا ہے لغزش کا

نفرتوں سے نہیں ، وفا سے دیکھ
عشق والوں کا احترام بھی کر
اپنی نظر جھکا ، حیا سے دیکھ

نام لکھنے لگا ہوں اک سِل پہ
زندگی میں بہار آئے گی
نقش اُس کے پڑیں گے جب دل پہ

آفتاب خان

تتلیوں کے گھروں پہ حملے کہیں
آج پھولوں کے دل ہوئے ہیں اُداس
کیوں کہ آندھی کی زد میں گملے ہیں

بانٹ ڈالا تھا مُلک گاندھی نے
کوششیں کیں بہت بچانے کی
ظلم ڈھایا تھا سرخ آدھی نے

خوف پھیلا ہوا ہے جنگل کا
لوگ باہر یہاں سے جانے لگے
اور لمحہ بھی ہے دنگل کا

سب کو بھاتا ہے رنگ نارنجی
ہر مرض کا علاج ہے اس میں
شوق سے تُو خرید کلونجی

شہر بھر کے مکان خالی کرو
اِس قدر بھی قیام ٹھیک نہیں
اب خدا کا جہان خالی کرو

کیسا منصب کہاں کا تخت میاں
کوئی شے پائیدار کب ہے بھلا
زندگی ہو گی لخت لخت یہاں

ماہیے

سیما پیروز

بادل بھی برستے کیوں
چپ چاپ بچھڑ جاتے
ہم روکتے رہتے کیوں

کوا بھی کوئی بولے
تنہائی سے ڈرتی ہوں
تو ساتھ میرے ہولے

ہاتھوں میں رہے گیٹے
دل ہار گیا لیکن
پھر بھی ہیں ہی جیتے

کچھ پھول پرو لیتی
آنے کا جو کہہ دیتے
میں دیپ سنجو لیتی

خوابوں کے سہارے تھے
میں کھو گئی راہوں میں
کچھ ایسے نظارے تھے

''پرایا چاند''

میں اور وہ عموماً راستوں پہ ملا کرتے تھے۔ کبھی کسی پارک میں کبھی کسی پلازہ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے۔ سینما کی کھڑکی کے سامنے ٹکٹ خریدتے ہوئے یا پھر کسی ریستوران میں۔ جہاں بے حد ہلا گلا ہوتا۔ سب چلا رہے ہوتے۔ ایک طرف سے آواز آتی ارے یہ سیاست گولی مارو سالے......

اور بڑی سی گالی میں باقی بات دب جاتی۔

''یار یہ لڑکیاں اتنی عجیب کیوں ہوتی ہیں؟ پیار کسی سے کرتی ہیں اور سدھاریں گی اس کے سنگ جس کے پاس کار اور کوٹھی ہو''

کوئی دل جلا عاشق گلہ کرتا۔

سگریٹ کے دھوئیں کے پار لڑکیوں کے آدھے، پورے چہروں کی جھلک، کسی کے کانوں کا جھولتا ہوا آویزہ توجہ کھینچتا اور کسی کے ریشمی گالوں پہ جھولتی ہوئی لٹ مرکزِ نگاہ ہوتی۔ لڑکیوں کی دبی دبی سی کھنکھناتی ہوئی ہنسی ہال میں بجتا ہوا میوزک یہ سب کسی درجہ دل خوش کن تھا۔ ایسے میں وہ مجھے کسی ٹیبل پر اپنے دوستوں کے سنگ بیٹھا ہوا نظر آتا تو ہم دونوں صرف مسکرا دیتے تھے۔ اتنی بار ملنے کے باوجود پہلے ہم صرف چہرے شناسا تھے پھر نام آشنا ہوئے اور بس۔ جب بھی کبھی ہمارا آمنا سامنا ہوتا ہم دونوں کے چہروں پر آشنائی کی مسکراہٹ آجاتی۔ وہ اپنے دوستوں میں مصروف ہو جاتا اور میں اپنے۔

ایک روز اتفاق سے وہ مجھے تنہا مل گیا۔ وہ بہت ہی دلچسپ لڑکا ثابت ہوا۔ دو چار ملاقاتوں میں ہی ہم کافی قریب آگئے۔ اُس نے امریکہ سے ایم بی اے کیا ہوا تھا مگر جاب کہیں نہیں کرتا تھا۔ بے حد امیر ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ لیکن سستے ہوٹلوں اور عام سی تفریح گاہوں میں گھومتا تھا اور ہم جیسے غریب اور متوسط طبقے کے لوگوں سے دوستی میں خوش رہتا تھا۔ ہاتھ کا کافی کھلا تھا۔ بے دریغ

سیما پیروز

روپیہ اجاڑتا تھا۔ وہ قدرے اوباش اور کافی حد تک دل پھینک قسم کا لڑکا تھا۔ ہر اچھی لڑکی پر عاشق ہونا گویا اس کا پیدائشی حق تھا۔ لیکن ایک بات ہے کہ اس کی شخصیت لڑکیوں کی نیندیں حرام کردینے والی تھی۔ سونے پر سہاگہ اس کی بے تحاشا دولت تھی۔ پھر جانے کیسے ہماری دوستی بڑھتی گئی۔ میرے اور اس کے بے شمار شوق اور دلچسپیاں مشترکہ تھیں شاید یہی چیز ہماری دوستی کا باعث بنی بس مجھے اس کی لڑکیوں سے دوستی پر اعتراض تھا۔ اگر بات صرف دوستی کی حد تک رہتی تو ٹھیک تھی وہ تو لڑکیوں کے دلوں سے کھیلتا تھا اور پھر انھیں تڑپنے کے لیے چھوڑ دیتا تھا۔ خدا جانے یہ لڑکیاں بھی کس مٹی سے بنی تھیں وہ حد درجہ فلرٹ مشہور تھا اس کے باوجود جان بوجھ کر اس کے دام میں پھنستی تھیں۔ وہیں پر ایک اور لڑکے سے بھی ہماری تھوڑی بہت دوستی ہوگئی وہ کافی حد تک بے وقوف اور خوابوں میں رہنے والا لڑکا تھا۔ کئی سال سے ڈیزائننگ میں فیل ہو رہا تھا۔ وہ اُن لوگوں میں سے تھا جو ہر وقت حقیقت سے زیادہ خوابوں کی دنیا میں رہتے ہیں۔ اور چاندنی کو اپنی مٹھی میں بند کرنے کی ناکام کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ وہ گزشتہ سات سال سے ایک لڑکی سے عشق کیے جا رہا تھا پر اس لڑکی کو آج تک نہ بتا پایا تھا۔

اس کے والدین نے اس سے مایوس ہوکر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

بہار کی اس خوب صورت شام جب میں ریستوران میں داخل ہوا تو وہ ایک لڑکی کے سامنے بت کی مانند خاموش بیٹھا تھا اور وہ مسلسل باتیں کیے جا رہی تھی اور ہنسے جا رہی تھی۔ وہ بہت خوب صورت اور پیاری لڑکی تھی اور اس کی شخصیت بڑی جاذب نظر تھی وہ اُن لڑکیوں میں سے تھی جو ذرا سی بات پر قلقل ہنس دیتی ہیں۔ جیسے صراحی میں سے پانی گر رہا ہو۔ عامر کے پکارنے پر میں ان کی ٹیبل پر ہی بیٹھ گیا۔ مجھ سے وہ جلد ہی گھل مل گئی۔ وہ بہت ہی سادہ مزاج اور معصوم فطرت لڑکی تھی۔ میں اور وہ کافی دیر تک مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہے پر عامر زیادہ تر خاموش ہی رہا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں شمع پر مر مٹنے والے پروانے کی جھلک دیکھ لی تھی اور میرا دل اس کی اس بات پر بہت کڑھا تھا۔ بے وقوف لڑکا اگر اسے چاہتا ہے تو کہہ کیوں نہیں دیتا۔ زیادہ سے زیادہ وہ انکار کردے گی۔ چلو معاملہ آر یا پار تو ہوگا۔ دل میں یہ کسک تو نہیں رہے گی کہ میں زندگی بھر اس سے کچھ کہہ کیوں نہ سکا۔

اس روز بادل ٹوٹ کے برسا ہر طرف جل

تھل ہو گیا تھا۔ گرمی کا زور ٹوٹ گیا تھا اور فضا بڑی نکھری نکھری سی تھی۔ میں اور جاذب ریستوران میں بیٹھے تھے کہ ماحول میں خس کی خوشبو پھیل گئی، جوہی ہال میں داخل ہوتی ہوئی نظر آئی اور پھر اس کا سبز آنچل میرے سامنے لہرایا "ہیلو...... ہائے" وہ مسکراتی ہوئی اپنی سہیلیوں کے ساتھ کونے والی ٹیبل پر بیٹھ گئی۔

"یار یہ کون ہے؟ واہ کیا چیز ہے۔ لگتا ہے اجنتا ایلورا کی غاروں سے سیدھی چلی آرہی ہو" جاذب نے جوہی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

مجھے اس کا اس طرح کا عامیانہ طرزِ گفتگو بہت بُرا لگا۔

"یار وہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔ بہت اچھی فیملی سے تعلق رکھتی ہے۔ بڑی سلجھی ہوئی لڑکی ہے۔

"اوہو! کیا بات ہے؟ اس کا لہجہ استفہامیہ تھا۔ اگر تو وہ تمھاری ہے تو میں آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھوں گا۔"

"کیا بکواس کرتے ہو؟ میرے لیے وہ صرف اچھی دوست ہے۔ میں اس کا بے حد احترام کرتا ہوں۔"

"تو پھر تمھیں کیا اعتراض ہے؟ قسمت آزمانے میں ہرج ہی کیا ہے؟

اس کی بکواس پر میں خاموش ہی رہا۔

اور پھر یوں ہوا کہ جوہی جاذب کی اور بڑھتی ہی چلی گئی۔ جیسے مکڑی کے جال میں شکار خود بخود پھنستا چلا جاتا ہے۔ میں نے اسے اشاروں کنایوں میں منع کیا جاذب کے ہرجائی پن کے بیسیوں قصے سنائے پھر وہ آنکھیں بند کر کے تباہی کے راستے کی طرف بڑھتی ہی گئی۔ عامر ان دنوں ہمیشہ سے زیادہ قنوطی اور چڑچڑا ہو گیا تھا۔

اور پھر اُس روز یوں ہوا کہ جوہی اپنی کرسی پہ اکیلی بیٹھی رہی اور جاذب ایک نئی لڑکی کے ساتھ دوسری ٹیبل پر چلا گیا۔ جوہی خلاف معمول چپ تھی اور سنجیدہ نظروں سے نئی لڑکی اور جاذب کا جائزہ لے رہی تھی۔ جوہی کو حیرت ہوئی کہ وہ پچھلے دو برسوں میں اس شخص کو سمجھ نہ پائی تھی۔ پھر جوہی نے سوچا کہ اب فیصلے کی گھڑی آن پہنچی ہے۔ اس نے عامر پر نظر ڈالی وہ ہمیشہ کی طرح حسرت ویاس کا مرقع بنا بیٹھا تھا۔ اُف یہ لڑکا اس کے ساتھ تو میں پاگل ہو جاؤں گی اور جاذب وہ تو اڑتا ہوا بادل ہے کیا میں اسے بس میں کر پاؤں گی یا سایے کی طرح اس کا پیچھا کرتی رہوں گی۔ پھر اس نے مجھے اپنا فیصلہ سنایا کہ وہ جاذب سے شادی کرے گی۔

"کیوں جان بوجھ کر آگ سے کھیل رہی ہو۔ تم پر اس کی ہرجائی فطرت اچھی طرح

عیاں ہو چکی ہے۔ وہ کبھی بھی کسی ایک کا ہو کر نہیں رہ سکتا اور پھر اسے تم سے ذرہ بھر بھی محبت نہیں ہے‘‘ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

’’مجھے تو اس سے محبت ہے۔ ساری زندگی ناپسندیدہ شخص کے ساتھ گزارنے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ چند پل کسی محبوب ہستی کے ساتھ گزر جائیں جتنا وقت بھی میں جاذب کے ساتھ گزارلوں گی وہی میری زندگی کا حاصل ہوگا۔ میں نے اسے دل کی تمام گہرائیوں اور شدتوں کے ساتھ چاہا ہے۔ میں محبت میں سودے بازی کی قائل نہیں ہوں۔ اگر وہ خوشی سے میرا ساتھ دینا قبول کرے گا تو میں اسے زندگی کی معراج سمجھوں گی‘‘ وہ پاگل لڑکی گوڈے گوڈے اس کی محبت میں ڈوب چکی تھی۔ میں سوائے افسوس کرنے کے اور کر سکتا تھا۔ پھر کچھ روز کے بعد اس سے ملاقات ہوئی تو وہ بہت خوش تھی اس نے اطلاع دی کہ وہ اور جاذب جلد شادی کرنے والے ہیں۔ مجھے دل میں خاصا دکھ سا ہوا۔ میں جاذب کی بھنورا صفت طبیعت سے خوب واقف تھا۔ وہ کبھی بھی جوہی کا ہو کر نہیں رہ سکے گا۔ اور یہ پاگل لڑکی سمجھ رہی تھی کہ اسے محبت کی زنجیر میں باندھ لے گی۔

جوہی اور جاذب کی شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی وہ دونوں بہت خوش تھے۔ میرے دل سے جوہی کے لیے دعا نکلی ’’خدا کرے وہ ہمیشہ اسی طرح خوش رہے۔‘‘

پھر زمانے کی گردش نے ہمیں ایک دوسرے سے دور لے جا پھینکا۔ میں جاب کے سلسلے میں ادھر اُدھر گھومتا رہا۔ کبھی کبھار عامر کے خط مل جاتے تھے پھر وہ امریکہ چلا گیا۔ آخری خبر تک جوہی اور جاذب ورلڈ ٹور پہ گئے ہوئے تھے۔ اور ان کی ایک پیاری سی بیٹی تھی اور سنا تھا کہ وہ بڑے مزے میں ہیں۔

ان دنوں میں مری میں پوسٹڈ تھا۔ پہاڑ کا خوشگوار موسم رخصت ہو چکا تھا۔ سردیوں کی آمد آمد تھی۔ مری ان دنوں ویران سی تھی۔ میدانوں سے آئے ہوئے لوگ واپس جا چکے تھے۔ اور ساری مری کی رونق بھی گویا ساتھ ہی لے گئے تھے۔ اب شامیں اکثر ہی اداس گزرتی تھیں۔ ایسی ہی ایک شام میں ہوٹل میں چائے پینے گیا تو مجھے خوشگوار حیرت ہوئی۔ ہمیشہ کی طرح کھڑکی کے قریب والی ٹیبل پر جوہی بیٹھی تھی۔ میں چند لمحوں تک حیرت سے اسے تکتا رہا۔ وہ اپنے ہی خیالوں میں گم اداس اور پریشان بیٹھی تھی۔ اس کی پلکیں بھیگی بھیگی سی تھیں۔ اس نے ابھی مجھے نہیں دیکھا تھا۔

”یہ تم ہو جویریہ......

مجھے دیکھ کر پل بھر کو اس کی آنکھوں میں جگنو سے چمکے پر دوسرے ہی لمحے ان میں بجھی ہوئی راکھ کی سی کیفیت تھی۔

اس کے چہرے پر پہلے جیسی شگفتگی نہیں تھی۔ وہ کچھ بدل سی گئی تھی۔ مجھے بہت دکھ ہوا۔ ابھی اس دلکش لڑکی کو بدلنا نہیں چاہیے تھا۔

میں اس سے پوچھنا چاہ رہا تھا کہ جاذب کہاں ہے اس کی بیٹی کدھر ہے اور وہ اس وقت اتنی اکیلی کیوں ہے؟ پر میں خاموشی سے اس کے رخساروں پہ پھیلی زردی اور آنکھوں میں چھپے غم کو دیکھتا رہا۔ ڈھیروں باتیں کرتے رہے۔ عامر کا ذکر بھی آیا اس کے ذکر پر وہ افسردہ ہوگئی۔

پھر اس نے مجھے اپنا ہوٹل کا اڈریس دیا اور چلی گئی۔ میں اسے کہتا رہا کہ میں چھوڑ آتا ہوں پر وہ نہیں مانی اور تنہا جانے پر مصر رہی۔

اگلے روز میں اس سے ملنے گیا تو وہ اپنے گھر میں ہی تھی۔ بچی آیا کے ساتھ باہر ٹیرس پر کھیل رہی تھی۔ میں نہ رہ سکا تو اس سے پوچھ ہی لیا اب تم کیوں ناخوش ہو؟ جو تم نے چاہا سو پالیا۔ کس چیز کی کمی ہے تمہاری زندگی میں؟ میں نے بھرپور طنز کیا۔

”کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سب کچھ پاکر بھی ہم محروم رہتے ہیں۔“

”پر تم اتنی اداس کیوں ہو؟ تمہارے پاس دولت ہے۔ حسن ہے، من چاہا شوہر ہے بچی ہے اور کیا چاہیے تمہیں؟“

وہ خاموش رہی۔ میں نہایت گھٹیا طریقے سے اس پر طنز کیے جا رہا تھا مجھے اس پر غصہ تھا کہ وہ جان بوجھ کر کنوئیں میں گری تھی۔

پھر وہ خود ہی پھٹ پڑی اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ”میں سمجھی تھی کہ میں نے جاذب کو جیت لیا ہے وہ ہمیشہ میرا رہے گا۔ وہ اس کی ساری باتیں اور آئیڈیلزم، بڑے بڑے بھاشن سب فراڈ ہیں وہ حد درجہ کا خود پسند دقیانوسی ہے۔ وہ نرگسیت کا مارا ہوا ہے۔ اپنی ذات کے علاوہ اسے اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ وہ مجھے ذلیل کرنے کا ڈی گریڈ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ ذرا بات کروں تو طعنے دیتا ہے کہ ”تم نے خود کیا ہے اب بھگتو بار ہا میں نے سوچا کہ اس سے طلاق لے لوں مگر ایسا نہ کر سکی۔ ایک تو بیٹی کی وجہ سے کہ وہ باپ کے سائے سے محروم ہو جائے گی اور ساری عمر طلاق یافتہ ماں کی بیٹی ہونے کا طعنہ سنتی رہے گی اور پھر تم تو جانتے ہو کہ میں نے گھر والوں کی، دوستوں کی سب کی مرضی کے خلاف جاذب سے شادی کی تھی اب کس منہ سے واپس جاؤں۔“

آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ کر گالوں تک

آ گئے تھے میں خاموش رہا۔

”وہ زندگی میں کبھی کسی چیز کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہوتا۔ آج ایک لڑکی پسند ہے تو کل دوسری پہ مر رہا ہے۔ ایک کے ساتھ فلم کا وعدہ کرے گا اسی وقت دوسری کے ساتھ ہوٹل چلا جائے گا۔ شروع میں منع کرتی تھی تو کہتا تھا ”یار میں کونسا ان کے ساتھ سیریس ہوں۔ آخر کو رہوں گا تو تمھارا ہی“

”کافی دن پہلے ہماری زبردست جھڑپ ہوئی تھی میں نے اسے کہا تھا کہ میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں۔ پر اس کا ہرجائی پن میری برداشت سے باہر ہے۔ اس لیے وہ مجھے طلاق دے دے۔ یقین کرو وہ رات بھر رو رو کر منتیں کرتا رہا کہ اب کسی لڑکی کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ بڑے پیار سے مری لے کر آیا تھا کہ وہاں رہے گا تو لڑکیاں پیچھا نہیں چھوڑیں گی۔ یہاں آئے پندرہ دن ہو گئے ہیں۔ اور یقین کرو ان پندرہ دنوں میں کم لازکم درجن بھر لڑکیوں کے ساتھ مختلف جگہوں پر گھومتا ہوا پایا گیا ہے۔ میرے مہربان مجھے یہاں بھی چین نہیں لینے دیتے ہر روز کوئی نہ کوئی مجھے اس کی آوارگی کی اطلاع دینے چلا آتا ہے۔ آجکل ایک بڑی ہی طرحدار لڑکی کے ساتھ دیکھا جا رہا ہے۔ افواہ ہے کہ وہ اس سے شادی کرنے والا ہے۔ اگرچہ مجھے یقین ہے کہ یہ عشق زیادہ دنوں نہیں چلے گا۔“

میں نے اسے سمجھایا کہ جاذب سے علیحدگی اختیار کرے۔ کیوں اپنی زندگی برباد کرنے پر تلی ہے، وہ کبھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ اس نے حامی بھری تھی۔ پھر میں چلا آیا۔ راستے بھر میں محبت کے بارے میں سوچتا رہا۔ محبت بھی عجیب چیز ہوتی ہے۔ مجھے عامر یاد آیا جو دیوانہ وار جوہی کو پوجتا تھا۔ پر جوہی اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی اور اب یہ جاذب سے محبت کیے جا رہی ہے اور وہ بھنورا کلی کلی منڈلا رہا ہے۔ اور میں نہ جانے کیا چاہتا تھا؟

میں بہت دن مری سے باہر رہا۔ سرکاری کام کے سلسلے میں گیا ہوا تھا۔ اس لیے جوہی سے ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ اس سرمئی شام وہ مجھے کافی دنوں کے بعد نظر آئی تھی۔ وہ پہلے سے زیادہ اداس اور زرد تھی۔ ابھی ہمارے درمیان گفتگو کی ابتدا نہیں ہوئی تھی کہ میں نے کھڑکی کے باہر جاذب کو اس لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر جاتے ہوئے دیکھا۔ جوہی نے بھی دیکھ لیا تھا۔ اس نے آنکھیں میچ کر اپنا سر کرسی کی پشت پر ٹیک دیا مجھے اس پر رحم بھی آ رہا تھا اور بے تحاشا غصہ بھی آ رہا تھا۔ وہ اپنی اس حالت کی خود ذمہ دار تھی۔

”جوہی“ میں نے اُسے پکارا۔

''ہوں'' وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں نہ بہنے والے آنسو جمے ہوئے تھے۔

''میں نے کچھ روز پہلے تمہیں ایک مشورہ دیا تھا۔ کیا سوچا ہے تم نے۔ ابھی بھی سنبھل جاؤ۔ ورنہ پھر بہت پچھتاؤ گی۔ میں جاذب کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ لڑکیوں کے معاملے میں وہ کبھی نہیں سدھر سکتا۔''

''میں نے جاذب سے علیحدہ ہونے کے بارے میں بہت سوچا بہت غور کیا پر ابھی تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکی۔ پھر میں نے دوبارہ اس ٹاپک پر بات نہیں کی۔ پھر وہ لوگ واپس لوٹ گئے۔ کافی عرصہ تک اُن لوگوں کی کوئی اطلاع نہیں ملی۔

میری پوسٹنگ اسلام آباد ہو چکی تھی۔ میں ہنوز تنہا تھا۔ گھر والے شادی پر بہت زور دے رہے تھے۔ پر جانے کیوں دل آمادہ ہی نہیں ہوتا تھا۔ گرمیوں کے تھکا دینے والے دن شروع ہو چکے تھے۔ لگتا تھا توے پر بیٹھے ہیں، ایسے میں ہمارے ایک دوست کی شادی آ گئی۔ اتنی شدید گرمی میں شادی۔ خاصا غیر رومانٹک سا پروگرام ہے۔ پر اس کی بارات والے دن ''ہالیڈے ان'' کے ٹھنڈے ہال میں بیٹھ کر مزہ آ گیا۔ کھانے کے بعد رخصتی سے پہلے کی رسمیں شروع ہو چکی تھیں۔ میں ذرا پرے ہٹ کر سگریٹ پی رہا تھا کہ اچانک میری نظر جوہی پر پڑی۔ دوسرے پل میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سگریٹ جل رہا تھا۔ جو میرے لیے باعث حیرت تھا۔ جوہی کو اداس حالت میں دیکھ کر مجھے شدید دکھ ہوا۔ اس کی موتی جیسی رنگت سنولا چکی تھی۔ رتجگوں سے آنکھوں کے گرد حلقے پڑ چکے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی۔ وہ ابھی تک جاذب کے ساتھ ہی تھی۔ مجھے اس احمق لڑکی پر شدید غصہ آیا۔

میں نے غصے میں جاذب کو خوب برا بھلا کہا۔ پھر نہ جانے جوہی کو کیا کچھ کہتا رہا۔ وہ خاموشی سے میری بکواس سنتی رہی پھر بولی۔

''سنو جمیل! میں جاذب کو نہیں چھوڑ سکتی کیونکہ مجھے اس سے محبت ہے''

''اور اسے''

''میرا خیال ہے شاید وہ بھی مجھ سے محبت کرتا ہے۔''

''کیا تم یقین سے کہہ سکتی ہو کہ اسے بھی تم سے محبت ہے'' میں نے اس کی بات کاٹی۔

''چلو یہ بہانہ ہی سہی، پھر میں اس بہانے کے سہارے اپنی زندگی گزار دوں گی اور اس کے لوٹ کے آنے کا انتظار کروں گی'' اس کی آنکھوں سے دو موتی گرے اور اس کے پھول سے رخساروں پر لڑھکتے چلے گئے۔

☆☆☆☆☆

سکائی لیب

جس دن امریکا کی سکائی لیب زمین پہ گرے گی، اُسی دن ہم دونوں گھر سے بھاگ جائیں گے۔" یہ فیصلہ انھوں نے بہت سوچ بچار کے بعد مل کر کیا تھا۔"

ججی، یعنی اعجاز شیخ، مین بازار کے 'برادرز کلاتھ ہاؤس' کے مالک شیخ سرفراز کا بڑا بیٹا تھا، جنھیں سب 'بڑے شیخ صاحب' کہتے تھے۔ چھوٹے شیخ کون تھے؟ یہ بات کسی کو ٹھیک سے معلوم نہ تھی۔ شاید وہ بھائی جن کے ساتھ کبھی شیخ صاحب نے مل کر کپڑے کا کاروبار کیا تھا، مگر پھر ایک ایک کر کے سب نے مین بازار ہی میں کچھ فاصلے پر اپنی اپنی دکانیں کھول لیں۔ یا پھر ممکن ہے بازار والے شیخ سرفراز کے بچوں کو 'چھوٹے شیخ' خیال کر کے ان کے والد کو 'بڑا شیخ' کہنے لگے ہوں۔ اور بورڈ پر لکھے 'برادرز' سے مراد کون تھے؟ شیخ سرفراز کے بھائی یا ججی اور اس کے تین بھائی؟ یہ عقدہ خود ججی بھی کبھی نہ حل کر سکا۔ حالاں کہ یہ بات دکان پر آویزاں بورڈ کی تاریخ تنصیب دیکھ کر آسانی سے سمجھ میں آسکتی تھی۔ اگر یہ بورڈ شیخ سرفراز کے بھائیوں کے علاحدہ ہونے سے پہلے لگا تھا تو 'برادرز' سے مراد یقیناً بڑے شیخ صاحب کے بھائی تھے، اور اگر بعد میں لگا تو پھر اس سے مراد ججی اور اس کے تین ہم قافیہ چھوٹے بھائی امتیاز، اعزاز اور نواز ہی بنتے تھے۔ ویسے تو بڑے شیخ صاحب کی دو بیٹیاں بھی تھیں، آسیہ اور مریم، مگر بیٹیاں تو، ظاہر ہے، پرایا دھن ہوتی ہیں؛ ان کے نام پر بھلا کون کاروبار قائم کرتا ہے!

یہ بات ججی نے کبھی نہ سوچی تھی، نہ ہی اس کے 'برادرز' نے۔ وہ ویسے بھی اس سے چھوٹے تھے۔ ایک ابھی پرائمری میں تھا اور دوسرا مڈل میں۔ آسیہ بھی پرائمری ہی جاتی تھی، جب کہ مریم اب دسویں جماعت میں پہنچ چکی تھی۔ خود ججی نے دو سال پہلے میٹرک کیا تھا، اور تب سے بڑے شیخ صاحب نے دکان کی زیادہ تر ذمہ داریاں اسی کو سونپ دی تھیں۔ پہلے وہ سکول کے بعد یا چھٹی کے دن دکان داری کے گُر سیکھا کرتا تھا، مگر ہائی سکول سے فارغ ہوتے ہی اس

حامد یزدانی

کے ابو جی نے اس کے گلے میں پوری ذمہ داری کا ڈھول لٹکا دیا تھا۔

جب اس نے ابو جی کے سامنے کالج میں داخلے کی خواہش ظاہر کی تو اسے میٹرک میں تھرڈ ڈویژن کا طعنہ سننا پڑا۔ ابو جی نے یہ بھی جتایا کہ اتنے نمبروں کے ساتھ کون سا اسے گورنمنٹ کالج میں داخلہ مل جائے گا اور وہ ڈاکٹر یا انجینئر بن جائے گا۔ انھوں نے اسے سمجھاتے ہوئے ازرو شفقت کہا کہ چار سال کسی عام کالج میں دھینگا مشتی کرنے سے بہتر ہے کہ وہ انہی چار برسوں میں خاندانی کاروبار چلانا سیکھ لے، تاکہ جلد از جلد اپنے خاندان کے دوسرے کامیاب افراد کی طرح اسی مین بازار، یا پھر اچھرہ یا انارکلی میں اپنی دکان کھول سکے اور اپنی ماموں زاد صغریٰ کے ساتھ شادی کر کے ہنسی خوشی زندگی گزار سکے۔

جی کو یہ بات سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ ابو جی سے داخلے اور فیس کی رقم لیے بغیر وہ کالج کی زندگی کا لطف نہیں اٹھا سکے گا۔ چنانچہ اس نے دکان کے آہنی گلے کو سنبھالنے میں کوئی تاخیر نہ کی۔ یہ بات الگ کہ بڑے شیخ صاحب دن میں دو تین بار دکان کا چکر ضرور لگاتے۔ دوپہر کے وقت وہ ایک گھنٹہ دکان پر گزارتے، جب جی کھانا کھانے گھر جاتا۔ جی کے لوٹنے پر وہ چند منٹ کی تاخیر کا سبب بھی دریافت کرتے، اور پھر شام کو آنے کا کہہ کر مارکیٹ یا گھر چلے جاتے۔ شام ڈھلے، دکان بند کرنے سے پہلے جب وہ واپس آتے تو جی سے دن بھر کی آمدن کا پورا حساب لیتے، اسے گلے کے پہلو میں دیوار سے ٹکی پرانی کاپی میں درج کرتے، نوٹ کم از کم دو بار گنتے، اور چند روپے اگلے روز کی آمدن میں برکت کی نیت سے گلے میں چھوڑ کر باقی رقم احتیاط سے اپنے سلوکے کی اندرونی جیب میں رکھ کر رخصت ہو جاتے۔

ذاتی خرچ کے لیے چار پانچ روپے دیتے ہوئے بھی وہ جی سے دس سوال ضرور کرتے، جن سے جی ہر بار زچ ہو جاتا۔ بڑے شیخ صاحب کاروبار میں رشتوں کا لحاظ کرنے کے قائل نہ تھے۔ دکان پر اگر ان کی بیوی یا بیٹی بھی کپڑا لینے آتی، تو جی کو تاکید تھی کہ وہ ان سے بھی دوسرے گاہکوں کی طرح قیمت وصول کرے۔ یہ بات پہلے پہل اسے بہت ناگوار گزری، اور اس نے اس بارے میں ابو جی سے بات بھی کی۔ مگر بڑے شیخ صاحب نے سمجھایا کہ گھر کے خرچ کے لیے ضروری رقم باقاعدگی سے دی جاتی ہے، اور کپڑے کی قیمت گھر کے کھاتے میں درج ہو سکتی ہے، جسے مہینے کے آخر میں دوسرے اخراجات کے ساتھ طلب کیا جا سکتا ہے، مگر دکان سے رقم ادا کیے بغیر کوئی خریداری نہیں کر سکتا۔ یہ اصول کی بات تھی۔ کاروبار کا حساب ہمیشہ پورا ہونا چاہیے۔

جی یہ سب دیکھتا آیا تھا، مگر اب اس نے یہ

اصول عملی طور پر اپنانے بھی شروع کر دیے تھے۔ عورتوں سے بھاؤ تاؤ میں وہ خاصا ماہر ہو چکا تھا، ان کی جھوٹی سچی تعریفیں کرنے سے بھی دریغ نہ کرتا، اور عمر رسیدہ گاہک خواتین کو خوش کرنے کے لیے انہیں خالہ جی یا ماسی کے بجائے 'باجی' کہہ کر مخاطب کرتا۔ گویا کاروبار چلانے کے سبھی گُر اس نے چند ہی دنوں میں سیکھ لیے تھے۔ ویسے بھی مچھلی کے بچے کو تیرنا سیکھنے میں کتنی دیر لگتی ہے!

ابو جی نے تو کبھی اس کا اظہار نہیں کیا، مگر آس پاس کے دکان دار کہتے تھے کہ اتنی جلدی کام سیکھ کر اس نے ضرور بڑے شیخ صاحب کا دل جیت لیا ہے۔ مگر جو بات شاید ان میں سے کوئی بھی نہ جانتا تھا، وہ یہ کہ باپ کا دل جیتنے والا یہ ہوشیار نوجوان اپنا دل کسی پر بری طرح ہار چکا تھا۔

وہ اکیس جون کا دن تھا۔ سال کا طویل ترین اور گرم ترین دن، جب تیسرے پہر 'برادرز کلاتھ ہاؤس' کے تقریباً سامنے کونے والی تین منزلہ عمارت کی دوسری منزل کی بالکونی میں وہ اسے تولیے سے اپنے لمبے اور گھنے بال سکھاتے ہوئے دکھائی دی۔ ڈھلتے دن کی تھکی روشنی میں اس کا بھیگا وجود اتنے فاصلے سے بھی جگی کو کچھ ایسا تر و تازہ محسوس ہوا جیسے کوئی جل پری اچانک سطحِ آب پر نمودار ہو گئی ہو۔

وہ کون ہے؟ اس بالکونی میں تو اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔'' جگی نے سفید لان کا کھلا تھان لپیٹتے ہوئے، اور کن انکھیوں سے بالکونی کی طرف دیکھتے ہوئے، خود سے متجسس انداز میں کہا۔ وہ محتاط بھی تھا، کیونکہ اسے شک ہو چلا تھا کہ یا تو امام مسجد مولانا علی بخش، یا پھر اُنو چائے والا، ان میں سے کوئی ایک، اس کی دن بھر کی رپورٹ ابو جی کو دیتا ہے۔

چند لمحے بالکونی میں رکنے کے بعد وہ لڑکی اندر چلی گئی، مگر جگی کی بے تاب نگاہیں اس سمت سے ہٹنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ وہ تو چند لمحوں کے اس منظر میں ہی اپنا دل اس پر ہار بیٹھا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اس لڑکی نے اسے دیکھا بھی ہے یا پھر وہ ہے کون؟

وہ اسے جاننے کو بے تاب ہو گیا تھا، مگر جل پری تک رسائی کی کوئی لہر اس کے ہاتھ نہ لگ رہی تھی۔ پھر قسمت اس پر یوں مہربان ہوئی کہ اگلے ہی روز وہ لڑکی اس کی دکان میں داخل ہوئی، سلام کرتی ہوئی، اور دیوار گیر بنچ پر بیٹھ کر گرمیوں کے سوٹ کے لیے نیا ڈیزائن دکھانے کی فرمائش کرتی ہوئی۔

جگی تو حیرت سے گنگ رہ گیا۔ وہ بس تھان پر تھان کھولے جا رہا تھا، اور وہ ہر کپڑے کو دائیں ہاتھ سے چھو کر نفی میں سر ہلا دیتی۔ عام طور سے دو تین تھان دکھا کر ہی جگی اکتا جاتا تھا، اور کاروباری مسکان کے پیچھے دل ہی دل میں گاہک کو کوستا رہتا تھا۔ مگر آج اس کا دل چاہ رہا تھا کہ آسمان پر تیرتے

بادل، رنگوں کو شرماتی دھنک، اور سمندر کے سینے پر مچلتی سبھی لہریں کپڑے کے تھان بن جائیں اور وہ ایک ایک کر کے اس جل پری کے سامنے بکھیر دے۔

یہ سب تو پرانے ڈیزائن ہیں۔ کچھ نیا نہیں کیا؟'' لڑکی نے آخری تھان بھی مسترد کرتے ہوئے، سپاٹ آواز میں پوچھا۔''

ججی کو اس کی سپاٹ آواز میں بھی بارش کی ننھی بوندوں کی کھنک سنائی دی، وہی کھنک جو ٹین کی چھت سے ٹکرا کر فضا میں بکھرنے والی بوندوں سے جنم لیتی ہے۔ عشق کرشمہ سازی کر رہا تھا۔

نا... نا... نام کیا ہے؟'' جانے کس قوت نے اس کے ہونٹوں سے یہ ادھورا جملہ ادا کروا دیا۔''

''نام...؟'' لڑکی نے حیرت سے پوچھا، جیسے کچھ سمجھ نہ پائی ہو۔''

جی، وہ ... آپ کے پسند کے ڈیزائن کا نام پتا ہو تو آسانی ہو جائے گی۔ اس سال کئی نئے ڈیزائن آئے ہیں۔'' وہ ہڑبڑا کر بولا۔''

''نام تو دکان دار کو پتا ہونا چاہیے، اگر وہ سمارٹ ہے تو۔'' لڑکی نے آنکھوں میں شرارت بھر کر کہا۔''

ایسا ہے کہ کچھ نئے ڈیزائن کل مارکیٹ سے آنے والے ہیں۔ بالکل برانڈ نیو۔ آپ کل آجائیے۔'' اس نے بڑی چالاکی سے اگلی ملاقات کی راہ ہموار کی۔''

''کل کس وقت...؟'' لڑکی اٹھتے ہوئے بولی۔''

شام سے پہلے ہی پہنچ جائیں گے۔ میں آپ کو بتا دوں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔'' وہ روا روی میں کہہ گیا۔''

بتا دیں گے؟ کیسے؟ خط لکھ کر یا فون کر کے؟ فون تو ہمارے ہاں ہے نہیں، اور پتا آپ کو معلوم نہیں۔'' لڑکی نے ہنستے ہوئے کہا۔''

جی، دراصل ... میں جانتا ہوں آپ کا پتا... وہ سامنے کونے والے مکان ہی میں رہتی ہیں نا آپ؟'' ججی نے جھینپتے ہوئے کہا۔''

''ہاں، پر آپ کو کیسے پتا...؟'' لڑکی نے دوبارہ حیرت سے پوچھا۔''

''بازار میں بیٹھے ہیں ہم۔ دن بھر آتی جاتی آوازیں سنتے رہتے ہیں۔ ایسی ہی کسی آواز نے بتایا تھا۔ آپ بس بالکونی میں آجائیے گا۔ میں اشارے سے بتا دوں گا کہ نئے ڈیزائن کے کپڑے پہنچے ہیں یا نہیں۔'' ججی نے پہلا تھان لپیٹتے ہوئے بات پوری کی۔

سمجھ نہیں آئی۔ کیسے بتائیں گے آپ مجھے؟ بازار سے آواز دے کر یا کیسے؟'' لڑکی نے بھنویں سکیڑ کر پوچھا۔''

''ارے نہیں... وہیں تو... ادھر...'' ججی نے اس کے گھر کی بالکونی کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے ہاتھ کی جنبش کے تعاقب میں لڑکی کی نظریں بھی بالکونی کی طرف اٹھ

گئیں، جہاں ریلنگ پر ایک کوا بیٹھا اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

”اچھا! تو اس کوے کے ہاتھ پیغام بھجوائیں گے آپ؟“ لڑکی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

”نہیں، نہیں... میرا مطلب تھا کہ بالکونی کوئی اتنی دور بھی نہیں۔ میں اشارے سے بتا دوں گا۔“ جگی نے رکتے رکتے کہا۔

”اشارے کرنا اچھی بات تو نہیں۔۔۔ مگر چلیے، دیکھ لیتے ہیں کیسے بلاتے ہیں آپ۔ خدا حافظ۔“ لڑکی نے کہا اور ایک ادا سے ہاتھ ہلاتے ہوئے دکان سے نکل گئی۔

اگلی صبح جگی نے ابو جی کی منت سماجت کی اور خود مارکیٹ جا کر کچھ مہنگے اور نئے ڈیزائن کے تھان خرید لایا۔ پھر دکان پر بیٹھ کر بالکونی آباد ہونے کا انتظار کرنے لگا، مگر اس کی امید بر نہ آئی۔ اور کچھ ہی دیر بعد اسے حیرت سے بھرا جھٹکا لگا، وہ لڑکی سلام کرتی ہوئی دکان میں داخل ہو رہی تھی۔

”میں نے سوچا، آپ کو اشارے کی زحمت سے بچا لیا جائے۔“ وہ بنچ پر بیٹھتے ہوئے مسکرائی۔

”بہت اچھا کیا آپ نے۔ یہ دیکھیے، نئے ڈیزائن... آج ہی آئے ہیں۔“ جگی نے کپڑا دکھاتے ہوئے کہا۔

”آئے ہیں یا لائے ہیں؟“ لڑکی نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ایک ہی بات ہے۔۔۔ آپ کپڑے دیکھیے، ان کے ڈیزائن دیکھیے۔ یہ ضرور آپ کو پسند آئیں گے۔ پورا بازار گھوم آئیں آپ، کسی اور کے پاس نہیں ملیں گے یہ ڈیزائن۔“ جگی نے شیخی بگھارتے ہوئے کہا۔

”میں کیوں جانے لگی بازار گھومنے! میں کیا آپ کو کوئی ایسی ویسی لڑکی لگتی ہوں؟“ لڑکی نے جعلی ناراضی کے انداز میں کہا مگر پھر کپڑے کو چھو کر اور اس کی ملائمت محسوس کر کے دھیرے سے مسکرا دی۔ کچھ سوچا اور ایک سوٹ کا کپڑا دینے کو کہا۔

”ایک ہی سوٹ؟“ جگی نے حیرت، تاسف اور اصرار بھرے لہجے میں کہا۔ ”میں تو کہتا ہوں، ان میں سے ہر ڈیزائن کا ایک ایک سوٹ لے جائیے۔ یہ ڈیزائن پھر نہیں ملیں گے۔“

”لیکن ابھی میں ایک ہی سوٹ خرید سکتی ہوں۔ باقی پھر سہی۔ یہ بتائیے، اس ایک سوٹ کے کتنے پیسے ہوئے؟“ لڑکی نے پرس سے رقم نکالتے ہوئے پوچھا۔

”ارے ارے! کیسی باتیں کرتی ہیں آپ! پیسوں کا کیا ہے، آ جائیں گے۔ مگر یہ کپڑا ختم ہو گیا تو اس سیزن میں تو ملنے سے رہا۔ پیسوں کی فکر نہ کریں۔ آپ یہ بتائیں کہ یہ ڈیزائن آپ کو پسند آئے کہ نہیں؟“ جگی نے تین تھان دوبارہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”پسند تو تینوں آئے ہیں مگر۔۔۔“ لڑکی نے

جھجکتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔"

"ہمسائیگی میں اگر مگر اچھی نہیں لگتی۔ آپ کون سا بھاگی جا رہی ہیں!" بجی نے تھان سے سوٹ کا کپڑا کاٹتے ہوئے کہا۔"

"اور اگر بھاگ گئی تو۔۔۔؟" لڑکی نے کھلکھلاتے ہوئے، دوپٹا سر پر درست کرتے ہوئے جواب دیا۔"

"تو بھاگ جائیں۔۔۔ مگر ایک وعدہ کیجیے کہ بھاگتے ہوئے یہ تینوں سوٹ ساتھ لے کر جائیں گی آپ!" بجی نے قدرے بے تکلفی سے کہا اور وہ بے ساختہ ہنس دی۔"

"آپ بڑے پکے دکان دار ہیں۔ ایک سوٹ لینے آئی تھی، تین سوٹ بیچ دیے۔ کاروبار کرنا تو کوئی آپ سے سیکھے۔ اتنی کم عمر میں آپ نے۔۔"

"نہیں جی نہیں، میرا قد ذرا چھوٹا ہے، ورنہ میں چھوٹا ہرگز نہیں۔ دو سال پہلے میٹرک کیا تھا اچھی ڈویژن کے ساتھ۔ وہ تو ابو جی کو دکان پر مدد چاہیے تھی، اس لیے کالج نہ جا سکا۔ شاید اگلے سال چلا جاؤں۔ تب تک چھوٹا بھائی دکان پر ہاتھ بٹانے کے قابل ہو جائے گا۔" بجی نے تینوں سوٹ الگ الگ پیک کر کے پلاسٹک کے رنگین تھیلے میں ڈال دیے۔ یہ شاپنگ بیگ بھی وہ آج ہی مارکیٹ سے لایا تھا۔

"کسی اچھے درزی سے سلوائیے گا۔ یہ تینوں رنگ آپ پر بہت کھلیں گے، دیکھ لیجیے گا۔" بیگ تھماتے ہوئے بجی نے کہا۔

لڑکی نے بیگ پکڑتے ہی ہاتھ جھٹ سے کھینچ لیا، کیونکہ بے خیالی میں دونوں کے ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے سے چھو گئی تھیں، اور یکا یک ایک برقی رو سی دونوں کے اندر دوڑ گئی۔

بجی بھی یہ سب محسوس کرتے ہوئے بظاہر جھینپ گیا، مگر اس کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکان کھیل رہی تھی۔

یوں آغاز ہوا محبت اور آنکھ مچولی کا وہ کھیل جس کی دل چسپی نے سال گزرنے کا احساس تک نہ ہونے دیا۔ 'برادرز کلاتھ ہاؤس' اور سامنے کونے والے مکان کی دوسری منزل کی بالکونی کا فاصلہ روز بروز سکڑتا جا رہا تھا۔ ان کے درمیان کوئی تار نہیں تھا، مگر رابطہ کسی بھی تار سے زیادہ مضبوط تھا۔

اسی دوران میں بجی کو لڑکی کا نام بھی معلوم ہو گیا؛ راحیلہ، مگر گھر میں اسے پیار سے 'حیلہ' کہتے تھے۔ وہ پرائمری پاس کرنے کے بعد اپنے ماموں کے ہاں سرگودھا چلی گئی تھی، جہاں اس نے پچھلے سال میٹرک کا امتحان دیا، مگر چند مضامین میں فیل ہونے کے باعث اسے دوبارہ امتحان دینا پڑ رہا تھا۔ اب وہ اپنے والدین کے پاس ہی رہتی تھی۔ وہ مریم کے سکول میں جاتی تھی اور اس نے مریم سے بھی میل جول بڑھا لیا تھا۔ نت نئے کپڑوں کے بارے میں وہ اپنی امی کو یہی بتاتی کہ یہ مریم اسے تحفے میں دیتی

ہے- یوں تحائف کا تبادلہ باقاعدگی سے ہوتا رہا، کبھی سالگرہ کے بہانے، کبھی عید کی مبارک باد کے طور پر-
مگر رومان کی یہ بے فکر پرواز اس وقت تھمی جب ایک روز بڑے شیخ صاحب نے دکان اور بالکونی کے درمیان تار کے بغیر قائم مواصلاتی رابطے کا سراغ لگا لیا- انھوں نے کچھ مالی بے قاعدگیاں بھی پکڑ لیں اور ججی کی حرکات پر نظر رکھنے کے لیے دکان پر زیادہ وقت گزارنے لگے- وہ ججی کی شادی اس کے ماموں کے ہاں کرنے کا وعدہ کر چکے تھے اور مزید تاخیر نہیں چاہتے تھے، مگر ججی مسلسل ٹال مٹول کر رہا تھا-
اُدھر راحیلہ کے والدین بھی اس کی شادی اپنی برادری ہی میں کرنا چاہتے تھے - انھیں ارائیوں سے باہر شادی سخت ناپسند تھی- جب والدین نے دور دور کی ملاقاتوں پر پابندی لگائی تو وہ دونوں کبھی لارنس گارڈن اور کبھی چوبرجی کی بیسمنٹ والے ریستوران میں پاس پاس بیٹھ کر ملنے لگے- وہ دونوں تو ساتھ رہنا چاہتے تھے، مگر ان کے خاندان اس رشتے کے مخالف تھے- والدین کی رضا مندی کے بغیر شادی کا فیصلہ کرنا ان کے لیے آسان نہ تھا، کیونکہ دونوں معاشی طور پر انھی پر انحصار کرتے تھے-
انھیں لگتا تھا کہ ان کی محبت کا دشمن کوئی ایک شخص نہیں تھا، ایک پورا نظام تھا جو ان کے خلاف کھڑا تھا-

کئی ملاقاتوں کے بعد بالآخر انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ قانونی طور بالغ ہو چکے ہیں، شادی ضرور کریں گے، خاندان مانیں یا نہ مانیں- چنانچہ طے ہوا کہ وہ گھر سے بھاگ جائیں گے اور کسی دوسرے شہر جا کر شادی کر لیں گے- جب تک گھر والے ان تک پہنچیں گے، وہ میاں بیوی بن چکے ہوں گے، اور پھر قبول کرنے کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ نہ ہوگا-
تاہم اس ضمن میں پہلا مسئلہ یہ تھا کہ لاہور سے بھاگ کر جایا کہاں جائے؟ اس کا حل ججی نے اپنے پرانے ہم جماعت رستم کی مدد سے نکال لیا- رستم اپنے باپ کے ساتھ سیالکوٹ میں ایک کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں رہتا تھا- اس کا باپ وہاں مدت سے چوکیدار تھا اور ان دنوں چوکیداری کی ذمہ داری رستم کو سونپ کر سوات میں اپنے آبائی گھر گیا ہوا تھا، جہاں بیماری کے باعث اسے رکنا پڑ گیا تھا- ججی نے رستم کو دو سوٹ تحفتاً دیے تھے، جس پر رستم نے اسے بتایا کہ اس کا کوارٹر دو کمروں پر مشتمل ہے اور وہ جب تک چاہیں ایک کمرے میں رہ سکتے ہیں-
یہ مسئلہ حل ہوا تو اب وقت کے تعین کا مرحلہ سامنے آ کھڑا ہوا، بھاگا جائے تو کب بھاگا جائے؟ کوئی ایسا دن چاہیے تھا کہ گھر والے فوراً پکڑ نہ سکیں-
عید کا دن؟ شبِ برات کی شام؟ نئے سال کی رات؟ بارہ ربیع الاول کے جلوس کی شب؟ کئی تجاویز پر غور ہوا مگر کوئی فیصلہ نہ ہو پایا-

اس معاملے میں وہ کسی سے مدد بھی نہیں مانگ سکتے تھے۔ دونوں خود کو بے یار و مددگار محسوس کر رہے تھے۔
ایسے میں عالمی طاقت 'امریکا بہادر' ہی کو ان بے چارے عاشقوں کی مدد کو آگے بڑھنا پڑا۔
خبر یہ آئی کہ انیس سو تہتر سے زمین کے گرد گھومتی امریکا کی خلائی لیبارٹری 'سکائی لیب' ناکارہ ہو کر زمین پر گرنے والی ہے۔ صبح کے اخبارات ہوں یا شام کے ضمیمے، سبھی روزانہ اس کی رفتار، حجم، ممکنہ نقصانات اور گرنے کے مقام کے بارے میں نت نئی معلومات چھاپنے لگے۔ گھروں، دفتروں، عبادت گاہوں اور تعلیمی اداروں میں ہر طرف اسی واقعے کا چرچا تھا۔ بہت سے لوگ خوف زدہ اور فکر مند تھے۔ مولانا علی بخش تو جمعہ کے خطبے میں خصوصی دعائیں بھی کرواتے تھے۔
یہ خبر جو بہتوں کے لیے بری تھی، ان دونوں کے لیے کسی بڑی خوش خبری سے کم نہ تھی۔ جگی تو دل ہی دل میں قائل ہو گیا تھا کہ امریکا ہی پاکستان اور اس کے غریبوں کا سچا دوست ہے۔ شاید اسے معلوم نہ تھا کہ اکہتر کی جنگ میں امریکی بحری بیڑہ پاکستان کی مدد کو نہیں پہنچ پایا تھا۔ خیر، معلوم بھی ہوتا تو کیا فرق پڑتا، اب تو اس کی انسان دوستی ثابت ہو رہی تھی۔
محبت بھی کبھی کبھی سکائی لیب کی طرح بے قابو، بے سمت اور بے وقت گرتی ہے۔
راحیلہ کے سکول میں جانے کس نے یہ 'مصدقہ' خبر پھیلا دی کہ سکائی لیب ہو نہ ہو اسی شہر میں، اور شاید انھی کے محلے میں گرے گی۔ خبر بچوں کے ذریعے گھروں تک پہنچی تو مائیں سخت پریشان ہوئیں۔ مردوں نے حفاظتی خندقیں کھودنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ سن پینسٹھ اور اکہتر کے رضاکار بھی اپنے طور پر فعال ہو گئے۔ فائر بریگیڈ کو چوکنا رہنے کی ہدایات مل گئیں۔ اٹو کے ہوٹل کی ہلتی میزیں ہوں یا منھے نائی کے 'گرم حمام' کی کرسیاں، سب پر سکائی لیب گرنے کے خدشات دن بھر جھنجھناتے رہتے۔ سب اس فضائی آفت کے ممکنہ تباہ کن اثرات کو چشم تصور سے دیکھ رہے تھے اور اندر ہی اندر لرز رہے تھے۔ ہر چہرے پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔
اس سراسیمگی اور خوف کے عالم میں اگر کوئی خوش تھا تو وہ دو ہی لوگ تھے: اعجاز شیخ عرف جگی اور راحیلہ عرف حیلہ۔ دنیا خوف میں ڈوبی ہوئی تھی، مگر ان دونوں کے دلوں میں پہلی بار ایک عجیب سی بے خوف روشنی جاگی تھی۔ جیسے جیسے دوسروں کے دلوں میں گھبراہٹ بڑھ رہی تھی، ویسے ویسے ان دونوں کے چہروں پر بشاشت اور طمانیت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ سبب یہ کہ انھوں نے گھر سے بھاگنے کے دن کا تعین کر لیا تھا۔
''جس دن امریکا کی سکائی لیب زمین پر گرے گی، ہم دونوں اسی دن گھر سے بھاگ جائیں گے۔'' یہی فیصلہ انھوں نے

بہت سوچ بچار کے بعد طے کیا تھا، کیونکہ اس دن سے زیادہ موزوں کوئی اور دن ان کی نظر میں نہ تھا۔ وہ اس دن کی افراتفری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈالے، شہر کے ہراساں باشندوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے اپنی محبت کی پُرسکون منزل کی طرف بڑھ جائیں گے۔ یہ طے کرنے کے بعد انھوں نے چپکے چپکے اس کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔

سیالکوٹ میں رستم کو آگاہ کر دیا گیا تھا۔ ججی نے دکان کے گلّے اور نوٹ بک کی جمع تفریق کی آڑ میں، بڑے شیخ صاحب کی شاطر نگاہوں کے پیچھے سے کچھ رقم 'پار' کر لی تھی، جسے اس نے اپنے اس بیگ کے خفیہ خانے میں چھپا لیا تھا جو وعدے کے دن ساتھ لے جانا تھا۔ حیلہ نے بھی اپنے کپڑے، جوتے، کچھ اصلی اور زیادہ نقلی زیورات اپنے سکول کے بڑے سے بیک پیک میں سنبھال کر رکھ لیے تھے۔

سکائی لیب گرنے کی خبریں اب اور بھی تواتر سے آنے لگیں۔ اس کی تصاویر اور کارٹون مختلف کہانیوں کے ساتھ چھپنے لگے۔ پھر ایک روز سکائی لیب کے زمین پر گرنے کی ممکنہ تاریخ بھی سامنے آ گئی: گیارہ جولائی انیس سو اناسی۔

....

اور پھر وہ دن بھی آ ہی گیا۔

گیارہ جولائی کی صبح اچانک کچھ لڑکے بڑے چوک سے بھاگتے ہوئے اندرونی گلیوں میں دوڑتے دکھائی دیے۔ وہ ہذیانی لہجے میں چیخ رہے تھے:

”بڑے چوک میں... بڑے چوک میں سکائی لیب... سکائی لیب گر گئی... بھاگو“

اوہ خدایا! رحم!“ منھے نائی کی دکان کے پاس سے گزرتے مولانا علی بخش کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

لوگوں نے ابھی ابھی کھولی ہوئی دکانیں بند کرنا شروع کر دیں۔

ججی بھی کلاتھ ہاؤس کا شٹر گرا کر اپنا بیگ اٹھائے بڑے چوک کی طرف بھاگا۔ حیلہ نے بھی کپڑوں، جوتوں اور زیورات سے بھرا بیک پیک کمر پر جمایا اور تیز تیز قدموں سے بڑے چوک کی طرف بڑھنے لگی۔ اسے یقین تھا کہ اس کے گھر والے یہی سمجھیں گے کہ وہ سکول گئی تھی، جہاں سے افراتفری میں لاپتا ہو گئی۔

ان دونوں کے دل جوش سے دھک دھک کر رہے تھے۔ ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا، کیونکہ آخرِ کار ان کے ایک ہونے کا دن آ ہی گیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں امریکا کا شکریہ ادا کر رہے تھے، جس کی بے کار خلائی لیبارٹری ان کی زندگی کے لیے سب سے زیادہ کارآمد ثابت ہوئی تھی۔

ججی مین بازار سے اور حیلہ سوڑی گلی سے ایک ہی وقت میں بڑے چوک پہنچے۔ چوک پر نظر پڑتے ہی ان کے قدم ٹھٹھک کر وہیں جم گئے۔ منظر ان کی توقعات سے یکسر مختلف تھا۔

وہاں بہت سے لوگ جمع تھے، مگر فضا سراسیمگی کے بجائے مسکراہٹوں اور قہقہوں سے گونج رہی تھی۔ انھوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا اور بیک وقت ہجوم کی طرف قدم بڑھا دیے۔

ان کی آنکھوں نے دیکھا کہ چوک میں لڑکوں کے ہائی سکول کی دیوار کے ساتھ شہر کی پانی والے ٹرک کا مدت سے بے کار پڑا مدوّر کنٹینر نیلے رنگ میں نہایا ہوا تھا، اور اس پر بڑے بڑے حروف میں سرخ روغن سے دو لفظ لکھے تھے:

''سکائی لیب''

اور لوگ اس 'دو نمبر' سکائی لیب کی طرف اشارے کر کر کے ہنسی میں لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔

''یہ ضرور سکول کے شرارتی ٹولے کی کارستانی ہے۔ میں دیکھتا ہوں انھیں۔'' ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب نے اپنا سائیکل ہجوم سے باہر کھینچتے ہوئے کہا۔ ''شیطان کہیں کے۔ خواہ مخواہ بے چارے لوگوں کی جان خشک کر دی۔ اصل سکائی لیب تو اُدھر گرا ہے، آسٹریلیا میں کہیں، میں نے خبروں میں سنا ہے۔''

''کچھ ٹکڑے اس کے، کہتے ہیں، بحیرۂ ہند میں بھی گرے ہیں مگر یہاں سے بہت دور۔ اللہ کا شکر ہے۔'' مولانا علی بخش نے بات میں اضافہ کیا۔

''اوئے ججی کے بچے! تو کیا کر رہا ہے یہاں؟ یہ بیگ اٹھائے کہاں جا رہا ہے؟ چل، واپس دکان کھول، اللہ کا نام لے کر۔ کوئی بوہنی کر۔ چل، میں بھی آتا ہوں تیرے پیچھے پیچھے۔''

بڑے شیخ صاحب کی غیر متوقع آواز نے ججی کے اوسان خطا کر دیے۔

اس وقت اسے اپنے ابوجی پر بڑا غصہ آ رہا تھا، مگر ان سے کہیں زیادہ امریکا پر، جس کی سکائی لیب واقعی ناکارہ ثابت ہوئی تھی، بالکل ناکارہ۔ گرنا اسے لاہور پر تھا، اور جا گری آسٹریلیا میں! یہ بھی کوئی بات ہوئی! اس سے اچھی چیزیں تو ہمارا پڑوسی چین بنا لیتا ہے۔

یہی کچھ سوچتے ہوئے وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا واپس مین بازار کی طرف چل پڑا، دکان کھولنے۔

اُن نوجوان دلوں کا منصوبہ بھی غلط جگہ جا گرا تھا، سکائی لیب کی طرح --- ججی اور اس کی جل پری سے بہت دُور --- اجنبی پانیوں میں کہیں۔

بڑے چوک سے اب مجمع بھی چھٹنے لگا تھا -- مگر حلیمہ ابھی تک وہیں کھڑی تھی، گم صم۔ انھوں نے اپنے منصوبہ میں ہر امکان کا احتیاط سے جائزہ لیا تھا، سوائے قسمت کے۔

اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اپنے بھاری بھر کم بیک پیک کے ساتھ اب کہاں جائے:

سکول یا گھر؟

اس کے سوال میں صرف راستہ نہیں، ساری عمر کا فیصلہ چھپا تھا۔

☆☆☆☆☆

گیس چیمبر

بڑے افسر نے اپنی سُرخ اور موٹی کلائیوں پہ دونوں ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنی اداس بیگم کو بہلاتے ہوئے کہا، دیکھو تم کتنی خوش نصیب ہو، کتنی خوشحال ہو - تمھارے پاس خوش رہنے اور فخر کرنے کو دنیا کی بڑی بڑی سہولتیں ہیں- پھولے ہوئے گالوں کی مالک گوری چٹی اور صحت مند بیوی نے مصنوعی مسکراہٹ سے تائید کی - لیکن خاموشی برقرار رکھتے ہوئے اس نے ٹھنڈے جوس کا گھونٹ بھرا اور پھر اپنے سامنے کی دیوار پر لگی ہوئی ایک خوبصورت منظر کی پینٹنگ کو دیکھتے ہوئے حسرت سے کہا، اگر کبھی ایسی جگہ جانا ہوا تو وہیں گم ہو جاؤں گی- آہ بھرتے ہوئے وہ پھر بولی- آخر دنیا میں کہیں نہ کہیں یہ جگہ تو موجود ہو گی نا، میں اب ایسے کسی منظر کا حصہ بن کر ساری زندگی کے لیے اس میں بس جاؤں گی- بڑے افسر نے اپنی قابلیت اور تحمل سے لہجہ بلند کرتے ہوئے کہا- یہ پولینڈ کے ایک گاؤں کا منظر ہے- میں نے دو لاکھ پاکستانی روپے خرچ کر کے دوبئی سے خریدی تھی- لیکن اپنے ملک کی بات ہی کچھ اور ہے- دیکھو تمھارے اس شہر میں 70 فیصد لوگ اس وقت گرمی اور حبس میں جھلس رہے ہیں- ٹھنڈی ہوا، سکون اور ٹھنڈے پانی کے لیے لوگ ترس رہے ہیں- لوگ راتوں کو اندھیرے، تپتی ہواؤں میں دم گھٹنے سے مر رہے ہیں- جبکہ تمھارا کمرہ اس وقت سائبیریا کی کسی وادی سے زیادہ ٹھنڈا ہے اندھیرا تمھارے گھر کی دہلیز پار کر کے اندر نہیں آتا- تمھارے فریز میں اس وقت وہ سارے پھل اور مشروبات موجود ہیں جنھیں اس ملک کی کثیر آبادی نے اس آگ برساتے موسم میں سوچا بھی نہ ہو گا- اور پھر جب تم ایئر کنڈیشن گاڑی میں بیٹھ کر بازار جاتی ہو- تمھاری گاڑی پہچانی جاتی ہے- لوگ تمھیں راستہ اور آسانی دینے میں عجلت سے کام لیتے ہیں- دکاندار تمھیں اچھی ،خالص اور بہترین چیز نکال کر تمھاری مرضی کے قیمت پر دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں- آس پاس کے لوگ تمھاری توجہ حاصل کرنے اور تعلق بنانے کا موقع ڈھونڈتے رہتے ہیں- یہ سب صرف اس ملک میں ممکن ہے- تمھیں ایسے غلام قدم قدم پر مل جاتے ہیں- جنھیں نہ تم نے کبھی معاوضہ، اجرت یا انعام دینا ہے اور نہ ہی تم نے کبھی ان کی شکل ، حلیہ اور نام کو یاد رکھنا ہے- یہ تمام

کلیم خارجی

چیزیں تو گذشتہ زمانوں کے بادشاہوں کو بھی نصیب نہیں تھی۔

میں تو اس منظر کی خوبصورتی، گہرائی اور پراسراریت کی بات کر رہی ہوں۔ جبکہ تم مجھے اپنے رعب، جبر اور امارت کے ساتھ ساتھ اردگرد لوگوں کی بے بسی، جہالت، پسماندگی اور غربت کی تفصیل بتا رہے ہو۔

افسر اپنی بیگم کی باتیں سن کر تھوڑی دیر تک سکتے میں رہ گیا، وہ چپ چاپ حیرت، ملامت اور مذمت سے گھورتے گھورتے پلکیں جھپکانا ہی بھول گیا۔

اس کا ذہن اس کے اندر بولنے لگا، یہ عورت بھی بہت خوبصورت، بہت ذہین تھی - اسے رنگوں، کپڑوں، بچوں، پرندوں، درختوں اور بارشوں سے محبت تھی۔ یہ اگر شادی نہ کرتی تو آج بہت بڑی مصورہ ہوتی۔ یا کسی درسگاہ میں پینٹنگز کی پروفیسر ہوتی، میں نے اپنی دولت، مکاری اور تعلقات کی بنا پر اس کا رستہ اپنی طرف موڑ کر اسکے ہاتھ سے برش اور پینٹنگز کلرز چھین لیے ہیں۔ اپنی آواز سن وہ جھینپ کے رہ گیا۔ اور مصنوعی نرمی اور پیار سے بولا۔ یہ تصویر پولینڈ کی ہے۔ یہاں دوسری جنگ عظیم کے دوران کنسنٹریشن کیمپس اور گیس چیمبرز قائم تھے۔ جہاں جنگی قیدیوں کو اذیت ناک سزائیں دے کر ہلاک کیا جاتا تھا۔ پولینڈ کے لوگوں کی روح میں ہلاکتوں اذیتوں اور السناکیوں کے منظر آج تک زندہ ہیں۔ اس لیے وہاں کے مصور اپنی نسلوں کی روحانی مسرت اور توانائی کے لیے ایسی پینٹنگز بناتے ہیں۔ تاکہ دنیا کے لوگوں کو یقین دلایا جائے کہ پولینڈ اپنے ماضی کی طرح آج بھی رنگوں، پھولوں، تتلیوں، باغوں والا خوبصورت ملک ہے۔

افسر کی بیوی نے اپنی آنکھیں تصویر پر جمی رہنے دیں۔ اور حسرت سے بولی۔ پینٹرز کے کمالات نے مجھے موہ لیا ہے۔ میں روزانہ تصویر میں گم ہو جاتی ہوں۔ ہر روز اس کے حسن کی وجہ سے اندر ایک نئی سوچ پیدا ہوتی ہے۔ اسکی نیلی جھیل، چمکتے سنہرے پہاڑ، رنگ برنگے پھولوں کی جھاڑیاں، جھیل میں اترتے ہوئے چشمے، حیرت انگیز رنگوں کے گھنے درخت جن کی بلند قامتی، پتوں کے رنگ، شاخیں اور شاخوں پر پرندے اور کچے پکے پھل دیکھ کر میرا دل کہتا ہے کہ اگر خدا نے بہشت ابھی تک تعمیر نہیں کی۔ تو اس وادی کو دیکھ کر اس کی رحمت ضرور جوش میں آئے گی اور وہ اس پینٹرز کو کسی جنت کی تعمیر میں ضرور شامل کرے گا۔

افسر نے ہار مانتے ہوئے سنجیدگی سے کہا، پینٹرز خدا کی مدد کیوں کرے گا۔۔ خدا نے تم کو بنایا ہے۔ تمھاری وجہ سے میرے زندگی میں حسن اور خوشیاں ہیں۔ یہ تصویر اتنی بھی غیر معمولی نہیں کہ تم اول فول کہنے لگو، زینی تم رات بھر کی تھکی ہوئی ہو۔ تمھاری نیند پوری نہیں ہے - وہ خوشامد کرتے ہوئے بولا، ایکسیلنسی صاحب کی فیملی ساری رات جاگنے کی عادی ہے۔ وہ دن کو سوتے ہیں۔ ہمیں ان کی میزبانی ذرا مشکل پڑ گئی۔ - - تم نے کئی مرتبہ۔۔۔ بہت اچھی چیزیں بنائیں۔

نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ اپنائیت اور خلوص سے بولی۔ ہم بھی تو رات دیر تک جاگتے ہیں۔

صبح دس بجے تو ہمارا ناشتہ بنتا ہے---
تمھاری کھانسی تو اب بالکل ٹھیک ہوگئی۔ یہ چیسٹ الرجی آہستہ آہستہ ختم ہو کر رہے گی۔ وہ محبت کا اظہار کرتے ہوئے موضوع بدلتے ہوئے بولا، میں نے تمھیں، بوڑھی اور کمزور نہیں ہونے دیا۔ جیسی تم اٹھارہ سال پہلے تھی اب بھی ویسی ہو--- وہ بستر پر سرکتے ہوئے اس کے پہلو میں آلیٹا، اور اس کے کولہے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا، تم نے جو کچھ اس تصویر میں دیکھا ہے وہ مجھے کبھی نظر نہیں آیا۔ میرے خیال تھا کہ یہ عام سی تصویر ہے۔ دیوار پہ لگی ہوئی، کمرے کی رونق بڑھاتی رہے گی۔
اس نے افسر کے شرارتی ہاتھ کی انگلیاں مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔ دیکھو اس تصویر میں یہ بینچ پہ بیٹھی ہوئی بارہ سالہ لڑکی کا حسن، آنکھیں اور معصومیت دیکھو۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ پوری دنیا دیکھ رہی ہے۔ لیکن ذرا غور سے دیکھو تو وہ اپنے سامنے اُگے ہوئے ہلکے گلابی پھول پر بیٹھی ہوئی سفید تتلی دیکھ رہی ہے۔ اس کی نیلی آنکھوں کا تجسس--- تو میرے اندر طوفان مچا دیتا ہے۔ اس کے سامنے نیلے، اودی، گلابی، سُرخ، پیلے اور بنفشی پھولوں کا چمن ہے۔ وہ خود ایک تتلی بنی بیٹھی ہے-- اس کی سُرخ اور سیاہ دھاریوں والی فراک سنہرے بال، چپلی نیکر، تندرستی اور دلکشی میں رچا ہوا جسم، گداز ہاتھ اور سونے جیسی پنڈلیاں اور پھر اس کے عقب میں اس کے دو چھوٹے بہن بھائی--- شاخوں پر بیٹھے ہوئے پرندوں سے باتیں کرتے ہوئے خود بھی چہچہاتے ہوئے پورے منظر میں سحر طاری کر رہے ہیں۔ ان بچوں کے چہرے دیکھو--- یار لگتا ہے ایسی وادی میں صرف اسی طرح کے بچے زندگی گزارنے کا حق رکھتے ہیں۔ آسمان سے اترتے ہوئے فرشتوں جیسے بچے، جن کی مشابہت ہمارے ہاں کہیں بھی نہیں ملتی۔ روحانی اور جسمانی خوشی اور خوبصورتی تینوں بچوں کے روپ سے سب کچھ ظاہر ہو رہا ہے۔
”ہمارے بچے بھی تو بہت خوبصورت ہیں۔ افسر نے اُسے ڈانٹتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا---
”ہاں ضرور وہ اعتماد اور تحمل سے بولی ہمارے بچے صرف ہمارے لیے خوبصورت ہیں۔ ہمارے بچوں کے چہروں پر ہار نہ ماننے، اپنی مرضی منوانے، ناقابلِ تسخیر ہونے کا غرور چھپا ہوا ہے۔ وہ محبت اور حسن کی تاثیر کے متعلق بے حس ہیں۔ انھیں پھول، پرندے اور تاروں بھرا آسمان بھی اچھا نہیں لگا۔ وہ آزاد، خود مختار اور خوشحال ہونے کا حق اور اعتماد ظاہر کرتے رہتے ہیں۔ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اس زمین پر خوش نہیں ہیں۔“ وہ مجھے اور تمھیں چھوڑ کر امریکہ، اٹلی اور فرانس جانا چاہتے ہیں۔ تینوں اپنی اپنی نئی دنیا کی خواہش میں ہیں۔ اور اس اُمید پہ زندہ ہیں کہ انہیں حق اور نصیب کی زیادہ بہتر چیزیں اس زمین سے دور کہیں اور ان کے انتظار میں ہیں۔ ابھی انہیں پوری طرح دنیا کی کچھ سمجھ نہیں آتی۔ لیکن وہ ہمیں اور اس ملک کو چھوڑ جانے پر تیار ہیں“ اپنے عیش پسند شوہر کو سوچنے اور بات کرنے کا موقع دیے بغیر ان نے اپنی بات

جاری رکھی۔ اس تصویر میں مصور نے جو کمال دکھایا ہے۔ وہ تمھیں دکھادوں۔۔۔ بچوں کا وجود، اور وادی کے سارے منظر ایک دوسرے کی دلکشی میں اضافہ کر رہے ہیں۔ دیکھو، پہلی بچی بارہ سال کی ہے، دوسرا لڑکا نو سال کا۔ تیسرا چھ سال کا۔۔۔ اور وہ چھوٹی سی پری۔ جو پگڈنڈی پہ اپنی ماں کے آگے آگے چلتی آرہی ہے۔ تین سال کی ہے۔ یوں ترتیب، توازن اور وقت کا ٹھہراؤ، اور اس کی رفتار، سب کچھ حسین اور زندگی سے بھرپور ہیں۔ پھر اس عورت کی قامت اور جسمانیت دیکھو۔ اس کی کلائیوں سے اس کی عمر، مشقت اور ذمہ داریوں کا اندازہ ہوتا ہے وہ ایک حسین، صحت مند اور بااعتماد عورت کے روپ میں اپنی ابھرتی ہوئی انفرادیت میں سب سے نمایاں لگ رہی ہے۔ اس کے چہرے پر خوشحالی، اطمینان، قناعت، وفاداری۔ سب کچھ ظاہر ہو رہا ہے۔ اس کے آگے دوڑتی ہوئی تین سالہ بیٹی کو دیکھو۔ جیسے کسی درخت سے فاختہ اتر کے پھدکتی جا رہی ہے۔ بچی کے بال برف کی طرح سفید ہیں۔ ماں کے بالوں سے ملتے جلتے۔ ماں کی مسکراہٹ۔ دیکھو جیسے کہہ رہی ہو۔ ہمیں سب کچھ مل چکا ہے، اور ہمارے پاس سب کچھ موجود ہے، اس کے ایک ہاتھ میں مچھلیوں کی ٹوکری ہے۔ دوسرے میں پھلوں اور سبزیوں کی۔۔۔ اور اپنے سامنے دوڑتی ہوئی بچی کو نگران، اور مہربان نظروں سے دیکھتے ہوئے چلی آرہی ہے۔ اسے اپنی محبت خاندان کی زندگی۔ اور سلامتی کا بھروسہ ہے۔

افسر بگڑتے ہوئے تلخی سے بولا۔۔۔ ”اس تصویر میں مرد نام کی کوئی چیز نظر نہیں آرہی“۔

وہ ہنستے ہوئے استادانہ انداز میں بولی۔ ”وہ دیکھو کنارے پر کھڑی، فیروزی رنگ کی کشتی کے قریب ایک مضبوط جسم کا جفاکش آدمی۔ جو جال سمیٹ رہا ہے۔ کیونکہ وہ اپنا رزق لے چکا ہے۔ وہ دور پس منظر میں اس لیے ہے کہ زندگی کے سارے حسن، تحفظ، رزق، صحت اور سلامتی کا دارومدار اُس مرد پر ہے، جو سامنے آئے بغیر تمام رعنائیوں اور برکتوں کا سبب ہے۔ خیر تمھیں اس بات کا کوئی احساس نہیں ہوسکتا۔ ۔وہ چہکتے ہوئے بولی۔

وہ جو مرد ہے۔ دور۔۔ وہ طنز سے بولا، وہ جال بچھا رہا ہے۔ کہ جال سمیٹ رہا ہے۔ اور اس کا چہرہ ایسا نہیں ہے جیسا کہ اس کی بیوی اور بچوں کا ہے۔

وہ بے اختیار قہقہے لگا کے کبھی تصویر اور کبھی اپنے خوشحال اور صحت مند شوہر کو دیکھنے لگی۔ جو افسری کے ہر پہلو اور تجربے سے پوری طرح روشناس تھا۔ شوہر کی ندامت کو محسوس کرتے ہوئے وہ شائستگی سے بولی۔ ”وہ جال سمیٹ رہا ہے۔ اسکی کہنیاں اندر کی طرف مڑی ہوئی ہیں۔ اور کندھے کسے ہوئے ہیں۔ جال بکھیرتے ہوئے بازو کھل جاتے ہیں۔ کندھے پھیل جاتے ہیں۔ وہ جال سمیٹ رہا ہے۔ اس قناعت کے ساتھ۔ کہ اس کے دن کا رزق اُسے مل چکا ہے۔ اب وہ کشتی میں بیٹھ کر اس کنارے پر آئے گا۔ اور اسی پگڈنڈی پر چلتا ہوا، اپنی بیوی اور بچی کے پیچھے پیچھے گھر لوٹ آئے گا۔ وہ نمایاں نہیں ہے۔

کیونکہ وہ ایک بڑا سبب اور وسیلہ ہے۔
مجھے تو ایسا لگتا ہے۔ جیسے یہ تصویر تم نے بنائی ہے۔ شوہر نے حیران و پریشان ہوتے ہوئے لمبی سانس لے کر کہا۔
میں سوچتی ہوں کہ اگر میں اس قسم کے ماحول میں چلی جاؤں۔ تو امارت، بناوٹ اور معاشرتی مرتبے کے بوجھ سے اس طرح نکل جاؤں گی۔ جیسے کوئی پرندہ۔ پنجرے کے حبس سے نکل کے اُڑ جاتا ہے۔ ویسے اگر ہم۔ یعنی۔ میں۔ تم اور ہمارے بچے اس قسم کی جگہ پر چلے جائیں۔ تو کیا تماشہ ہو۔ بالکل برفانی ریچھ۔ نظر آئیں۔ اور ہر شے تہس نہس ہوتی دکھائی دے گی۔۔ میں تو کہتی ہوں کہ تم نے گھر کے دروازے پر خانزادہ ہاؤس کی جو تختی لگا رکھی ہے اُسے پانڈہ ہاؤس میں تبدیل کر دو، وہ خود ہی قہقہہ لگا کر کھل سی گئی۔
بس کرو یار۔ افسر جھنجلا کر بولا تم نے تو حد ہی کر دی۔ تصویر نہ ہوئی۔ قیامت ہوگئی۔
میں اس تصویر میں ڈوب جاتی ہوں۔ جان من۔ وہ پیار اور سپردگی سے بولی۔ میں کبھی بھی ایسا شاہکار نہیں بنا سکتی۔ مجھے لگتا ہے۔ میں کسی روز اس تصویر کو اپنے سینے سے لگا کر چھت پر چڑھ جاؤں گی۔ اور ہوا میں کود جاؤں گی۔ اس اُمید کے ساتھ۔ کہ یہ مجھے لے ''اُڑے گی''۔
وہ گھبرا کے اُسے یوں دیکھنے لگا۔ جیسے وہ اُسے دھمکیاں دے رہی ہے۔ پھر اپنا موڈ بحال کرتے ہوئے بولا، دیکھو کیپٹن صاحب اصلی والی بوتل تحفے میں دے گئے ہیں۔ ایک دو گھونٹ پیو گی۔ تو مستی اور لطافت میں سب کچھ بھول جاؤ گی۔ وہ شرارت سے بولا، اس وقت دن کے بارہ بج رہے ہیں لوگ ہانپتے ہوئے نوکریوں اور مزدوریوں میں لگے ہوں گے۔ درجہ حرارت پینتالیس ڈگری ہے۔ آگے پچاس تک جائے گا۔ ایک دم ٹھنڈے کمرے سے باہر نہ نکل جانا تمہارے لئے خطرناک ہے۔ چلو تیار ہو جاؤ۔ آؤ ہم اپنی بہشت جگائیں۔ وہ سپردگی کی خواہش میں لرزتا ہوا الماری کی طرف بڑھا۔
اُسے جب ہوش آیا۔ تو اس کی بیوی زیتون۔ جسے وہ پیار سے زیتی کہتا تھا۔ آنکھ بند کئے۔ سکون سے سوئی ہوئی تھی۔ اپنی جسمانی صحت مردانہ وجاہت اور کارگردگی کے احساس نے اس کے چہرے پہ فاتحانہ مسکراہٹ بکھیر دی۔ اس نے اپنی قمیض پہنتے ہوئے اچانک اپنے سامنے تصویر کی طرف دیکھا۔ غصے اور کینے سے اس کے منہ سے ایک غراہٹ سے نکلی۔ تیری ماں کی۔۔۔'' سنبھلتے ہوئے آگے بڑھ کر اس نے احتیاط سے تین فٹ چوڑے اور چار فٹ لمبے فریم کو اتارا۔ زمین پر رکھتے ہوئے اس نے چوروں کی طرح اپنی سوئی ہوئی زیتی کی طرف دیکھا۔ دروازہ کھول کر اس نے کوریڈور میں جھانکا۔ کچن کوریڈور کے بائیں جانب تھا۔ کمرے کے مقابلے میں باہر حبس اور گرمی کی شدت اس نے محسوس کر لی تھی۔ لیکن وہ تصویر اُٹھائے کچن کی طرف بڑھا۔ چلتے ہوئے اس کے بدن اور اعصاب پر شراب کا سرور اور مردانہ غرور طاری تھا۔ اس کے چہرے سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کوئی بہت بڑا کام سرانجام

دینے والا ہے۔ اس نے کچن کا دروازہ بہت مشکل سے کھولا۔ بڑے سے چولہے پہ اس نے فریم کا ایک کونا جما دیا۔ پھر اس نے گیس کھول کر ہلکا سا نیلا شعلہ بھڑکایا۔ چولہے کو جلتا چھوڑ کر اس نے دوبارہ کچن کا دروازہ بند کرتے ہوئے زور سے گالی دی۔۔۔ ''بہن۔۔۔''

کوریڈور کے درجہ حرارت اور حبس کی وجہ سے اُسے پسینہ آگیا۔ اور وہ ہانپنے لگا۔ اپنی خواب گاہ میں داخل ہو کر وہ سرد ہونے کی خواہش میں کھڑا رہا۔ پھر اس نے دوبارہ بوتل کھولی۔ دو گھونٹ چڑھائے زینی سے دور لیٹ کر۔ آئندہ کی منصوبہ بندی کرتے کرتے اسے نیند آگئی۔ موبائل فون کی گھنٹی بجی تو افسر کی آنکھ کھلی۔ اس نے چونک کر اپنے پہلو میں زینی کی طرف دیکھا۔ وہ بستر پر موجود نہیں تھی۔ اس نے بے پروائی سے موبائل فون پر بات کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں لکھ دو کہ میں نے بستی نمبر ۴ اور بستی نمبر ۹ کا دورہ کر لیا ہے۔ گرمی میں یہ فاصلہ جو تقریباً 25 کلومیٹر بنتا ہے۔ بہت مشکل ہے۔ میں کل دستخط کر دوں گا۔۔۔''

فون بند کر کے وہ دوبارہ زینی کے خالی بستر کو دیکھنے لگا۔ یکا یک وہ لڑکھڑاتے ہوئے اٹھا۔ وہ کچن کی طرف بھاگتے ہوئے دیوار سے جا ٹکرایا۔ کچن کا دروازہ کھلا تھا۔ سیاہ اور زہریلا دھواں کچن سے نکل کر کوریڈور میں پھیل رہا تھا۔ دھوئیں کے اندر سے کہیں کہیں سرخ آگ کی ایک لہر اٹھ کر چھت کو چھوئے جا رہی تھی۔ افسر کچن کے دروازے پر کھڑے کھڑے پیچھے پیچھے مڑ کے دیکھے جا رہا تھا۔ کہیں زینی نہ آجائے۔ کیونکہ زہریلا دھواں اس کی سانسوں کے لیے خطرناک تھا۔ کھڑے کھڑے اس نے دھوئیں میں ایک گٹھڑی سی دیکھی۔ وہ ہمت کر کے اس کے قریب گیا۔ تلخ دھواں اس کے اندر اُتر گیا لیکن وہ زینی کو گھسیٹ کر باہر لے آیا اور چیختے ہوئے بولا زینی تم کچن میں کیوں آگئی۔ تمھارے لیے تو سرد کمرے سے باہر نکلنا بھی خطرناک تھا، وہ بے بس ہو کر بین کرنے لگا۔

اپنی مدد کے لیے اس نے لڑکوں کو آواز دی۔ لیکن ٹھنڈے سرد کمرے میں اس کے تینوں لڑکے باہر کی دنیا سے بے خبر تھے۔ ان کے دروازے گرم ہوا اور آواز کو روکے ہوئے سختی سے بند تھے۔ اس کی اپنی سانسیں رکتی جا رہی تھی لیکن وہ سسکتے ہوئے بولا ''زینی ہمت کرو میں ایمبولینس بلواتا ہوں۔ پھر وہ جھلسی ہوئی، ہانپتی ہوئی زینی کو فرش پر آرام سے لٹا کر اپنے کمرے کی طرف بھاگا تاکہ موبائل فون کے ذریعے ایمبولنس منگوا سکے۔ لیکن زینی نے اس کا پاؤں پکڑتے ہوئے روک لیا۔ اور کراہتے ہوئے کہا ''میں خوبصورت وادی سے نکل کر پولینڈ کے گیس چیمبر میں کیسے پہنچی۔ مجھے کس نے وہاں دھکیلا تھا۔'' افسر نے نرمی اور احتیاط سے اپنا پاؤں چھڑانے کی کوشش کی۔ لیکن اُسے زیادہ قوت نہیں لگانی پڑی۔ زینی کا ہاتھ خود ہی ڈھیلا ہو کر فرش پر گر پڑا۔

☆☆☆☆☆

گھر کی ملکہ

شام کی سنہری کرنیں آہستہ آہستہ شہر کی بلند عمارتوں کے عقب میں اتر رہی تھیں۔ ہلکی ہلکی ہوا صحن میں لگے چنبیلی کے پودوں کو چھو کر یوں گزر رہی تھی جیسے کسی محبت بھرے راز کی سرگوشی کر رہی ہو۔ دروازہ کھلا تو عبداللہ ہمیشہ کی طرح مسکراتے ہوئے اندر داخل ہوا۔

''سمیرا... کہاں ہو میری ملکہ؟''

یہ اس کا روز کا انداز تھا۔ وہ کبھی اپنی بیوی کو نام سے نہیں پکارتا تھا۔ کبھی ''ملکہ'' کہتا، کبھی ''میری جان''، کبھی ''میرے گھر کی رونق''۔

چند لمحوں بعد سمیرا ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سامنے آئی۔

''آ گئے آپ؟''

عبداللہ نے شرارت سے کہا:

''آ گیا ہوں... مگر پہلے وہ مسکراہٹ تو دو جس کے لیے سارا دن دفتر میں انتظار کرتا ہوں۔''

سمیرا نے مصنوعی ناراضی ظاہر کی۔

''آپ بھی ناں... بچے بڑے ہو رہے ہیں۔''

عبداللہ ہنس پڑا۔

''میرے لیے تو تم آج بھی وہی نئی نویلی دلہن ہو جسے پہلی بار سرخ جوڑے میں دیکھا تھا۔''

سمیرا کے رخسار گلاب کی مانند سرخ ہو گئے۔

ان دونوں کی شادی کو دس برس گزر چکے تھے، مگر محبت کی خوشبو ابھی تک پہلی بارش کی مٹی جیسی تازہ تھی۔ عبداللہ کی پوری کوشش ہوتی کہ سمیرا کی زبان سے خواہش نکلنے سے پہلے وہ پوری کر دے۔ کبھی چوڑیاں، کبھی عطر، کبھی پسندیدہ کتاب، کبھی اچانک آئس کریم، کبھی بغیر کسی موقع کے پھولوں کا گلدستہ۔۔

وہ اکثر کہتا تھا:

''عورت کو صرف روٹی نہیں، عزت اور محبت بھی کھلائی جائے تو گھر جنت بن جاتا ہے۔''

سمیرا ہنس کر جواب دیتی:

''اور شوہر کو؟''

عبداللہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر کہتا:

''شوہر کو صرف ایک چیز چاہیے...''

''وہ کیا؟''

''بیوی کی مسکراہٹ...''

عامر عباس ناصر اعوان

سمیرا شرما کر اس کے کندھے پر ہلکا سا مکا مارتی۔
گھر میں خوشیوں کا موسم رہتا تھا۔
لیکن وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا۔
مہنگائی نے جیسے ہر دروازے پر دستک دے دی۔ اخراجات بڑھنے لگے۔ بچوں کی تعلیم، کرایہ، بجلی، گیس....
ایک رات سمیرا نے کہا:
''عبداللہ... میں بھی نوکری کرنا چاہتی ہوں۔''
عبداللہ نے نرمی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
''اگر مجبوری نہ ہو تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔''
''کیوں؟''
''اس لیے کہ میں نے تمھیں ہمیشہ اپنے گھر کی ملکہ سمجھا ہے۔''
سمیرا نے محبت سے جواب دیا:
''اور ملکہ اگر بادشاہ کا ہاتھ بٹا دے تو اس کی شان کم نہیں ہوتی۔''
عبداللہ خاموش ہو گیا۔
کچھ دن بعد سمیرا کو ایک نجی بینک میں سکیورٹی گارڈ کی ملازمت مل گئی۔
پہلے دن جب وہ خاکی وردی پہن کر آئی تو عبداللہ دیر تک اسے دیکھتا رہا۔
سمیرا نے پوچھا:
''کیسی لگ رہی ہوں؟''
عبداللہ نے زبردستی مسکرا کر کہا:
''بہت اچھی...''
مگر دل کے اندر کہیں ایک کسک جاگ اٹھی۔
وہ وردی سے نفرت نہیں کرتا تھا، محنت سے بھی نہیں، مگر اس کی آنکھوں کے سامنے وہی لڑکی گھوم رہی تھی جسے وہ ہمیشہ ریشمی لباس اور خوشبوؤں میں دیکھنے کا عادی تھا۔

دن گزرتے گئے۔
شروع شروع میں سمیرا ہنستی کھیلتی گھر لوٹتی، مگر پھر اس کے لہجے میں تلخی آنے لگی۔
وہ تھکی ہوئی آتی، بچوں کی باتوں پر جھنجھلا جاتی، عبداللہ کی محبت بھرے جملوں کا جواب بھی مختصر سا دیتی۔
ایک رات عبداللہ نے اس کے لیے چائے بنائی۔
کپ سامنے رکھتے ہوئے بولا:
''آج میں اپنی ملکہ کے لیے چائے بنا لایا ہوں۔''
سمیرا نے بے دلی سے کہا:
''رہنے دیتے... مجھے خود بنا لینی تھی۔''
عبداللہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔
یہ وہ سمیرا نہیں تھی جس کی آنکھیں کبھی اس کی چھوٹی سی توجہ پر بھی چمک اٹھتی تھیں۔
چند ہفتوں بعد عبداللہ کسی کام سے بینک گیا۔
وہ خاموشی سے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔
اس نے دیکھا، ایک ملازمہ بولی:
''سمیرا! ذرا تین کپ چائے لے آنا۔''
کچھ دیر بعد دوسری آواز آئی۔
''یہ فائل اوپر دے آؤ۔''
پھر کسی نے کہا:
''کچن صاف بھی کر دینا۔''
عبداللہ کے دل پر جیسے کسی نے خنجر رکھ دیا۔
سمیرا نے اسے دیکھا تو چونک گئی۔
''آپ یہاں؟''
''ہاں... ایک کام تھا۔''
واپسی پر گاڑی میں دونوں خاموش تھے۔
کافی دیر بعد عبداللہ بولا:
''تمھیں یہ سب کرتے دیکھ کر دل دکھا۔''

سمیرا نے فوراً جواب دیا:
"محنت کرنے میں کیا برائی ہے؟"
"برائی محنت میں نہیں... تمھارے چہرے سے مسکراہٹ چھن جانے میں ہے۔"
سمیرا نے کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔
وقت کے ساتھ ساتھ ان کے درمیان فاصلے بڑھنے لگے۔
گھر میں وہ ہنسی، وہ شرارت، وہ محبت جیسے کہیں کھو گئی۔
ایک دن بچوں کی معمولی شرارت پر سمیرا چیخ اٹھی۔
عبداللہ نے نرمی سے کہا:
"بچے ہیں، پیار سے سمجھاؤ۔"
سمیرا بولی:
"آپ کو کیا پتا، سارا دن کام کر کے آؤ تو کیسا لگتا ہے۔"
عبداللہ خاموش ہو گیا۔
اسے احساس تھا کہ سمیرا واقعی تھک جاتی ہے، مگر اسے یہ بھی محسوس ہونے لگا تھا کہ ملازمت کی تھکن اس کے اخلاق پر غالب آ رہی ہے۔
پھر وہ دن آیا جس نے سب کچھ بدل دیا۔
کسی بات پر بحث ہوئی تو سمیرا غصے میں بول اٹھی:
"تمھاری ماں اور بہن نے مجھ پر تعویذ کروا رکھے ہیں، اسی لیے ہمارے گھر میں برکت نہیں۔"
یہ سن کر عبداللہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔
اس نے آہستہ مگر مضبوط لہجے میں کہا:
"سمیرا! یہ بہت بڑا الزام ہے۔"
"مجھے یقین ہے۔"
"یقین دلیل نہیں ہوتا۔"
سمیرا خاموش نہ ہوئی۔
عبداللہ نے فوراً اپنی والدہ کو فون کیا۔
سپیکر آن کر دیا۔
"اماں! ایک بات پوچھنی ہے۔"
"ہاں بیٹا، خیریت؟"
"کیا آپ نے کبھی سمیرا پر کوئی تعویذ کرایا؟"
اچانک دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔
پھر روتی ہوئی آواز آئی۔
"عبداللہ! خدا کی قسم، میں تو ہر نماز میں تم دونوں کی خوشیوں کی دعا کرتی ہوں۔ وہ میری بہو نہیں، میری بیٹی ہے۔ میں کیوں اس کا گھر برباد چاہوں گی؟"
یہ الفاظ سن کر سمیرا کے قدم جیسے زمین میں گڑ گئے۔
اسے لگا کسی نے اس کے غرور کا آئینہ توڑ دیا ہو۔
اسی لمحے اس کا موبائل بج اٹھا۔
بینک سے کال تھی۔
"سمیرا، آپ لنچ بریک کے بعد واپس کیوں نہیں آئیں؟"
سمیرا نے نم آنکھوں سے عبداللہ کو دیکھا۔
اس کے سامنے ایک طرف بینک کی عمارت، وردی، تھکن، تلخی اور بدلتا ہوا مزاج تھا، اور دوسری طرف یہی شخص تھا جو آج بھی اسے "ملکہ" کہہ کر پکارتا تھا۔
اس نے آہستہ سے جواب دیا:

"سر... میں استعفیٰ دے رہی ہوں۔"
"کیا؟"
"جی... میں اب واپس نہیں آؤں گی۔"
کال ختم ہوگئی۔
کمرے میں خاموشی چھا گئی۔
سمیرا آہستہ آہستہ عبداللہ کے قریب آئی۔
اس کی آواز آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔
"عبداللہ... مجھے معاف کردو۔"
عبداللہ نے اس کی طرف دیکھا۔
"مجھے تمہاری نوکری سے کبھی نفرت نہیں تھی۔ مجھے اس تبدیلی سے ڈر لگتا تھا جو تمہارے اندر آرہی تھی۔"
سمیرا پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔
"میں ہر روز دوسروں کے حکم سنتی رہی، ہر روز ذہنی دباؤ برداشت کرتی رہی، اور وہ سارا غصہ اپنے گھر لے آتی تھی۔ مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ جس شخص نے کبھی میری آنکھ میں آنسو نہیں آنے دیا، میں اسی کے دل پر زخم لگانے لگی ہوں۔"
عبداللہ نے آگے بڑھ کر اس کے آنسو پونچھ دیے۔
"زندگی میں غلطی سب سے ہوتی ہے، مگر اصل بہادری اسے مان لینے میں ہے۔"
سمیرا نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
"آج وعدہ کرتی ہوں کہ اس گھر کی رونق پھر لوٹا کر لاؤں گی۔"
عبداللہ مسکرایا۔
"مجھے تمہاری تنخواہ نہیں چاہیے، مجھے میری وہی ہنستی ہوئی سمیرا واپس چاہیے۔"

اسی وقت دونوں بچے دوڑتے ہوئے آئے اور ماں باپ سے لپٹ گئے۔
سمیرا نے بچوں کو سینے سے لگا لیا۔
اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے مگر یہ پچھتاوے کے نہیں، سکون کے آنسو تھے۔
رات کو عبداللہ حسبِ معمول دو کپ چائے بنا کر لایا۔
"ملکہ سلامت! آپ کی چائے حاضر ہے۔"
سمیرا ہنس پڑی۔
"اب بھی ملکہ؟"
عبداللہ نے محبت سے کہا:
"تم نوکری کرو یا نہ کرو، میرے لیے تم ہمیشہ میرے گھر کی ملکہ رہوگی۔"
سمیرا نے شرماتے ہوئے اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ دیا۔
"اور آپ...؟"
"میں؟"
"آپ صرف میرے شوہر نہیں... میرے سب سے اچھے دوست بھی ہیں۔"
چاندنی کھڑکی سے اندر اتر رہی تھی۔
ہوا میں چنبیلی کی خوشبو گھلی ہوئی تھی۔
ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے محبت نے ایک بار پھر اس گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا ہو۔
اس رات نہ کسی نے جیت کا جشن منایا، نہ ہار کا ماتم۔
جیت صرف محبت کی ہوئی، اعتماد کی ہوئی، معافی کی ہوئی۔
اور یہی ہر آباد گھر کی اصل بنیاد ہے۔

☆☆☆☆☆

عکس، خیال اور آئینہ (نثری اوف)

آئینے نے اپنی آنکھیں پھوڑ لیں تو عکس نے جست لگا کر خیال کی گود میں پناہ لی ----
سب کچھ اس قدر جلدی ہوا کہ عکس ششدر رہ گیا، خیال پکارا یہ کون سی صدی کا بہاؤ ہے کہ لمحوں نے اپنی تمام تر کرچیاں چن کر آئینے کی آنکھیں پھوڑ ڈالیں______!

میں نہ ہوتا تو تمھاری آنکھیں بھی پھوٹ جاتیں!!!

عکس نے کہا! خاموش رہو!!

تم سب نے دیکھا نہیں وہ جو غائب تھا اس نے کیسے رجز پڑھتے ہوئے آئینے پر دھاوا بول دیا میں وہاں تھا، اسی میدان جنگ میں جب میری گردن کٹی- اس سے پہلے میں نے اپنی کروڑوں خواہشوں کے گلے کاٹے اور کتنی شریر آتماؤں کو آگ میں دھکیل دیا وہ دیکھا پر آوازوں کا دیوتا تھا جو اپنے بدن کو ہنڈی بنا کر خود پر ظلم کر رہا تھا وہ ایسا ہولناک منظر تھا جسے دیکھ کر آئینے نے اعلانِ جنگ کا طبل بجا دیا اور زیوس Zeus کو پکارا..... جیسے پھر دیکھتے ہی دیکھتے شش جہات نے اپنے اپنے سورماؤں کو میدان میں اتارا---

کیا تم نے نہیں دیکھا جب اچانک سمندروں کا دیوتا پوزائیڈن Poseidon وہاں نمودار ہوا اور پلک جھپکتے اپنے ترشول یعنی trident کے ایک ہی وار سے کائنات میں دراڑ ڈال دی یوں زیوس سمجھا اسے مدد کی کمک آ پہنچی ہے مگر ایسا ہرگز نہیں تھا۔

مگر یہ کیا!!!

ترشول کے مقابل میڈوسا بھی اسے جنگ کا حصہ تھی--

عکس نے چیختے ہوئے کہا!!!

ہاں ہاں Medusa وہیں تھی میں نے خود اسے ترشول کے وار کا جواب دیتے ہوئے دیکھا تھا، اس کا کئی سانپوں والا سر میدان جنگ میں دہشت کی علامت تھا، اگر پرسیوس وقت پر اس کا سر نہ کاٹتا تو تمام سپاہ اسے دیکھ کر پتھر کی بن چکی ہوتی--- وہ آوازیں جو لڑ رہی تھیں وہ یہی تو کہہ رہی تھیں۔

''اپنی آنکھیں بند رکھ کر لڑو اور میڈوسا کی جانب مت دیکھنا کہ پتھر کہ ہو جاؤ گے'' جن جن لشکریوں تک ان آوازوں کا پیغام نہ پہنچا وہ سب میڈوسا کو دیکھتے ہی پتھر کی ہو گئیں---

لیکن یہ کیا Cerburus کے آتے ہی---- ہرکولیس کی چیخ آئینے میں نمودار ہوئی اور سارا منظر چکنا چور ہو گیا--!

خیال نے مسکراتے ہوئے پھر سے جڑ چکے آئینے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے عکس کو کہا--

سب تیار ہو جاؤ وہ دیکھو!!!

ٹروجن ہارس دور سے آتا دکھائی دے رہا ہے---

شاید جس کا سوار اوڈیسیئس Odysseus ہے!

عکس چونکا---

یعنی ابھی تو جنگ شروع ہوئی ہے---!!!

سید تحسین گیلانی

امید کا پودا

تبسم کا دل آج کل منھ زور آندھیوں کی زد میں آیا ہوا تھا۔ اس کے دل کا ایوانوں میں براجمان اس کی متاع جاوداں، اس کی روحانی فرحت، اس کی سانسوں کی مہک، عزیز از جاں اس کا شوہر اس سے بے اعتنائی برتنا شروع ہو گیا تھا۔ شروعات میں اس نے بھی اپنے شوہر شکیل کی بے اعتنائی کو در خور اعتنا نہیں گردانا۔ لیکن وقت کے بے رحم تھپیڑوں نے اس کے وجود پر جب نشتر زنی کی تو آزار اس کی روح تک چھید گئے۔

اس نے اپنی زندگی اپنے شوہر کے نام وقف کر رکھی تھی۔ وہ ہر آن، ہر دم، ہر گھڑی اس پہ بے پناہ الفت نچھاور کرتی تھی۔

لیکن موسم کا اصول ہے کہ اگر بہار ہے تو وہ خزاں کا بھی پیش خیمہ بنتی ہے۔ اسی طرح ذرا سی منھ ماری ان کی بہاروں کی مہک دیتی زندگی میں خزاں بن کر اتری۔ شکیل اس دن تبسم کے رویے پر ششدر سا رہ گیا۔ اسے یقین نہیں آیا کہ تبسم جسے وہ اپنی روح کہتا تھا، وہ اسے ایسا آزار دے گی۔ جو اس کی مردانہ انا کو انگڑائیاں لے کر بیدار ہونے پر مجبور کر دے گی۔

تبسم اسے ٹی وی پر نشر ہونے والے ڈراموں کے باعث طعنے مار بیٹھی۔

اس دن تبسم نے خوب جی بھر کر شکیل پر بھڑاس نکالی۔ اسے غریب، بھکاریوں سے بدتر کہا۔ کیوں کہ وہ ابھی تک گھر کی حالت میں سدھار نہیں لا پایا۔ نئے کپڑوں کا رونا رویا۔ نت نئے کھانے نہ کھلانے اور باہر سیر و تفریح کے لیے نہ لے جانے پر خوب طعنے دیے۔

حالانکہ شکیل اپنی بساط سے بڑھ کر تبسم کے کھانے، پینے اور دیگر اخراجات کا خیال رکھتا تھا۔

لیکن تبسم ٹی وی ڈراموں اور معاشرے کے نام نہاد سوشل میڈیا انفلوئنسرز کے زیر اثر آئی ہوئی تھی۔ وہی سب اس نے شکیل کے منڈھے مڑھ دیا۔ شکیل کی حالت تو ایسی ہو گئی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ وہ کچھ نہیں بولا لیکن اس نے تین سے چار ماہ میں گھر کا نقشہ بدل ڈالا۔ جو کچھ تبسم کہتی سب کر ڈالا۔ اس کے نام کا اکاؤنٹ کھلوا کر اس میں تین لاکھ روپے جمع کروا دیے۔

تبسم کا سب من چاہا ہو گیا لیکن اب وہ شکیل کو ڈھونڈتی لیکن اب شکیل اسے کہاں ملتا۔ وہ تو اپنے ہاتھوں سے شکیل کو ماضی میں کہیں زندہ درگور کر آئی تھی۔ اب جیسے گنجا لمبے ناخنوں سے سر نوچتا ہے ویسے تبسم ماضی میں زندہ درگور کیے شکیل کی قبر ادھیڑتی لیکن وہ شکیل تو کب کا مٹی میں مل چکا تھا۔

بابر امین ابر

اب تو بس پتھر کا شکیل تھا جو نہ اس سے بات کرتا، نہ اس کی بات پر ہنستا، نہ اس سے شرارتیں کرتا۔

شکیل کو تبسم کے بالوں کی سامنے والی لٹ بہت بھاتی تھی۔ وہ ہر وقت اس لٹ سے شرارت کرتا رہتا تھا لیکن اب جیسے سب کہیں دب گیا تھا۔

اس نے ہر ممکن کوشش کر ڈالی لیکن شکیل اب ٹس سے مس نہیں ہوا۔

"تمھیں جو چاہیے تھا۔ تبسم بیگم! میں نے وہ سب تمھیں دے دیا ہے۔ اب تم خوش رہو۔ عیش و عشرت میں مشغول رہو۔ اگر کچھ ضرورت ہو یا کم پڑے تو مجھے بتانا میں سب دوبارہ لا دوں گا۔ لیکن وہ دل پھر سے کہاں سے لاؤں گا جسے تم نے اپنے ہاتھوں سے کاٹ کاٹ کر ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے۔"

شکیل کا سرد لہجہ اور ٹھنڈے الفاظ تبسم کو یوں محسوس ہوئے جیسے کسی نے پگھلا ہوا سیسہ اس کے کانوں میں انڈیل دیا ہو۔ بے بسی کے آنسو اس کے رخساروں کی حدت میں اضافہ کر گئے۔ اس نے شکیل کے پاؤں بھی پکڑے لیکن بات نہ بنی۔

ان کے گھر کا باغیچہ خالی خالی سا تھا۔ آج تبسم نے ہمت کر کے شکیل کو مخاطب کیا۔

"سنیے! ایک کام کریں گے؟" تبسم نے پوچھا تو شکیل سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنا شروع ہو گیا۔

"اپنے باغیچے میں کوئی اچھا اور پھول دار درخت یا پودا ہی لگا دیں۔" تبسم کے لہجے میں اس قدر بے بسی اور لاچارگی تھی کہ ایک لمحے کے لیے شکیل ڈول گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک بے نام تاثر ابھرا لیکن فوراً سے پہلے معدوم ہو گیا۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پھر شکیل خاصا بڑا سدا بہار اور گلابی پھولوں والا پودا لے آیا۔

اس نے باغیچے میں گڑھا کھودنا شروع کر دیا۔ تبسم اسے گڑھا کھودتا دیکھ رہی تھی کہ اچانک چونک اٹھی۔

اس نے دیکھا کہ ایک کونے سے سیاہ رنگ کا بہت بڑا اور موٹا سیاہ ناگ نکلتا دیکھا۔ سیاہ ناگ سیدھا شکیل کی جانب بڑھا۔ شکیل اپنے کام میں محو تھا۔ تبسم گھبرا گئی اور چیختی ہوئی شکیل کی جانب بھاگی۔ اس کی چیخ کی آواز پر شکیل چونکا۔ لیکن دیر ہو چکی تھی۔ ناگ اس پر حملہ آور ہو چکا تھا مگر اس دوران ناگ اور شکیل کے درمیان تبسم آ گئی۔ ناگ نے ڈنک مارا لیکن تبسم کی شاید شوہر کے لیے قربانی کہیے یا خوش قسمتی ناگ کے دانت تبسم کی شلوار کے کپڑے میں پھنس گئے۔

اسی لمحے شکیل بجلی کی سی تیزی سے لپکا اور اس نے سانپ کو اس کی سری نے دبوچ کر اس کا دم گھوٹ دیا۔ ناگ اس کے بازو سے لپٹ گیا لیکن شکیل نے گرفت نرم نہیں کی۔ جونہی سانپ کا جسم قدرے ڈھیلا پڑا۔ اس نے قینچی کی مدد سے تبسم کی شلوار کا پائنچے کے قریب اتنا کپڑا ہی کاٹ دیا۔ پھر سانپ کو

زمین پر پھینک کر اس پر پولیس والوں کی مانند خوب لاٹھی چارج کیا۔ پھر وہ اسے دور زمین میں دبا آیا۔ تبسم وہیں زمین پر شاک کی سی کیفیت میں بیٹھی ہوئی تھی۔

''تم پاگل ہو۔ تمھارا ذہنی توازن درست نہیں کیا؟ تمھیں تارزن بننے کی کیا ضرورت تھی؟ مجھے آواز دے دیتی۔'' شکیل نے قدرے غصے سے کہا۔ تبسم کو کھونے کا احساس اس کا بند خول اچ تڑ خا گیا۔

''تو مرنے دیتے مجھے۔ میں ایسی زندگی کا کیا کروں۔ جس میں آپ نہیں ہیں۔ میں آپ کی تلاش میں تپتے صحرا میں آبلہ پا ہو رہی ہوں اور آپ ہیں کہ مجھے مل نہیں رہے ہیں۔'' تبسم کچھ ہذیانی سی ہوگئی۔

''تم نے جو چاہا، میں نے سب کیا۔ اب بھی میں تمھاری بات ہی پوری کر رہا تھا۔'' شکیل بولا۔

''آپ! آپ سمجھنے کی کوشش کریں۔ آپ میری زندگی کی قوسِ قزح ہیں۔ میں آپ کے بغیر پھیکی ہوں۔'' تبسم شکیل کا گریبان پکڑ کر اس کے سینے سے لگتی ہوئی رو رہی تھی۔ اس کے آنسو شکیل کے سینے پہ جمی برف پگھلانے جا رہے تھے۔ اس نے تبسم کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا۔

''مجھے معاف کردیں۔ میں ٹی وی ڈراموں اور وی لاگز دیکھ دیکھ کر ناحق آپ کو تنگ کرتی رہی۔ مجھے معاف کر دیں۔ میں کیا کروں گی اس ساز و سامان اور عیش و عشرت کا جس میں مجھے آپ کا ساتھ نصیب نہ ہو۔'' تبسم پانی میں گھلتے نمک کی مانند ہو رہی تھی۔

''اچھا! چلو چھوڑو یہ سب۔ رونا دھونا بند کرو۔ تمھیں سمجھنا چاہیے کہ وہ سب مصنوعی ہوتا ہے۔ روپے پیسے کی ریل پیل اور چمک دمک سب عارضی ہے۔ صرف ایک دوسرے کا ساتھ پائیدار ہوتا ہے۔ آؤ! دونوں مل کر اس امید پہ یہ پودا لگاتے ہیں کہ یہ ہمارے لیے خوش بختی کا ضامن ثابت ہوگا۔'' شکیل تبسم کا سر تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ تبسم کو اس کے لہجے میں وہی پہلے والی ترنگ محسوس ہوئی۔

''آپ سچ کہہ رہے ہیں؟'' تبسم نے آنسوؤں سے لبریز آنکھیں اس کی جانب اٹھا کر پوچھا۔

''ہاں! تم خود ہی تو کہتی ہو کہ میں تمھاری زندگی کی قوسِ قزح ہوں۔ پھر میں تمھارے رنگ کیسے پھیکے پڑنے دے سکتا ہوں۔'' شکیل نے مسکراتے ہوئے اس کے بالوں کی لٹ سے شرارت کرتے ہوئے کہا تو واقعی تبسم کے چہرے پر قوسِ قزح کے رنگ بکھرتے چلے گئے۔

پھر دونوں نے اپنے اچھے مستقبل کی امید کا پودا لگانا شروع کردیا۔ یہی وہ محرک تھا، جس نے تبسم کی زندگی کی قوسِ قزح اسے واپس دلادی تھی۔

دونوں ایک دوسرے سے اٹکھیلیاں کرتے امید کا پودا لگانے میں مصروف تھے جبکہ پودے کے گلابی پھول انھیں دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

☆☆☆☆☆

زہریلی پناہ

ہیرا منڈی کی تنگ اور بل کھاتی گلیاں کسی بوڑھی عورت کی ہتھیلی کی لکیروں کی طرح گہری اور الجھی ہوئی ہیں اور ہر لکیر میں ایک ان کہی کہانی دفن ہے۔ دو دن پہلے یہاں بارش خوب جم کر برسی تھی۔ پھر اینٹوں کی درزوں میں اور دیواروں کی روح میں کہیں چھپ گئی۔ اس بازار کی ایک گلی میں چاچا برکت اپنے چائے کے کھوکھے پر بیٹھا نظر آتا۔ شروع کے دنوں میں اسے کھوکھا کہنا بھی شاید ٹھیک نہ ہو۔ چار بانسوں پر ٹین کی چھت ٹکی تھی کہ جس کے کونے زنگ سے کھائے گئے تھے۔ ایک طرف چولہے پر کالے تانبے کی پتیلی اور سامنے دو بنچ پڑے ہوتے۔ وقت گزرتا گیا اور اس کا کھوکھا پھیلتا گیا۔ اب کھوکھے کے ایک طرف اس کی چارپائی بھی پڑی تھی۔ وہ پچھلے تیس برس سے یہاں بیٹھا تھا۔ کچھ لوگ اسے پاگل کہتے اور کچھ مجبور سمجھتے تھے مگر جو اسے جانتے تھے انہیں پتا تھا کہ یہ نہ یہ تھا نہ وہ۔

دسمبر کی ساکت ہواؤں میں حل ہوتی بارش نے جہاں شہر کو ٹھٹھرنے پر مجبور کیا وہاں چاچا برکت کو بھی گھیر لیا تھا۔ ان کا فولادی وجود جو کئی دہائیوں سے بدلتے موسموں کو انگوٹھا دکھاتا آیا تھا مگر اس بار بخار نے ایسا جکڑا کہ وہ چت ہو کر رہ گیا۔ دو دن سے وہ اپنے کھوکھے کے اندر ایک اونی میلی چادر میں لپٹا ہوا ڈھیلی چارپائی پر بے سدھ پڑا ہوا تھا۔ کھوکھے کے ایک کونے میں رکھا ہوا چولھا دو دن سے بے جان وجود بن گیا تھا۔ بستر کی بے بسی اور بخار کی غنودگی میں چاچا برکت کے ذہن پر لگے ماضی کے وہ قفل یکے بعد دیگرے ٹوٹنے لگے تھے جو انھوں نے کئی سالوں کی سخت محنت اور مصروفیات کی گرد میں چھپا رکھے تھے۔ چاچا برکت نے اپنے تکیے کے نیچے سے ایک تصویر نکالی جسے دیکھ کر یادوں کے طوفان نے بند دریچے یکدم کھول دیے۔ ان دریچوں میں سے گزرا ہوا زمانہ اپنے پورے جاہ و جلال اور سسکتی ہوئی حقیقتوں کے ساتھ برآمد ہونے لگا۔ باپ کے فوت ہونے کے بعد گھر میں بیوی آئی تو لگا کہ زندگی کا دھارا سیدھا ہو گیا ہے مگر وہ سیدھا پن محض ایک سال رہا۔ ایک صبح وہ اٹھا تو چارپائی خالی تھی۔ نہ چٹھی اور نہ کوئی نشانی۔ بس وہ غائب تھی۔ برکت درد بھلانے کے لیے اسی گلی

عمران امین

میں آیا۔ گلی کے رنگین اندھیروں میں چاند سی صائمہ ملی۔ برکت نے یقین کر لیا کہ وہ محبت ہے۔ پھر وہ دن بھی آیا جب ساری جائیداد بک گئی۔ ایک دن صائمہ چلمن کے پاس کھڑی تھی۔ برکت نے جب اپنے ہاتھوں سے اس کا آنچل چھونا چاہا تو صائمہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''صائمہ! میرا مکان، میرا کاروبار اور میری عزت----- سب بک گیا۔ اب میرے پاس تمھاری محبت کے سوا کچھ نہیں بچا۔'' برکت کی آواز میں التجا تھی۔

صائمہ نے اپنی سرمئی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ تب اس کے ہونٹوں پر ایک بے رحم مسکراہٹ ابھری۔

''برکت میاں!'' اس بار صائمہ کی آواز میں کوٹھے کی روایتی لچک کی جگہ بازارِ حسن کی حقیقت تھی۔ ''تم یہاں محبت خریدنے آئے ہی کب تھے؟ تم تو یہاں اپنی تنہائی کا سودا کرنے آئے تھے اور اس سودے کی قیمت تمھاری جیب میں موجود نوٹ تھے۔''

برکت کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے ''میں نے تمھیں دل دیا ہے صائمہ۔''

''دل؟'' صائمہ نے ایک گہرا سانس لیا اور کھڑکی سے باہر بازار کی طرف دیکھنے لگی جہاں روشنیاں جاگ رہی تھیں۔

''برکت میاں! طوائف کے گاہک کا دل اس کی جیب میں دھڑکتا ہے۔ جب تک وہ دھڑکتا رہا، صائمہ تمھاری باندی تھی۔''

''صائمہ! مجھے اس بازار میں تماشائی نہ بناؤ میں مر جاؤں گا۔'' برکت نے گڑگڑا کر کہا۔

صائمہ کے لہجے میں اب ایک آخری فیصلہ تھا۔

''انسان صرف بھوک سے مرتا ہے وہم سے نہیں۔ اب یہاں سے جاؤ۔ یہ حسن کی دکان ہے اور دکانیں تبھی کھلتی ہیں جب گاہک کی جیب میں سودا سلف لینے کی سکت ہو۔''

یہ کہہ کر صائمہ نے دروازہ زور سے بند کر دیا۔

بخار کی حالت میں صائمہ کی تصویر چاچا برکت کے سرہانے پڑی رہی۔ جونہی بارش تھمی اور موسم کھلا تو اس کا بخار بھی اتر گیا۔ مگر جو ماضی اس کے سینے میں اتر گیا تھا وہ نہیں گیا۔ چاچا برکت نے اپنے جھریوں والے سخت ہاتھ پھیلا کر دیکھے۔ ان میں کچھ تھا بھی یا نہیں یہ وہ خود بھی نہ جان سکا۔''

البتہ کھوکھا جوں کا توں کھڑا تھا۔ اس نے چولہا سلگایا اور کیتلی چڑھائی۔ کھوکھا پھر سے آباد ہو گیا۔

آج صبح الماس بائی کے کوٹھے کا منشی امیر علی گزرا تو اس نے چاچا برکت کو چائے کا اشارہ کیا اور بنچ پر بیٹھ گیا۔

''نیا مال آیا ہے'' اس نے رازداری سے بتایا جیسے موسم کی خبر دے رہا ہو۔

"تین دن سے کچھ کھایا نہیں - بڑی اڑیل ہے۔"

چاچا برکت نے پیالی آگے کی اور کچھ نہ بولا۔ مگر اندر کچھ ہلا۔

امیر علی نے بتایا کہ نئے مہمان کا نام 'ریشماں' ہے۔ چھوٹے شہر کی سادہ لڑکی کو الماس کے کارندے عرفان نے پہلے محبت کے جال میں پھنسایا اور پھر یہاں لایا۔

امیر علی نے خالی پیالی میز پر رکھی اور ایک لمحے کے لیے اس میں جھانکتا رہا جیسے اس کی تہہ میں کچھ دیکھنا چاہتا ہو۔

"برکت میاں!" اس نے دھیمی آواز میں کہا اور ادھر ادھر دیکھا جیسے کوئی سن نہ رہا ہو۔ "میں نے بھی ایک زمانے میں سوچا تھا کہ بس دو تین سال کام کروں گا۔ کچھ پیسے جمع ہوں گے تو گھر بساؤں گا۔" وہ رکا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر ایک کرخت مسکراہٹ آئی اور غائب ہو گئی۔ "اب بیس سال ہو گئے ہیں۔ بہی کھاتے لکھتے لکھتے میری اپنی کہانی ادھوری رہ گئی۔"

چاچا برکت نے اسے دیکھا مگر کچھ نہ کہا۔ بس چولہے کی آنچ تیز کر دی۔

رات کے پچھلے پہر اس نے روٹی باندھی۔ بس دو روٹیاں اور اچار۔

تیس سال میں اس گلی کا کونہ کونہ اس کے قدموں نے ناپا ہوا تھا اس لیے کوٹھے کے پچھواڑے والی کھڑکی تک پہنچنا اس کے لیے کوئی مشکل نہیں تھا۔ اس نے کھڑکی کی سلاخوں کے پار دیکھا۔ اندھیرے میں ایک سایہ دیوار سے لگا بیٹھا تھا گھٹنے سینے سے لگائے اور سر جھکائے۔

"لے" اس نے آہستہ سے کہا اور روٹی اندر سرکائی۔

سایہ نے کوئی حرکت نہ کی۔

"کھا لے بچے۔ بھوکے پیٹ لڑائی نہیں ہوتی۔"

ایک لمحہ خاموشی رہی پھر سایہ اپنی جگہ سے ہلا۔ اس کے کانپتے ہاتھوں نے روٹی اٹھائی اور آہستگی سے 'شکریہ' کہا۔

چاچا برکت واپس آیا اور خاموشی سے کھوکھے پر بیٹھ گیا۔

روز یہی گلی، روز یہی بازار اور روز ایک سی خبریں۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اسے ایسا لگا کہ جیسے آج اس نے بہت اچھا کام کیا ہے۔ لیکن پھر ہمیشہ والی سوچ گھیر لیتی کہ بس اتنا ہی یا اس سے آگے بھی کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔

'الماس منزل' کے اندر ایک کمرے میں ریشماں فرش پر بیٹھی تھی۔ ریشماں کے ہاتھ میں ایک دھاگہ تھا جو اس کی قمیص کے دامن سے ادھڑا تھا۔ وہ اسے انگلی پر لپیٹتی اور پھر کھول دیتی۔ لپیٹتی اور کھول دیتی۔ یوں لگتا

کے جیسے وہ اس کام میں خود کو مصروف رکھنا چاہتی ہو۔ ریشماں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں تو اندھیرے میں ماں کا محبتوں بھرا بوڑھا چہرہ ابھرا اور اس کے ساتھ ہی وہ آواز بھی جو کہتی تھی "بیٹی عرفان کی آنکھوں میں گاؤں کی مٹی نہیں ہے بلکہ شہر کی خاک ہے۔" ریشماں نے وہ دھاگہ اتنی زور سے کھینچا کہ ٹوٹ گیا۔

پھر شہر کی وہ پہلی رات یاد آئی۔ جب عرفان اسے ایک ایسے مکان میں لے گیا جہاں رنگین لیمپ جل رہے تھے اور ہوا میں عطر کی تیز بو تھی۔ وہ اسے الماس بائی کے کوٹھے پر بیچ گیا تھا۔ الماس بائی کے بتائے ہوئے سچ کا زہر ریشماں کے پورے وجود میں پھیل گیا۔ ریشماں کے اندر ایک چیخ ابھری لیکن حلق تک آتے آتے دم توڑ گئی۔

چاچا برکت ریشماں سے ملنے کے بعد بہت بے چینی محسوس کر رہا تھا اس نے چائے بنائی اور پینے لگا۔ چائے پیتے ہوئے جب گلی پر نظر دوڑائی تو اس نے دیکھا کہ گلی کے کوٹھے اپنے سینوں پر پھپھوندی کی سبزی مائل تہیں اوڑھے موجود تھے۔ ہاں البتہ اس کے بالکل سامنے "الماس منزل" میں پچھلے ماہ نیا رنگ و روغن ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ دوسروں سے مختلف اور بہتر نظر آ رہی تھی۔"

"الماس منزل" میں الماس بائی مسند سے ٹیک لگائے گڑگڑاتے ہوئے حقے کے دھوئیں میں اپنی ڈھلتی عمر کو تلاش کر رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا۔ وہ خود یہیں تھی مگر اس کا ذہن ستائیس سال پیچھے جا چکا تھا۔ دسمبر کی ایسی ہی سرد رات میں جب الماس بائی کی آنکھوں میں حیا کی لکیر باقی تھی۔ ایک وڈیرا آیا۔ اس نے جیب سے کرارے نوٹوں کی ایک موٹی گڈی نکال کر اس کے قدموں میں پھینک دی۔ "یہ ہے تمھاری حیا کی قیمت۔" وڈیرے کا وحشیانہ قہقہہ فضا میں گونجا۔ تب الماس کی آنکھیں سے ایک آنسو گال پر پھسلا اور پھر اس کی آنکھوں میں لرزتی وہ حیا کی آخری لکیر ہمیشہ کے لیے مٹ گئی۔" چائے الماس کے ہاتھ میں ابھی بھی تھی اس نے کپ ہونٹوں سے لگایا پھر رکھ دیا۔ چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ اچانک ------- اس کے پاس بیٹھے منشی امیر علی نے حقے کی نال منہ سے نکالی اور عینک کو ناک سے اتارتے ہوئے کہا "بائی جی! وہ نئی لڑکی --------

ریشماں۔ آج تیسرا دن ہے اس نے اناج کا ایک دانہ بھی حلق سے نیچے نہیں اتارا۔"

الماس بائی کے چہرے پر ایک زہریلی مسکراہٹ ابھری۔ اس نے حقے کا ایک لمبا کش لیا اور دھوئیں کا ایک غبار ہوا میں اچھالتے ہوئے بولی "ابھی بچی ہے منشی جی!

پریشان نہ ہوں۔ نئے پرندے پنجرے کی جالیوں سے سر ٹکراتے ہی ہیں۔ جب تک دیواروں پر لہو نہ بکھرے، انہیں یقین نہیں آتا کہ اڑان کے دن ختم ہو گئے ہیں۔''

پھر الماس کے لہجے میں ایک کاروباری سفاکی اتر آئی ''پرسوں رات اس کی نتھ اتارنے کی رسم کرنی ہے۔ اس بازار کا قانون یاد ہے نا منشی؟ یہاں عورت کو مارنا پڑتا ہے تا کہ طوائف جنم لے سکے۔''

منشی نے مشفق انداز میں سر ہلایا پھر وہ دھیمے قدموں سے کمرے سے نکل گیا۔ الماس بائی دیر تک حقے کی نال تھامے بیٹھی رہی۔ کمرے میں دھواں پھیلتا رہا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی نظر دیوار پر لگے پرانے آئینے پر پڑی۔ اس میں سرمے اور سونے کے بوجھ تلے دبی ایک بوڑھی عورت نظر آئی۔ اس نے فوراً نظریں پھیر لیں۔

دسمبر کی سرد دھوپ گلی کے پتھروں پر رینگ رہی تھی۔ سورج کو نکلے سوا گھنٹہ ہو چکا تھا مگر ہیرا منڈی کی گلیوں پر ابھی رات کا خمار باقی تھا۔ دکانیں بند تھیں اور کھڑکیاں موندھی ہوئی تھیں۔ دن چڑھے ایک دو لوگ مختلف کوٹھوں سے منہ ڈھانپے نکل کر بازار میں غائب ہوئے تھے۔ چاچا برکت کا چولہا روزانہ کی طرح سورج نکلتے ہی جل چکا تھا۔ منشی امیر علی باہر آ کر بنچ پر بیٹھ گیا اور اپنے مخصوص انداز میں چائے کا اشارہ کیا۔

''بڑی ضدی ہے نئی لڑکی برکت میاں!'' منشی نے پتیلی پر بنتی گرم چائے سے اٹھتے دھوئیں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''الماس سے بھی اب مزید صبر نہیں ہو رہا۔ پرسوں رات وہ وڈیرے اکبر سائیں کی مہمان بنے گی۔''

چاچا برکت نے پتیلی میں چمچ ہلایا۔ اس کا چہرہ کسی پتھر کے کتبے کی طرح ساکت رہا۔ اس نے پیالی منشی کے آگے رکھ دی اور خود بھی ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔

''اکبر سائیں؟'' چاچا برکت نے دھیمے سے پوچھا۔

''وہ تو خود قبر کے کنارے کھڑا ہے۔''

''گناہ کی کوئی عمر نہیں ہوتی برکت میاں'' منشی نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''الماس کو تو بس کرارے نوٹوں سے غرض ہے۔ یہاں جان دینا اور لینا سستا ہے مگر سودا خراب کرنا بہت مہنگا پڑتا ہے۔''

منشی نے خالی پیالی میز پر رکھی۔ اپنے کپڑے جھاڑے اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں چلتا ہوں کچھ انتظامات دیکھنے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

اس دن چاچا برکت کا ذہن الماس منزل کے تاریک کمرے کے گرد ہی طواف کرتا

رہا۔ وقت ریت کی طرح پھسلتا گیا اور شام نے بازار کے رنگین لیمپوں کو دوبارہ سے روشن کر دیا۔

رات کے پچھلے پہر جب بازار کی رونقیں اپنے عروج کو چھو کر ستانے لگی تھیں۔ چاچا برکت نے سالن اور دو روٹیاں ایک کپڑے میں باندھیں اور الماس منزل کے پچھواڑے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے کھڑکی کی سلاخوں کے پار جھانکا۔ کمرے کی گھٹن اور اندھیرے میں ریشماں دونوں گھٹنوں میں سر دیے زمین پر بیٹھی تھی۔

''بیٹی! یہ کھانا لے لو۔'' چاچا کی دھیمی مگر لرزتی ہوئی آواز اندھیرے کو چیرتی ہوئی ریشماں کی روح تک پہنچی۔ چند لمحے پہلے ساکت وجود اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک طرف ریشماں کا ذہن کہہ رہا تھا کہ یہ بھی اسی بازار کا آدمی ہے۔ کوئی چال ہوگی۔ دوسری طرف اس کا وجود بھوک اور اکیلا پن کا بوجھ اٹھائے بیٹھا تھا۔ بس ایک سچی آواز سننا چاہتا تھا۔

''مجھے 'بیٹی' کیوں کہا ہے؟'' ریشماں کی آواز میں ایک کاٹ دار تلخی تھی۔ ''کیا اس بازار میں کوئی باپ بیٹی کا رشتہ بھی ہوتا ہے؟''

چاچا برکت نے نفی میں سر ہلایا پھر کہا ''مگر میں اس بازار کا حصہ نہیں ہوں۔ میں ایک مجبور مسافر ہوں۔''

''تو پھر میرے لیے سب سے چھپ کر روز کھانا کیوں لاتے ہیں؟ کیا یہ کسی تماشے کا حصہ تو نہیں ہے؟''

''نہیں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ بازار کے اس قید خانے میں آنے والے نئے مہمانوں کو کھانا کھلا کر میں اپنی ہاری ہوئی زندگی کا کفارہ ادا کرتا ہوں۔''

''کفارہ یا صرف اپنی تسکین کے لیے؟'' ریشماں نے سلاخوں کو مضبوطی سے تھام لیا۔ ''کیا پہلے کسی لڑکی کو بیٹی کہا ہے؟''

''میں نے اس دلدل میں پھنسی ہر لڑکی کو بیٹی کہا ہے۔'' چاچا برکت نے نم آنکھوں سے کہا۔

''مگر چاچا'' ریشماں کا لہجہ فکری اور حتمی ہو گیا۔ ''اگر زبان سے 'بیٹی' کہا ہے تو پھر باپ بن کر بھی دکھاؤ۔ ورنہ کل سے یہ کھانا یہاں مت لانا۔''

یہ بات سن کر چاچا برکت یکدم بوکھلا گیا۔ وہ جلدی سے بنا کچھ بولے وہاں سے الٹے قدموں واپس اپنے کھوکھے پر آ کر بیٹھ گیا۔ کانوں میں ریشماں کے الفاظ کسی الہامی حکم کی طرح گونج رہے تھے۔ وہ ایک بوڑھا اور بے بس چائے والا تھا۔ دوسری طرف وہ لوگ تھے جن کے لیے انسانی جان کی قیمت ایک کتے سے بھی کم تھی۔ صرف

ایک بات اسے پریشان کر رہی تھی کہ نتھ اترنے کے بعد وہ پرانی ریشماں نہیں بلکہ الماس بائی کی دکان کا ایک نیا مال بن جانے والی تھی۔

گلی کے اوپر پھیلا سیاہ آسمان آہستہ آہستہ سرمئی ہونے لگا۔ جب صبح کی پہلی کرن نے زنگ آلود ٹین کی چھت کو چھوا تو چاچا برکت کی آنکھوں میں ایک پراسرار سکون اتر چکا تھا۔ وہ ایک حتمی فیصلے تک پہنچ گیا تھا۔

اگلا دن چاچا برکت کے لیے ایک الگ ہی رنگ لے کر آیا۔ آج اس کے چہرے پر تیس سال کی جمی ہوئی اداسی غائب تھی۔ کام کرتے کرتے رات ہو گئی۔ سارا دن کئی بار چاچا کے اندر کا انسان جذباتی بھی ہوا، ارادے ڈانواڈول بھی ہوئے اور بوڑھا جسم خوف سے بھی کانپا مگر اس کا فیصلہ اٹل تھا۔

رات کے آخری پہر جب پورا بازار گہری نیند کی چادر اوڑھے ہوئے تھا چاچا برکت نے نہایت اہتمام سے کھانا خود تیار کیا اور پھر اپنا اور ریشماں کا کھانا، ساتھ دو کپ گرم چائے لے کر اس کھڑکی کی طرف چل دیا۔ اس نے کھانا اور چائے کھڑکی کے اندر رکھنے کے بعد دھیمے سے آواز دی۔ ”ریشماں“

اندر زمین پر صرف ایک ساکت وجود پڑا تھا جیسے کوئی بے جان لاش ہو۔ چاچا نے دوبارہ آواز دی مگر پھر کوئی جواب نہ آیا۔ اس نے دل مضبوط کیا اور قدرے بلند آواز میں کہا ”تمہاری آزادی کا پروانہ لایا ہوں بیٹی۔“

یکدم زمین پر لیٹے وجود میں بجلی سی دوڑ گئی۔ ریشماں اٹھ کھڑی ہوئی اور دیوانہ وار بھاگ کر کھڑکی کے پاس آئی۔ اس کا چہرہ امید اور خوف کے تلاطم میں گھرا ہوا تھا۔ ”وہ کیسے چاچا؟ کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟“

”پہلے یہ کھانا کھا لو اور چائے پی لو۔“ چاچا نے ایک باپ کے میٹھے لہجے میں کہا۔

ریشماں جو پچھلی رات سے بھوکی تھی۔ چاچا کے لہجے کے مان اور یقین پر جلدی جلدی کھانا کھانے لگی۔ چاچا برکت نے بھی اپنے حصے کی روٹی کا لقمہ لیا اور خاموشی سے اس کا ساتھ دیتا رہا۔ دونوں نے مل کر مزے سے گرم چائے پی۔ ریشماں روٹی کا لقمہ چباتے ہوئے بولی ”چاچا! کل رات کے بعد حلق سے کچھ اترا ہے تو لگتا ہے جیسے مجھے کوئی پناہ مل گئی ہو۔“

چاچا برکت نے دھیمی آواز میں مگر عجیب لہجے میں کہا ”بیٹی! پناہ بے شک پناہ ہی ہوتی ہے۔ شہد کی طرح میٹھی ہو یا سانپ کی طرح زہریلی۔“

ریشماں نے چونک کر چاچا برکت کو دیکھا اور پوچھا "کیا پناہ بھی کبھی زہریلی ہو سکتی ہے؟"
چاچا برکت نے ایک گہرا سانس لیا اور ریشماں کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "ہاں بیٹی! جہاں چاروں طرف شکاری ہوں وہاں شاید زہریلی پناہ ہی انسان کے لیے واحد سہارا ہوتی ہے۔ تم اب خاموشی سے سو جاؤ۔ کل کا سورج جب طلوع ہوگا تو تمہاری قید ختم ہو چکی ہوگی۔"
ریشماں نے چاچا کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہاں اب کوئی خوف نہیں تھا بس ایک افسردہ سا اطمینان تھا۔
چاچا برکت وہاں سے واپس اپنے کھوکھے پر آ گیا۔ آج وہ مطمئن تھا جیسے کوئی ہاری ہوئی جنگ آخری لمحے میں جیت گیا ہو۔ اس نے سوائے تانبے کی کالی پتیلی کے باقی کھوکھے کا سارا سامان ایک طرف سلیقے سے رکھ دیا اور اپنی اونی میلی چادر پورے وجود پر تان کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس رات اسے تیس سال بعد ایسی گہری اور پرسکون نیند آئی جس کی تڑپ میں وہ آج تک جاگتا رہا تھا۔
صبح جب بازار میں ابھی ہلچل کم تھی اور سورج کی پہلی کرنیں تنگ گلیوں میں داخل ہو رہی تھیں۔ منشی امیر علی حسبِ عادت چائے پینے چاچا برکت کے کھوکھے کی طرف آیا۔ اس نے دیکھا کہ کھوکھے کا سارا سامان پیک ہے اور چاچا برکت ابھی تک چارپائی پر چادر اوڑھے سو رہا ہے۔
"برکت میاں! اجالا ہو گیا ہے۔ آج کھوکھا کھولنے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟" منشی نے ہنستے ہوئے آواز دی۔ مگر چاچا کے وجود میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ ابھی منشی سوچ ہی رہا تھا کہ چاچا برکت کو جگائے یا سویا رہنے دے کہ اس کے کانوں میں "الماس منزل" کے اندر سے عورتوں کے چیخنے اور رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ الماس منزل کی بالکونی پر گونجتے سسکتے بین تاریک گلیوں میں پھیلے سیلن زدہ سناٹے کو اور گہرا کر رہے تھے۔
منشی امیر علی نے کھوکھے سے "الماس منزل" کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا کہ تانبے کی کالی پتیلی میں تھوڑا سا سالن بچا پڑا تھا اور پاس ہی چوہے مار دوا کا خالی پیکٹ ہوا میں اڑ رہا تھا۔
آج ایک طرف چاچا برکت کا سرد چولہا اس بازار کی ہمیشہ یاد رہنے والی ہار کا کتبہ بن چکا تھا تو دوسری طرف اس بازار میں پہلی بار کوئی لڑکی نتھ اتروانے سے پہلے ہی پاکیزگی کی حالت میں ابدی نیند سو چکی تھی۔

☆☆☆☆☆

خاموش سودے

"رشتے آسمانوں پر بنتے ہیں۔"

یہ جملہ زینب نے بچپن سے ہزاروں بار سنا تھا۔ وہ ہر بار مسکرا دیتی، جیسے قسمت واقعی کہیں آسمان پر بیٹھی اس کے لیے خواب بُن رہی ہو۔

مگر اسے کیا معلوم تھا کہ بعض رشتے آسمان پر نہیں بنتے، زمین پر ہوتے ہوئے سودوں میں بدل جاتے ہیں۔

"لڑکا یورپ میں ہے۔"

یہ خبر پورے خاندان میں بجلی کی طرح پھیل گئی۔

"اپنا بزنس ہے۔"

"کروڑوں کی پراپرٹی ہے۔"

"پورا خاندان بااثر ہے۔"

ہر محفل میں یہی باتیں ہو رہی تھیں۔

بس ایک بات آہستہ آواز میں کہی جاتی تھی۔

"لڑکے کا ماضی اچھا نہیں..."

پھر فوراً کوئی دوسرا کہہ دیتا،

"ارے! لڑکے ہیں... جوانی میں ایسی باتیں ہو جاتی ہیں۔"

"شادی کے بعد سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

"ویسے بھی اتنے امیر گھر کہاں ملتے ہیں؟"

اور یوں کردار کی قبر پر دولت کے پھول رکھ دیے گئے۔

زینب نے ایک دن اپنی امی سے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"اگر یہ سب سچ ہو تو؟"

امی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"بیٹا! شادی کے بعد مرد بدل جاتے ہیں۔"

زینب خاموش ہو گئی۔

اسے معلوم نہیں تھا کہ بعض لوگ بدلتے نہیں، صرف اپنی حقیقت چھپا لیتے ہیں۔

شادی دھوم دھام سے ہوئی۔

مہندی، ڈھولکی، قہقہے، تصویریں، ویڈیوز...

ہر تصویر میں مسکراہٹ تھی۔

صرف سچ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

شادی کے چند ہفتے بعد وہ واپس یورپ

کومل شہزادی

چلا گیا۔
"جلد تمہیں بھی بلا لوں گا۔"
یہ کہتے ہوئے اس نے وعدہ کیا۔
زینب نے ہر دن اسی وعدے کے سہارے گزارا۔
وہ زبان سیکھنے لگی۔
یورپ کی تصویریں دیکھتی۔
اپنے ہونے والے گھر کا تصور کرتی۔
اس نے اپنے خوابوں کو سوٹ کیسوں میں رکھنا شروع کر دیا تھا۔
پھر ایک صبح ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"مبارک ہو، آپ ماں بننے والی ہیں۔"
زینب کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔
اس نے فوراً شوہر کو فون کیا۔
دوسری طرف خاموشی تھی۔
"اچھا... خیال رکھنا۔"
بس اتنا ہی۔
زینب نے خود کو سمجھایا۔
"شاید وہ مصروف ہوگا۔"
محبت میں انسان دوسروں کے لیے بہانے بناتے بناتے خود سے بھی جھوٹ بولنے لگتا ہے۔
پانچواں مہینہ شروع ہوا تو وہ پاکستان آیا۔
پورے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔
زینب نے سوچا...
"اب شاید میرا ویزا بھی بن جائے گا۔"
مگر وہ کسی اور کام سے آیا تھا۔
اپنی پسند کی لڑکی سے نکاح کرنے۔
خاموشی سے۔
چند گواہوں کی موجودگی میں۔
اسے یقین تھا کہ راز ہمیشہ راز رہیں گے۔
لیکن سچ کی ایک عجیب عادت ہوتی ہے...
وہ دیر سے آتا ہے، مگر آتا ضرور ہے۔
جب خبر زینب تک پہنچی تو اس نے پہلے یقین ہی نہیں کیا۔
اس نے بار بار کہا،
"نہیں... وہ ایسا نہیں کر سکتا۔"
پھر اس نے فون کیا۔
جواب آیا،
"ہاں... نکاح ہوا ہے۔"
بس ایک جملہ۔
جس نے اس کی پوری زندگی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔
ایک وہ، جب وہ خواب دیکھتی تھی۔
اور ایک یہ، جب خواب دیکھنے سے ڈرنے لگی۔
گھر میں عجیب خاموشی تھی۔
کسی نے لڑکے سے سوال نہیں کیا۔
سب زینب کو سمجھانے لگے۔

"صبر کرو۔"
"بچے کا خیال کرو۔"
"طلاق مت مانگنا۔"
"دوسری شادی تو جائز ہے۔"
زینب سوچ رہی تھی...
"اگر جائز ہونا ہی کافی ہوتا، تو انصاف کا لفظ کیوں پیدا کیا گیا؟"
وہ رات بھر جاگتی رہی۔
اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر اپنے بچے سے باتیں کرتی۔
"بیٹا...
جب تم بڑے ہو جاؤ گے، لوگ تمہیں بتائیں گے کہ تم ایک امیر باپ کے بیٹے ہو۔
کاش وہ یہ بھی بتائیں کہ دولت سے پہلے انسان کا کردار امیر ہونا چاہیے۔"
اس کے آنسو تکیے میں جذب ہوتے رہے۔
چند دن بعد وہ آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔
اس نے خود کو غور سے دیکھا۔
وہی چہرہ تھا۔
مگر آنکھیں بدل گئی تھیں۔
ان میں اب خواب نہیں تھے...
صرف تجربہ تھا۔
اس دن اسے احساس ہوا کہ شادی صرف دو لوگوں کا نہیں، دو خاندانوں کا فیصلہ ہوتی ہے۔
اور جب خاندان کردار پر دولت کو ترجیح دیتے ہیں تو سزا اکثر صرف ایک لڑکی نہیں بھگتتی۔
اس کے ساتھ ایک ماں مرتی ہے۔
ایک بیٹی ٹوٹتی ہے۔
ایک بچہ سوالوں کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔
کہتے ہیں رشتے قسمت سے ملتے ہیں۔
شاید یہ بات درست ہو۔
مگر غلط انسان کا انتخاب قسمت نہیں، انسانوں کے فیصلوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔
اس لیے رشتہ کرتے وقت صرف یہ نہ دیکھیے کہ لڑکا کہاں رہتا ہے، کتنا کماتا ہے، کتنی بڑی گاڑی چلاتا ہے یا کتنے ملکوں کا سفر کرتا ہے۔
یہ بھی دیکھیے کہ کیا وہ کسی کی بیٹی کے خوابوں کی حفاظت کر سکتا ہے؟
کیونکہ دولت زندگی آسان بنا سکتی ہے...
مگر اچھا کردار ہی زندگی خوب صورت بناتا ہے۔
اور جب کردار مر جائے تو محل بھی قید خانہ لگنے لگتے ہیں-----!

☆☆☆☆☆

ہرڈالی کا نوحہ

پاکستان کی پچاسویں سالگرہ کا دن تھا۔ فضاؤں میں ملی نغمے گونج رہے تھے، شہر کی شاہراہوں پر سبز ہلالی پرچموں کی بہار تھی اور ہر سو آزادی کا جشن ایک جوش و خروش کے ساتھ منایا جا رہا تھا۔ شہر کے ایک خاموش گوشے میں، جہاں وقت کی رفتار قدرے سست محسوس ہوتی تھی، بھائی اسلم کا گھر تھا۔ گھر کے آنگن میں ان کے پوتے پوتیاں سبز و سفید جھنڈیاں لگاتے ہوئے ہنسی مذاق میں مصروف تھے۔ آزادی کا یہ تہوار ان کے لیے محض ایک چھٹی اور تفریح کا دن تھا، جس میں نئے کپڑے پہننا، پٹاخے چلانا اور گلیوں میں نکل کر نعرے لگانا ہی سب کچھ تھا۔

بھائی اسلم، جو خاندان کے بزرگ تھے، اپنے کمرے کی کھڑکی سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ ان کی شخصیت میں ایک عجیب سا ٹھہراؤ اور متانت تھی۔ وہ پانچ وقت کے نمازی، تلاوت قرآن کے دلدادہ اور مطالعے کے رسیا انسان تھے۔ ان کا زیادہ وقت مسجد میں گزرتا تھا یا پھر گھر کے چھوٹے سے کتب خانے میں، جہاں تاریخی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا۔ یہ کتب محض ورق نہیں تھیں، بل کہ برصغیر کے مسلمانوں کی جدوجہد آزادی، قیامِ پاکستان کے ہنگامی حالات اور ہجرت کے ان ناقابلِ بیان مصائب کی مستند داستانیں تھیں، جن کے وہ خود بھی چشم دید گواہ تھے۔

ہر سال جب چودہ اگست کا سورج طلوع ہوتا، بھائی اسلم کے اعصاب پر ایک بوجھ سا طاری ہو جاتا۔ ان کی یادداشت کی فلم ریوائنڈ ہو کر 1947 کے اس اگست میں

رانا محمد شاہد

چلی جاتی، جب آسمان سے خون کی بارش ہو رہی تھی۔ تب ان کی عمر محض پندرہ برس تھی۔ پاکستان بننے کی خبر نے دلوں کو گرمایا تو تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی موت کا بھیانک رقص بھی شروع ہو گیا تھا۔ جب ان کے خاندان نے ہجرت کا فیصلہ کیا، تو انھیں اندازہ نہ تھا کہ یہ سفر ان کی زندگی کی ساری خوشیوں کو راکھ کر دے گا۔

قافلے کے ساتھ چلتے ہوئے، گرمی، پیاس اور خوف کے عالم میں، اچانک بلوائیوں کا حملہ ہوا۔ وہ ہنگامہ، وہ چیخ و پکار، وہ تلواروں کی جھنکار اور جلتے ہوئے گھروں کی بو، آج بھی بھائی اسلم کے حواس پر چھائی رہتی تھی۔ ہجرت کے اس کربناک سفر میں صرف ان کی چھوٹی بہن ہی ان کے ساتھ تھی۔ والدین اور دیگر رشتہ دار کب اور کہاں بچھڑ گئے، کچھ معلوم نہ تھا۔ وہ قافلے سے بچھڑ چکے تھے، مگر اپنی دس سالہ بہن کا ہاتھ تھامے ہوئے تھے، جو ڈر کے مارے کانپ رہی تھی۔ بھاگتے ہوئے وہ کچھ جھاڑیوں کے جھنڈ کے پاس پہنچے جہاں انھوں نے پناہ لینے کی کوشش کی۔ موت لمحہ بہ لمحہ قریب آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں وہ بلوائیوں کے نرغے میں تھے۔ ایک سکھ کی تلوار نے ان کے کندھے کو چیر دیا۔ خون کا فوارہ چھوٹا، اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ ان کی آخری یاد یہ تھی کہ ان کی بہن چیخ رہی تھی اور چند درندے اسے گھسیٹ کر لے جا رہے تھے۔ جب ہوش آیا تو وہ ایک مہاجر کیمپ میں تھے۔ زخم گہرے تھے، لیکن اس سے زیادہ گہرا وہ صدمہ تھا جس نے ان کے وجود کو اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا۔

برسوں گزر گئے، وہ کیمپ در کیمپ بھٹکتے رہے، اپنی بہن کو ڈھونڈتے رہے، لیکن وہ نہ ملی۔ صرف ایک چیز ان کے ہاتھ آئی، وہ ان کی بہن کا دوپٹہ، جو کھینچا تانی کے دوران ان کے ہاتھ میں رہ گیا تھا۔ یہ دوپٹہ کسی زمانے میں سفید تھا، لیکن اب وقت کی گرد اور خون کے دھبوں نے اسے ایک نوحہ بنا دیا تھا۔ یہ وہی نشانی تھی جو انھوں نے برسوں سے ایک لکڑی کے صندوق میں چھپا رکھی تھی۔

بھائی اسلم کے بیٹے اور بہو کے لیے ان کا یہ طرزِ عمل ہمیشہ ایک معمے کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ سوچتے تھے کہ آخر ایسی کیا چیز ہے جو والد صاحب صرف آزادی کے دن ہی نکالتے ہیں؟ اور پھر وہ گھنٹوں خاموشی سے اسے دیکھ کر کیوں روتے ہیں؟ انھوں نے کئی بار پوچھنے کی کوشش کی، مگر بھائی اسلم کی خاموشی ایک دیوار بن کر سامنے کھڑی ہو جاتی تھی۔

اس سال، جب گھر میں جشن کا ماحول عروج

پر تھا، بیٹے اور بہو نے فیصلہ کیا کہ آج وہ اس راز سے پردہ اٹھائیں گے۔ دوپہر کے وقت، جب سب بچے ٹی وی دیکھنے میں مصروف تھے، وہ دبے پاؤں بھائی اسلم کے کمرے کے پاس پہنچے۔ اندر سے سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔ انھوں نے بے چینی سے دروازہ بجایا۔ بھائی اسلم نے دروازہ کھولا تو ان کی آنکھیں سوجھی ہوئی تھیں، اور سامنے چارپائی پر وہ پرانا صندوق کھلا پڑا تھا۔

”خیریت تو ہے ابا جان؟“ بہو نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ”ہم میاں بیوی اب مزید تجسس برداشت نہیں کر سکتے۔ آپ کے ساتھ آخر ایسا کیا ہوا تھا جو آپ کو ہر سال اس طرح توڑ دیتا ہے؟“

بھائی اسلم نے ایک گہری سانس لی اور اپنے بیٹے کی طرف دیکھ کر مسکرائے، جس میں درد کی ایک لہر تھی۔ انھوں نے صندوق سے اپنے والدین کی تصاویر اور بہن کا وہ دوپٹہ نکالا۔ یہ دوپٹہ اب بوسیدہ ہو چکا تھا، لیکن اس کے تاروں میں آج بھی اس دس سالہ بچی کی سسکیاں قید تھیں۔ انھوں نے پوری داستان بیان کی، ایک ایک لمحہ، ایک ایک زخم، اور وہ درد جو وقت گزرنے کے باوجود تازہ تھا۔

بیٹے نے حیرت سے کہا: ”ابا جان، آپ تو اللہ کے اتنی قریب ہیں، تلاوت اور ذکر میں وقت گزارتے ہیں۔ آپ کو یہ سب بھول جانا چاہیے، یہ درد، تکلیف اور قربانی تو اللہ نے آپ کے مقدر میں لکھ دی تھی، آپ اس پر اتنا روتے کیوں ہیں؟“

بھائی اسلم نے نم آنکھوں سے اپنے بیٹے کو دیکھا اور بولے: ”بیٹا! والدین اور بہن بھائیوں کو یاد کر کے رونا تو فطری عمل ہے، مگر میرے رونے کی ایک خاص وجہ ہے۔ میں اس ملک کے لیے روتا ہوں جسے ہم نے خون سے سینچا تھا۔ میرا رونا اس آزادی کے لیے ہے جس کی قدر اب ختم ہوتی جا رہی ہے۔“

انھوں نے اپنی بات کو وسعت دیتے ہوئے کہا: ”میں جب باہر گلیوں میں، ان نوجوانوں کو آزادی کے نام پر ہلڑ بازی کرتے، موسیقی کی دھنوں پر بے ہنگم رقص کرتے اور آزادی کی روح کو فراموش کر کے صرف اسے ایک تہوار سمجھتے دیکھتا ہوں، تو میرا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ کیا اس آزادی کے لیے ہم نے اپنی ماؤں کی عزتیں لٹائیں؟ کیا اس لیے ہم نے لاشوں کے ڈھیر لگائے تھے کہ ہماری نسلیں اس آزادی کو ایک تماشہ بنا دیں؟“

”یہ نوجوان نسل اس پھولوں کی بری ڈالی پر

بیٹھی ہے جو انھیں بغیر کسی محنت کے مل گئی۔ انھیں اس جنگل کے دکھ کی کیا خبر، جن کانٹوں کو روند کر، جن آگ کے دریاؤں کو عبور کر کے ہم یہاں تک پہنچے تھے۔ انھیں کیا معلوم کہ آزادی کیا چیز ہے۔ اگر ان کے سامنے ایک دن بھی وہی حالات آجائیں جو ہم نے دیکھے تھے، تو شاید یہ آزادی کا مطلب سمجھ جائیں۔ آزادی کوئی کھلونا نہیں کہ جسے رات گئے تک سڑکوں پر ناچ کر منایا جائے۔ آزادی ایک امانت ہے، ایک عظیم مقصد کا نام اور ہم نے اسے ایک بے معنی تفریح بنا دیا ہے۔''

بھائی اسلم کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

''میری روح اس وقت کانپ اٹھتی ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ جس وطن کے لیے لاکھوں انسانوں نے اپنی ہستی مٹا دی، آج اسی کے نوجوان اپنی تہذیب، اپنی تاریخ اور اپنی شناخت سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ آج کا نوجوان اگر یہ سمجھ لے کہ آزادی اسے ورثے میں ملی ہے، تو وہ اس کا محافظ بنے گا، نہ کہ اسے برباد کرنے والا۔ کیا ہم نے اس آزادی کے لیے اپنے گھر بار، اپنی بہنیں، اپنی عزتیں قربان کی تھیں کہ آج کی نسل اسے بے ہودگی کی نذر کر دے؟ بیٹا، یہ آزادی وہ ہری شاخ ہے جس کو سیراب کرنے کے لیے ہمارے خون کے دریا بہے تھے۔ اگر اس کی قدر نہ کی گئی تو یہ شاخ سوکھ جائے گی، اور جب شاخ سوکھ جاتی ہے تو پھول کبھی نہیں کھلتے۔''

بیٹے اور بہو نے سر جھکا لیے۔ کمرے کی فضا میں ایک عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ بھائی اسلم نے اپنے پیاروں کی تصاویر اور وہ دوپٹہ دوبارہ صندوق میں رکھا اور اسے مقفل کر دیا۔ ان کی آواز میں ایک ٹھہراؤ تھا۔ ''بیٹا! آزادی کا جشن مناؤ، ضرور مناؤ، لیکن اپنے اسلاف کی قربانیوں کو یاد رکھ کر۔ اس قوم کو ہری ڈالی تو مل گئی، مگر اس کی جڑوں کو پانی دینے کی ذمہ داری اب تم پر ہے۔''

اس دن کے بعد سے بھائی اسلم کے گھر میں آزادی کا مفہوم بدل گیا تھا۔ اب وہاں صرف جھنڈیاں نہیں لگتی تھیں، بل کہ تاریخ کے ان اسباق کا تذکرہ بھی ہوتا تھا جو آزادی کی بنیاد بنے تھے۔ گھر کا ہر فرد یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ کیا واقعی ہم اس آزادی کے اہل ہیں جو ہمیں اتنی بھاری قیمت دے کر ملی تھی؟

آزادی کا جشن ایک عہدِ وفا ہونا چاہیے، نہ کہ ایک بے مقصد ہنگامہ۔

☆☆☆☆☆

خالی نشست

سدرہ عندلیب

وہ شہر ہمیشہ سے بارشوں کا اسیر تھا۔ پرانے درختوں، نم آلود گلیوں اور زرد روشنیوں میں لپٹا ہوا ایک خاموش شہر --- جہاں شامیں جلد بوڑھی ہو جاتی تھیں۔ لوگ کہتے تھے اس شہر میں رہنے والے آہستہ آہستہ اپنی خواہشوں سے دستبردار ہو جاتے ہیں۔ شاید اسی لیے وہاں کے چہروں پر ایک مستقل تھکن بسی رہتی تھی۔

اذان بھی اُنہی تھکے ہوئے چہروں میں سے ایک تھی۔ وہ جامعہ کی قدیم لائبریری میں بیٹھ کر گھنٹوں کتابوں کے درمیان گم رہتی۔ اُسے لفظوں سے محبت تھی، شاید اس لیے کہ لفظ کبھی سوال نہیں کرتے۔ انسان تھک جائے، بکھر جائے، خاموش ہو جائے -- لفظ پھر بھی ساتھ نہیں چھوڑتے۔

دسمبر کی ایک سرد شام تھی جب اُس نے پہلی بار اُسے دیکھا۔ وہ کھڑکی کے قریب کھڑا باہر برستی بارش کو دیکھ رہا تھا۔ کالے کوٹ میں لپٹا، غیر معمولی سنجیدہ چہرہ اور آنکھیں ایسی جیسے اُن میں کئی برسوں کی خاموش اذیت دفن ہو۔ اُس کے ہاتھ میں فلسفے کی ایک پرانی کتاب تھی مگر محسوس یوں ہوتا تھا جیسے وہ کتاب نہیں، اپنی زندگی کا کوئی بوسیدہ باب تھامے کھڑا ہو۔

"یہ نشست خالی ہے؟"

اُس کی آواز میں عجیب سا وقار تھا، جیسے برسوں کی خاموشی نے لفظوں کو سنجیدگی عطا کر دی ہو۔

اذان نے چونک کر سر اُٹھایا۔ سامنے کھڑا شخص غیر معمولی طور پر پُرسکون دکھائی دیتا تھا۔ بارش کی ہلکی نمی اُس کے کوٹ کے کناروں سے لپٹی ہوئی تھی اور اُس کی آنکھوں میں ایسی تھکن بسی تھی جو صرف اُن لوگوں کے حصے میں آتی ہے جو زندگی کو حد سے زیادہ محسوس کرتے ہیں۔

اذان نے کتاب بند کرتے ہوئے دھیرے سے کہا: "جی! یہاں کوئی نہیں بیٹھتا۔"

وہ چند لمحے اُسے دیکھتا رہا، پھر کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اُس کے بیٹھتے ہی لائبریری کی وسیع خاموشی پہلے سے زیادہ گہری محسوس ہونے لگی۔ باہر بارش مسلسل شیشوں سے ٹکرا رہی تھی اور اندر گھڑی کی سوئیاں کسی تھکے ہوئے وقت کی طرح چل رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد اُس نے میز پر رکھی کتاب کی طرف اشارہ کیا۔

"آپ فیودور پڑھتی ہیں؟"

اذان نے پہلی بار غور سے اُس کی آواز سنی۔

اُس لہجے میں نرم اداسی گھلی ہوئی تھی۔
"کبھی کبھی --- جب اپنے اندر کا شور برداشت نہ ہو۔"
وہ ہلکا سا مسکرایا---ایسی مسکراہٹ جو مکمل ہونے سے پہلے ہی بجھ جائے۔
"جب تو آپ یقیناً اُن لوگوں میں سے ہیں جو لفظوں میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔"
اذان جواب نہ دے سکی--- کیونکہ بعض اوقات اجنبی لوگ انسان کو اُس سے زیادہ سمجھ لیتے ہیں جتنا اپنے برسوں میں نہیں سمجھ پاتے۔
اُس شام اُن کے درمیان زیادہ گفتگو نہیں ہوئی، مگر عجیب طور پر خاموشی بوجھل بھی نہیں تھی۔ جیسے دونوں ایک دوسرے کے اندر موجود کسی اَن کہے دکھ سے واقف ہوں۔
جب لائبریری بند ہونے لگی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا، کتاب بند کی، کوٹ سنبھالا، اور جاتے جاتے پہلی بار اپنا نام بتایا۔
"سالم"۔
پھر چند لمحے رکا اور دھیمی آواز میں بولا:
"اور بعض نشستیں واقعی خالی نہیں ہوتیں، بس اُن پر بیٹھنے والا دیر سے آتا ہے"۔
سالم اُن لوگوں میں سے تھا جو کم بولتے ہیں مگر اُن کی خاموشی انسان کے اندر تک اتر جاتی ہے۔ وہ اکثر لائبریری آتا، کھڑکی کے قریب بیٹھتا اور دیر تک کتاب کے ایک ہی صفحے پر نظریں جمائے رہتا۔ جیسے پڑھ کچھ اور رہا ہو، سوچ کچھ اور رہا ہو۔
وقت کے ساتھ اُن کے درمیان ایک عجیب تعلق بن گیا، نہ دوستی --- نہ محبت کا اظہار--- بس ایک غیر مرئی وابستگی۔ کبھی سالم اُس کے لیے چائے رکھ جاتا، کبھی اذان اُس کی ادھوری نوٹس ترتیب دے دیتی اور کبھی دونوں خاموش بیٹھے بارش سنتے رہتے مگر بعض تعلقات کی سب سے بڑی بدقسمتی یہی ہوتی ہے کہ وہ نام مانگتے ہی ٹوٹنے لگتے ہیں۔
ایک رات اذان نے سالم کو جامعہ کے پچھلے باغ میں تنہا بیٹھے دیکھا۔ سرد ہوا درختوں سے ٹکرا رہی تھی اور وہ سر جھکائے نجانے کن خیالوں میں گم تھا۔
"آپ اتنے خاموش کیوں رہتے ہیں؟"
سالم نے پہلی بار اُس کی آنکھوں میں براہ راست دیکھا اور پھر دھیرے سے مسکرایا، ایسی مسکراہٹ جو خوشی سے زیادہ شکست لگتی تھی۔
"کچھ لوگ اگر بول پڑیں تو بہت کچھ ٹوٹ جاتا ہے۔"
اُس رات اذان دیر تک سو نہ سکی۔ پہلی بار اُسے احساس ہوا کہ بعض انسان اپنے اندر مکمل المیے لیے پھرتے ہیں۔ وہ ہنستے ہیں، چلتے ہیں، لوگوں سے ملتے ہیں، مگر اُن کی روح مسلسل کسی اندھی کھائی کے کنارے کھڑی رہتی ہے۔
پھر موسم بدلنے لگے۔ سالم پہلے کی نسبت کم آنے لگا۔ اُس کی آنکھوں کے نیچے تھکن گہری ہوتی جارہی تھی۔ ایک روز اذان نے بے اختیار پوچھ لیا:

"سب ٹھیک ہے؟"

وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر بولا:

"میری منگنی ہو چکی ہے۔"

یہ صرف ایک جملہ تھا مگر اذان کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اُس کے اندر جلتا ہوا شہر اچانک راکھ کر دیا ہو۔ وہ اُس لمحے مسکرائی ضرور، مگر اُس رات پہلی بار اُس نے جانا کہ خاموشی بھی چیخ سکتی ہے۔ بعد میں اُسے معلوم ہوا کہ سالم نے یہ رشتہ اپنی مرضی سے قبول نہیں کیا تھا۔ اُس کے والد شدید بیمار تھے اور خاندان کی آخری خواہش یہی تھی۔

سالم اُن لوگوں میں سے تھا جو اپنی ذات قربان کر دیتے ہیں مگر اپنوں کی آنکھوں میں محرومی نہیں دیکھ سکتے۔

اذان نے اُس دن پہلی بار قسمت سے نفرت کی، کیونکہ محبت اگر گناہ تھی تو پھر دونوں کے دلوں میں ایک جیسا درد کیوں رکھا گیا تھا؟

اُس کے بعد دونوں پہلے جیسے نہ رہے۔ اب ملاقاتوں میں عجیب احتیاط در آتی۔ نظریں ایک دوسرے سے بچنے لگتیں۔ گفتگو مختصر ہو گئی۔ مگر اُن دونوں کی خاموشیاں پہلے سے زیادہ بلند ہو چکی تھیں۔

اور پھر ایک دن سالم اچانک شہر چھوڑ گیا۔

نہ کوئی الوداع۔

نہ کوئی وعدہ۔

صرف لائبریری کی اُس پرانی کتاب میں رکھا ایک خشک زرد پتہ، جس کے نیچے اُس نے صرف ایک جملہ لکھا تھا:

"بعض محبتیں انسان کی زندگی میں مکمل ہونے نہیں، زندہ رکھنے آتی ہیں۔"

کئی برس گزر گئے۔

شہر ویسا ہی رہا۔ بارشیں بھی ویسی ہی رہیں۔ مگر اذان اب پہلے جیسی نہیں تھی۔ اُس نے لکھنا شروع کر دیا تھا۔ درد جب لفظوں میں ڈھل جائے تو انسان مکمل بکھرنے سے بچ جاتا ہے۔

وہ آج بھی اسی مقام پر بیٹھی، ہاتھ میں قلم تھامے، اُس کی موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے خاموش لفظوں کو کاغذ پر اتار رہی تھی۔

کبھی کبھی محبت اپنی تکمیل نہ ہونے کے باوجود بھی انسان کی زندگی کا سب سے مقدس احساس بن جاتی ہے۔ ایسی محبت جس میں نہ وصال نصیب ہوتا ہے، نہ اقرار کی جرأت، صرف ایک خاموش وابستگی، جو روح کے کسی تاریک گوشے میں چراغ کی مانند جلتی رہتی ہے۔

وہ میری زندگی میں ایسے داخل ہوا جیسے خزاں رسیدہ شاخوں پر اچانک بہار کی پہلی ہوا اُتر آئے۔ اُس کی گفتگو میں عجب متانت تھی، اُس کی خاموشی میں ایک انجانا اضطراب۔ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا، شاید حد سے زیادہ، مگر اُس کے لہجے پر ہمیشہ احتیاط کی دبیز چادر تنی رہتی۔ جیسے اُسے خوف ہو کہ اگر جذبات لفظوں میں ڈھل گئے تو زمانہ اُنہیں سنگسار کر دے گا۔

اور میں؟ میں اُس کی آنکھوں میں اپنی محبت کی مکمل تفسیر پڑھ لیتی تھی۔

بعض لوگ اظہار نہیں کرتے، مگر اُن کی نگاہیں اعترافِ عشق کا سب سے دردناک نوحہ ہوتی ہیں۔ وہ جب میرے سامنے بیٹھتا تو گفتگو عام باتوں سے آگے نہ بڑھتی، مگر اُس کی خاموش نظریں میرے وجود پر ایسی تحریریں لکھ جاتیں جنہیں مٹانے پر بھی زمانہ قادر نہیں ہوتا۔

مگر قسمت— قسمت شاید دو سچے لوگوں کے درمیان سب سے بڑی دیوار ہوتی ہے۔

ہم دونوں ایک ایسی دنیا کے مکین تھے جہاں محبت سے زیادہ مصلحتوں کی توقیر کی جاتی ہے۔ اُس کے قدم ذمہ داریوں کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور میری روح سماجی روایتوں کی صلیب پر معلق۔ ہم دونوں چاہتے ہوئے بھی ایک دوسرے تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ عجیب اذیت تھی--- جیسے دو کنارے برسوں ایک ہی دریا کے ساتھ رہیں مگر کبھی مل نہ سکیں۔

وہ اکثر میرے قریب ہوتا تھا، اتنا قریب کہ اُس کی سانسوں کی ارتعاش تک محسوس ہوتی، مگر پھر بھی ہمارے درمیان ایک ان دیکھی مسافت حائل رہتی۔ ایک ایسی مسافت جسے نہ قدم سمیٹ سکتے تھے نہ دعائیں۔

میں نے اُس کے چہرے پر کئی مرتبہ ٹوٹنے کی کیفیت دیکھی ہے۔ وہ مسکراتا ضرور تھا مگر اُس مسکراہٹ کے عقب میں ایک مہیب ویرانی آباد تھی۔ شاید وہ بھی جانتا تھا کہ بعض محبتیں مقدر میں صرف محسوس کرنے کے لیے لکھی جاتی ہیں، پانے کے لیے نہیں۔

عشق کا سب سے کربناک مرحلہ شاید یہی ہوتا ہے، جب دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہوں، مگر حالات اُن کے درمیان قیامت کی طرح کھڑے ہوں۔

پھر آہستہ آہستہ ہم نے خاموش رہنا سیکھ لیا۔ اُس نے اپنے جذبات کو سنجیدگی کے کفن میں دفن کر دیا اور میں نے اپنے دل کو صبر کی قبر میں اتار دیا۔ مگر کچھ احساسات مرنے کے بعد بھی زندہ رہتے ہیں۔ وہ آج بھی میرے اندر کہیں سانس لیتا ہے--- ایک ادھورے خواب، ایک ممنوع دعا، ایک نامکمل آیت کی طرح۔

اب کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم دونوں محبت نہیں، ایک دائمی ہجرت تھے۔ ایسی ہجرت جس میں فاصلہ جسموں کا نہیں، نصیبوں کا ہوتا ہے۔

آنکھ سے ٹپکا ہوا آنسو جب کاغذ کی سطروں پر گرا تو اُس کے ہاتھ لمحے بھر کو تھم گئے۔ جیسے وقت نے سانس لینا چھوڑ دیا ہو، اور ہر شے ایک خاموش ٹھہراؤ میں ڈوب گئی ہو۔

لوگ اُس کی تحریروں میں عجیب اداسی محسوس کرتے تھے۔ وہ کہتے اُس کے افسانوں میں محبت ہمیشہ ادھوری کیوں رہ جاتی ہے؟

اور اذان ہر بار مسکرا دیتی۔

"کیونکہ کچھ سوالوں کے جواب صرف آنسو جانتے ہیں۔"

☆☆☆☆☆

دل خریدو گے

نعمان منظور

شہر کے پرانے حصے میں ایک ایسا بازار تھا جہاں ہر چیز بکتی تھی۔ لکڑی کی خوشبو، مصالحوں کی تیزی، کتابوں کی خاموشی، کپڑوں کے رنگ اور زیورات کی چمک سب ایک دوسرے میں گھل مل کر ایک عجیب فضا پیدا کرتے تھے۔ صبح سورج کی پہلی کرن کے ساتھ دکانوں کے شٹر اٹھتے اور شام اذان کے بعد ایک ایک کر کے بند ہونے لگتے۔ برسوں سے یہی معمول تھا۔ لوگوں کے چہرے بدلتے رہے، دکانوں کے نام بدلتے رہے، مگر بازار کی روح کبھی نہیں بدلی۔

لیکن ایک دن اس بازار میں ایک ایسی آواز گونجی کہ لوگوں کے قدم بے اختیار رک گئے۔

”دل خریدو گے...؟“

لوگوں نے گردنیں موڑ کر دیکھا۔

ایک بوڑھا شخص فٹ پاتھ پر ایک پرانی سی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے نہ کوئی صندوق تھا، نہ کوئی سامان، نہ کوئی ترازو۔ صرف ایک چھوٹی سی تختی رکھی تھی جس پر سادہ لفظوں میں لکھا تھا:

”دل خریدو گے؟“

لوگ ہنسنے لگے۔

”بابا! دل بھی کہیں بکتے ہیں؟“

”قیمت کیا ہے؟“

”ہمارا بھی خرید لو!“

بوڑھا سب کی باتیں سنتا، مسکراتا اور خاموش رہتا، جیسے اسے لوگوں کے قہقہوں سے کوئی فرق نہ پڑتا ہو۔

اسی بازار میں روز ایک آدمی گزرتا تھا۔ اس کا نام سلمان تھا۔

وہ شہر کے امیر ترین تاجروں میں شمار ہوتا تھا۔ اس کی کپڑے کی فیکٹریاں تھیں، کئی پلازے تھے، درجنوں ملازم تھے، مگر اس کے چہرے پر ہمیشہ ایک ایسی تھکن رہتی تھی جو جسم کی نہیں، روح کی ہوتی ہے۔

وہ روز اس بوڑھے کو دیکھتا اور آگے بڑھ جاتا۔

مگر اس دن نہ جانے کیوں اس کے قدم رک گئے۔

"بابا، دل کتنے کا ہے؟"

بوڑھے نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"اتنے کا... جتنا تم دے نہیں سکتے۔"

سلمان ہنس دیا۔

"میرے پاس دولت کی کمی نہیں۔"

بوڑھے نے آہستہ سے جواب دیا،

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں... تم قیمت ادا نہیں کر سکتے۔"

یہ جملہ سلمان کے ساتھ گھر تک آیا۔

اس رات وہ دیر تک جاگتا رہا۔

اسے احساس ہوا کہ برسوں سے اس نے سکون سے نیند نہیں سوئی۔

اسے یہ بھی یاد نہ تھا کہ آخری بار وہ دل کھول کر کب ہنسا تھا۔

اور شاید یہ بھی کہ کسی نے اسے محبت سے کب پکارا تھا۔

محسوس کی۔ ڈرائیور گاڑی دروازے پر کھڑی کیے انتظار کر رہا تھا مگر اس نے پہلی بار کہا،

"دفتر بعد میں جائیں گے... پہلے بازار چلتے ہیں۔"

ڈرائیور نے حیرت سے آئینے میں دیکھا۔ برسوں میں ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ کاروبار پر کسی اور چیز کو ترجیح دی گئی ہو۔

بوڑھا حسبِ معمول اسی کرسی پر بیٹھا تھا۔ بازار ابھی پوری طرح آباد نہیں ہوا تھا۔ دکان دار جھاڑو دے رہے تھے، کہیں پانی کا چھڑکاؤ ہو رہا تھا اور صبح کی دھوپ گلی کے آخری سرے سے رینگتی ہوئی آ رہی تھی۔

سلمان اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"میں آ گیا ہوں۔"

بوڑھے نے مسکرا کر پوچھا،

"دولت ساتھ لائے ہو یا دل؟"

سلمان نے پہلی بار اعتراف کیا،

"میرے پاس شاید دونوں میں سے کوئی بھی نہیں۔"

بوڑھے نے خاموشی سے اپنے برابر والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"بیٹھ جاؤ۔ جب انسان اپنی کمی مان لیتا ہے تو اس کے بھرنے کا سفر وہیں سے شروع ہوتا ہے۔"

کچھ دیر دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ بازار کا

شور بڑھنے لگا تھا، مگر ان دونوں کے درمیان ایک عجیب سکون اترا ہوا تھا۔

بوڑھے نے پوچھا،

”گھر میں کون کون ہے؟“

”ایک بوڑھی ماں... ایک بیوی... ایک بیٹا۔“

”اور تم؟“

سلمان چونک گیا۔

”میں بھی تو ہوں۔“

بوڑھے نے نفی میں سر ہلایا۔

”نہیں... تم صرف رہتے ہو۔ موجود نہیں ہو۔“

یہ جملہ سلمان کے اندر کہیں گہرائی تک اتر گیا۔

وہ برسوں سے گھر کو صرف آرام گاہ سمجھتا رہا تھا۔ صبح نکلتا، رات گئے لوٹتا، کھانا کھاتا اور اپنے کمرے میں بند ہو جاتا۔ ماں کی دعائیں، بیوی کی باتیں اور بیٹے کی شرارتیں، سب اس کے لیے غیر ضروری آوازیں بن چکی تھیں۔

اسی شام جب وہ گھر پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کی ماں صحن میں اکیلی بیٹھی مغرب کے آسمان کو دیکھ رہی تھی۔

وہ خاموشی سے جا کر ان کے پاس بیٹھ گیا۔

ماں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”خیریت ہے بیٹا؟“

”امی... آپ کیا دیکھ رہی ہیں؟“

بوڑھی ماں کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔

”کچھ نہیں... بس انتظار۔“

”کس کا؟“

”اس بیٹے کا جو اسی گھر میں رہتا ہے، مگر کئی برس سے ملا نہیں۔“

سلمان کا سر جھک گیا۔

اسے محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے سینے پر رکھا ہوا پتھر ذرا سا چیر دیا ہو۔

وہ پہلی بار ماں کی گود میں سر رکھ کر بیٹھ گیا۔

بوڑھی انگلیاں اس کے بالوں میں پھرنے لگیں۔

”پتہ ہے سلمان... بچہ جب چھوٹا ہوتا ہے تو ماں اس کے سونے کا انتظار کرتی ہے، اور جب بڑا ہو جاتا ہے تو اس کے لوٹ آنے کا۔“

اس روز سلمان نے محسوس کیا کہ دنیا کی سب سے قیمتی چیز وقت ہے، اور وہ اپنی ماں سے برسوں کا وقت چرا چکا تھا۔

اگلے دن وہ پھر بازار پہنچا۔

بوڑھے نے اسے دیکھتے ہی کہا،

”آج تمہاری آنکھیں بدل گئی ہیں۔“

سلمان نے دھیرے سے کہا،

”کل رات میں نے اپنی ماں کو پایا ہے... یا شاید خود کو۔“

بوڑھا مسکرایا، مگر کچھ نہ بولا۔

اسی لمحے ایک بارہ تیرہ سال کا لڑکا دوڑتا ہوا آیا۔ اس کے ہاتھ میں دوائیاں تھیں اور چہرے پر گھبراہٹ۔

وہ سیدھا سامنے والی سڑک کی طرف لپکا، مگر تیز رفتار موٹر سائیکل سے ٹکرا کر گر پڑا۔

دوائیاں سڑک پر بکھر گئیں۔
لوگ چند لمحے رکے، دیکھا، اور پھر اپنی اپنی راہ چل دیے۔
ہر ایک کو اپنی جلدی تھی۔
صرف سلمان دوڑا۔
اس نے لڑکے کو اٹھایا۔ اس کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا۔
''بیٹا، کہاں جانا ہے؟''
لڑکے نے ٹوٹتی ہوئی آواز میں کہا،
''امی... اسپتال میں ہیں... یہ دوائیاں ان کے لیے تھیں...''
سلمان نے دوائیاں سمیٹیں، اسے گاڑی میں بٹھایا اور خود اسپتال لے گیا۔
وہاں معلوم ہوا کہ لڑکے کی ماں کئی دنوں سے زیرِ علاج تھی اور پیسوں کی کمی کی وجہ سے ڈاکٹر آپریشن مؤخر کر رہے تھے۔
سلمان نے بغیر کسی سے کچھ کہے تمام اخراجات ادا کر دیے۔
رسید جیب میں ڈال کر وہ خاموشی سے باہر نکل آیا۔
اس نے پہلی بار محسوس کیا کہ کسی اجنبی کی دعا انسان کے اندر وہ روشنی جلا دیتی ہے جو ہزار فانوس بھی نہیں جلا سکتے۔
بازار سے گزرتے ہوئے بوڑھا اسے دور ہی سے دیکھ رہا تھا۔
اس نے صرف اتنا کہا،
''قیمت جمع ہونا شروع ہو گئی ہے...''
سلمان نے رک کر پوچھا،
''قیمت کس چیز کی؟''
بوڑھے نے اپنی لرزتی ہوئی انگلی سے اس کے سینے کی طرف اشارہ کیا۔
''اس دل کی... جسے تم برسوں پہلے کہیں کھو آئے تھے۔''
سلمان نے بے اختیار اپنا ہاتھ سینے پر رکھ لیا۔ اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ دل صرف دھڑکتا نہیں، کبھی کبھی روتا بھی ہے۔
اس دن کے بعد بازار اس کی عادت بن گیا۔
صبح دفتر جانے سے پہلے وہ چند لمحے بوڑھے کے پاس ضرور بیٹھتا۔ دونوں کے درمیان کبھی لمبی گفتگو نہ ہوتی، مگر چند جملے ہی سلمان کے پورے دن کا رخ بدل دیتے۔
ایک روز اس نے بوڑھے سے پوچھا،
''بابا، آپ یہ کام کب سے کر رہے ہیں؟''
بوڑھے نے سامنے گزرتے ہوئے لوگوں کو دیکھا اور دھیرے سے بولا،
''جب سے لوگوں نے چیزوں کی قیمت تو یاد رکھی، مگر انسانوں کی قدر بھلا دی۔''
''اور کبھی کسی نے دل خریدا؟''
بوڑھے کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ آئی۔
''دل خریدنے والے کم ہوتے ہیں، بیٹا۔ زیادہ تر لوگ قیمت سن کر واپس چلے جاتے ہیں۔''
اسی اثنا میں ایک قیمتی گاڑی بوڑھے کے سامنے آ کر رکی۔ نفیس لباس پہنے ایک صاحب اترے، جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالی اور ہنستے ہوئے بولے،

"لو بابا! جتنے چاہو پیسے لے لو، ایک اچھا سا دل دے دو۔"

بوڑھے نے نوٹوں کی طرف دیکھے بغیر کہا،

"یہ بازار دولت کا ہے، محبت کا نہیں۔ یہاں نوٹ نہیں، نیت چلتی ہے۔"

وہ شخص طنزیہ ہنسا، نوٹ واپس جیب میں رکھے اور گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔

سلمان دیر تک اس گاڑی کو جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ چند ہفتے پہلے اگر وہ خود یہاں آتا تو شاید یہی حرکت کرتا۔

اسی شام وہ دفتر سے معمول سے پہلے گھر لوٹ آیا۔

بیٹا صحن میں اکیلا گیند سے کھیل رہا تھا۔

سلمان کو دیکھ کر وہ چونک گیا، جیسے کسی اجنبی کو دیکھ لیا ہو۔

"بابا... آپ آج اتنی جلدی؟"

سلمان نے پہلی بار مسکرا کر کہا،

"آج میں تمھارے ساتھ کھیلنے آیا ہوں۔"

بچے نے پہلے حیرت سے باپ کو دیکھا، پھر خوشی سے اس کے گلے لگ گیا۔

وہ شام گیند کھیلتے، ہنستے اور دوڑتے گزر گئی۔

رات کو بیوی نے آہستہ سے کہا،

"آج کئی برس بعد اس گھر میں بچوں جیسی ہنسی سنائی دی ہے۔"

سلمان خاموش رہا۔

اسے لگا، شاید گھر اینٹوں سے نہیں، آوازوں سے آباد ہوتے ہیں۔

اگلے دن جب وہ بازار پہنچا تو بوڑھے کی کرسی خالی تھی۔

پہلی بار۔

سلمان کا دل دھک سے رہ گیا۔

اس نے آس پاس کی دکانوں پر پوچھا۔

ایک کتاب فروش نے بتایا،

"بابا کی طبیعت رات اچانک خراب ہو گئی تھی۔ سامنے والی پرانی مسجد کے حجرے میں رہتے ہیں۔"

سلمان تیزی سے وہاں پہنچا۔

حجرہ چھوٹا سا تھا۔

ایک چارپائی، ایک مٹی کا گھڑا، چند کتابیں اور ایک پرانا کمبل۔

بوڑھا بخار میں تپ رہا تھا۔

سلمان نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔

بوڑھے نے بمشکل آنکھیں کھولیں اور مسکرا دیا۔

"آ گئے؟"

"آپ نے بتایا کیوں نہیں کہ آپ اکیلے رہتے ہیں؟"

بوڑھے نے آہستہ سے جواب دیا،

"جو دوسروں کے دل آباد کرتے ہیں، انہیں اپنے گھر کی ویرانی کا شکوہ نہیں ہوتا۔"

سلمان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

اسے پہلی بار محسوس ہوا کہ دنیا کا سب سے امیر انسان وہ نہیں جس کے پاس سب کچھ ہو، بلکہ وہ ہے جس کے جانے پر کسی کی آنکھ نم ہو جائے۔

☆☆☆☆☆

غزل

پتھر ہوں ، مجھ کو بھی رتبہ ، مل جائے شہکار کا
شرط ، کہ ضرب لگائے تیشہ ، دنیا سے فنکار کا

سورج بن کر ، میرا جلنا ، شغل ہوا بیکار کا
برف کی چادر میں لپٹا ہے پیکر اس کہسار کا

کھوئے چلے جاتے ہیں ، بن بن کر بڑھ بڑھ کر دائرے
دھیان کی لہر پہ ڈول رہا ہے ، بجرہ اک جھنکار کا

گاؤں میں بھی کب شہر کی یادیں بیٹھنے دیں گی چین سے
برگد کی چھاؤں بھی لگے گی ، سایہ اس دیوار کا

گلشن کا دھوکا ہوتا ہے ، سناٹوں کے شہر پر
گلی گلی پرتو ہے اس کی آہٹ کی مہکار کا

میری انا نے نہلایا ہے مجھ کو میرے خون میں
مجھ پہ ہوا ہے اول و آخر وار مری تلوار کا

ایک بگولہ گرد اڑاتا گزرا تھا اس سمت سے
دھول کا پھول ہوا ہے صحرا ، منظر ہے گلزار کا

باہر سے کتنا اونچا ، اندر سے کتنا پست ہے
میری طرح اس کا قد بھی ہے منت کش دستار کا

مجبوروں کی اندھیاری دنیا پر چٹکی چاندنی
ایک ضرورت بن کر ابھرا چاند مرے افکار کا

لیے لیے پھرتا ہوں خالد ، خالی آنکھیں کو بکو
ڈھونڈ لیا ہے میں نے انوکھا پیرایہ اظہار کا

خالد احمد

غزل

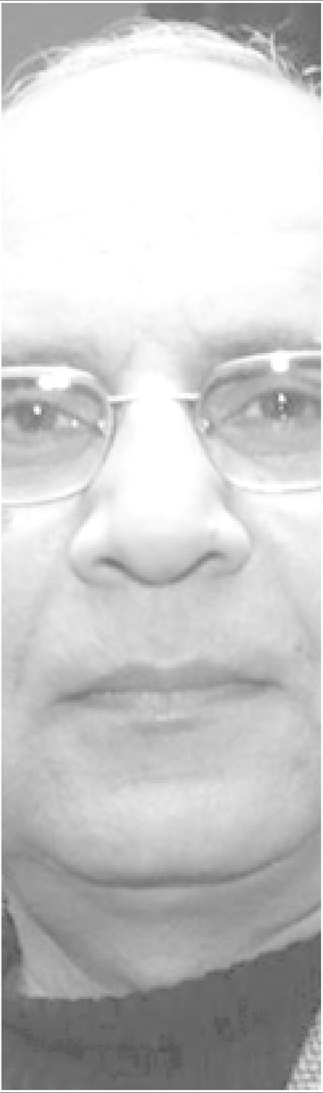

جو شوق دشتِ گماں سے گزر کے آتا نہیں
وہ نخلِ نورِ یقیں کا سراغ پاتا نہیں

وہ اپنی تیرہ نگاہی میں سر پٹختے پھریں
مرا چمکنا جنھیں ایک آنکھ بھاتا نہیں

اُس اعتقادِ خدا میں کوئی خرابی ہے
کہ دل سے خوف زمانے کا جو مٹاتا نہیں

وہ جس کے ہاتھ میں ہے ڈور کائناتوں کی
کسی کو راز مکمل کبھی بتاتا نہیں

دل آئنے میں ہیں محفوظ عمر بھر کے نقوش
مگر جو خوش نہیں آتے ہمیں دکھاتا نہیں

خود اپنے ساتھ ہے اب گفتگو، سو کیا پروا
کوئی جو آتا نہیں یا کوئی بلاتا نہیں

مری غزل میں کہاں بار پا سکے عالی
وہ سطر پہلے لہو جس کو گنگناتا نہیں

جلیل عالی

غزل

ہر پتھر مرمر نہیں ہوتا، ہر کوزہ ساغر نہیں ہوتا
ہر موسم میں بادِ بہاری ہر جھونکا صرصر نہیں ہوتا

ظاہر و باطن، فکر و عمل نے ذہنِ رسا پر کھول دیا ہے
دیکھنے والی آنکھ نہ ہو تو منظر بھی منظر نہیں ہوتا

ہر شاعر غالب نہیں ہوتا، ہر بت گر آذر نہیں ہوتا
ہر سر پر پگڑی نہیں ہوتی، ہر پگڑی میں سر نہیں ہوتا

ہم بھی وہ دو اشک بہا کر لہروں کا حصہ بن جائیں
جب تک پھول نہیں کھل اٹھتے، جب تک صحرا زر نہیں ہوتا

کب آنکھیں پرنم نہیں ہوتیں، کب جینا دوبھر نہیں ہوتا
کب اپنے خیمے نہیں جلتے، کب نیزے پر سر نہیں ہوتا

صرف محبت اور محبت اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے
جس راجہ کے روپ ہزاروں، وہ اعجاز کنور نہیں ہوتا

جس میں ہر دم خوف کے پہرے، ظلم و ستم کی آزاری ہو
انسانوں کے رہنے والا شیش محل بھی گھر نہیں ہوتا

غول ابابیلوں کے بہت ہیں، چونچوں میں کنکر بھی ہیں لیکن
دکھ تو یہی ہے سامنے والا دشمن کا لشکر نہیں ہوتا

تب تک زندہ رکھنا ہوگا سنتِ آلِ پیغمبر کو
جب تک آزادی کا پرچم زینتِ بام و در نہیں ہوتا

اعجاز کنور راجہ

غزل

تصویرِ جبر اپنے ہی ڈھب سے بناؤں گا
چہرے تمام مُہرِ بلب سے بناؤں گا

کب موم یا حدید و خشب سے بناؤں گا
مُوئے قلم سے عکس عجب سے بناؤں گا

منظر اگرچہ چند کُڈھب سے بناؤں گا
سچ کا مجسمہ مَیں ادب سے بناؤں گا

دی اطلاع جانے یہ کس نے غنیم کو
رستہ قلعے کا اُس کے عقب سے بناؤں گا

نقاد کر لیں دُور غلط فہمیاں، کہ مَیں
نام اپنا، اپنے نام و نسب سے بناؤں گا

آتا ہے یہ قرینہ مُجھے، دیکھنا کہ مَیں
تصویرِ چُپ کی شور و شغب سے بناؤں گا

انساں جو مر چکا ہے، مَیں اس کا مجسمہ
ناقابلِ یقین سبب سے بناؤں گا

تخلیق کا سلیقہ ہے کچھ مختلف مِرا
اب دِن بھی میں برادۂ شب سے بناؤں گا

اُس خامشی کا شور تو گونجے گا تا ابد
مَیں جس کا عکس شور و شغب سے بناؤں گا

پھر وہ کبھی غروب نہ ہو پائے گا دیکھنا
سورج اِک ایسا ملبۂ شب سے بناؤں گا

میرے سِوا کسی پہ نہ کُھل پائے گا کبھی
جو سلسلہ نسیم مَیں ربّ سے بناؤں گا

نسیمِ سحر

غزل

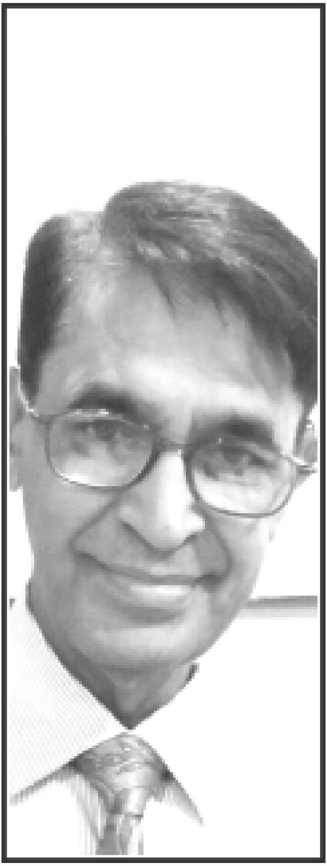

پرندہ بھی خلافِ طبع یکسر چھوڑ دیتا ہے
وہ چُگ لیتا ہے دانہ اور کنکر چھوڑ دیتا ہے

مکاں بھی تنگ پڑ جاتا ہے بچوں کو جواں ہو کر
اگر ہم گھر نہ چھوڑیں تو ہمیں گھر چھوڑ دیتا ہے

تمھارے ساتھ مل کر بھی یہ پہلو میں نہیں رہتا
نہ جانے کون ہے جو دل کو باہر چھوڑ دیتا ہے

اسی کے ہاتھ سے آتشکدے کی رسم بدلی ہے
جلا دیتا ہے سب، کاغذ کے پیکر چھوڑ دیتا ہے

محبت میں وہ تکمیلِ محبت کا نہیں قائل
ہمیشہ راستے بھر ساتھ چل کر چھوڑ دیتا ہے

اندھیرے میں تسلسل سے بھی وہ رہنے نہیں دیتا
بجھا کر دل چراغوں کو منور چھوڑ دیتا ہے

صفدر صدیق رضی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کسی طرح نہ مرے دل کا قفل کھل پایا
ہوا نہ مجھ سے اِسی ایک درد کا چارا

غزلیں

دل ہے کعبے کی طرف ہاتھ ہیں دُنیا کی طرف
نصف صحرا کی طرف نصف ہُوں دریا کی طرف

ہوشمندوں میں تو سب میر کے دلدادہ ہیں
جو ہیں سودائی وہ ہوتے رہیں مرزا کی طرف

ہمیں تسبیح و مصلاً کا سبق دیتے ہیں
خود لپکتے ہیں مگر ساغر و مینا کی طرف

عین ممکن ہے سیادت کی گھڑی ہاتھ آ جائے
دیکھیے گھوم کے پھر عہدِ گزشتہ کی طرف

شاید آ جائے کوئی بچھڑی ہُوئی موجِ رواں
رُخ کیے بیٹھا ہُوں سُوکھے ہُوئے دریا کی طرف

خاور اعجاز

ہم بھی اوروں کے ہُوئے شانہ بشانہ شامل
اُس نے جیسے ہی کِیا دام میں دانہ شامل

اِک زمانہ کبھی اِک پل میں گذر جاتا ہے
ایک پل میں کبھی ہوتا ہے زمانہ شامل

جام جم سے نہیں کم میرے جگر کے ٹکڑے
کرچی کرچی میں ہے اِک آئنہ خانہ شامل

داستاں یونہی نہیں ہو گئی اِتنی دلچسپ
اِس کے بھیتر ہے ہمارا بھی فسانہ شامل

اِک تسلسل چلا آتا ہے ازل سے خاورؔ
ہر نئے عہد میں ہے عہد پرانا شامل

غزل

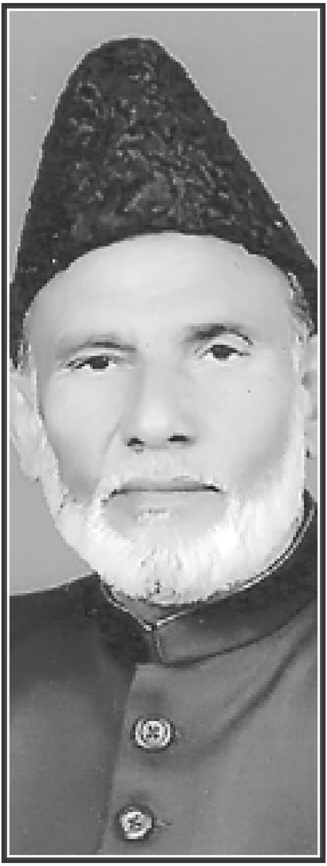

میں چل رہا ہوں محتاط چال آٹھوں پہر
وہ بُن رہا ہے محبت کے جال آٹھوں پہر

خوشامدوں پہ مسلسل ضمیر کے چرکے
اٹھاؤں جھوٹ کی کب تک میں ڈھال آٹھوں پہر

میں جی رہا ہوں ابھی تک کہ پی رہا ہوں ابھی
محبتوں کا یہ آبِ زلال آٹھوں پہر

وہ جس کی شہ پہ اٹھائے محل بلندی کے
اُٹھا رہا ہے وہی اب سوال آٹھوں پہر

تجھے بھی کیا کبھی میری کمی ستاتی ہے
مجھے تو رہتا ہے تیرا خیال آٹھوں پہر

قدم قدم پہ میں ساجد بھٹک بھٹک جاتا
سنبھالتا ہے فریدی جمال آٹھوں پہر

شریف ساجد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اپنی آواز تک اب کان نہیں سن پاتے
ایک پل کو بھی میسر نہیں تنہا ہونا

غزل

طاقت وار کے آگے کون کھڑا ہو گا
جو بھی کھڑا رہے گا، وہی بڑا ہو گا

آنکھیں پانی میں بہتی جاتی ہوں گی
دریا کی لہروں پر ایک گھڑا ہو گا

وہ، جو اپنی جان کی بازی ہار گیا
اپنے مؤقف پر وہ شخص اڑا ہو گا

کیا جانیں وہ اچھے وقتوں والے لوگ
ہم جیسوں پہ کیسا وقت کڑا ہو گا

جو کہتا تھا، اپنی جنگ لڑوں گا بس
وہ بھی آج پرائی جنگ لڑا ہو گا

ہونٹ ثمر آور، رُخسار گلاب ہوئے
بوسہ شامِ وصل نے کہیں جڑا ہو گا

لوگ جہاں آنکھیں ٹھنڈی کرتے ہوں گے
ہر اِک گلی میں ایسا ایک تھڑا ہو گا

مجھے فقط رونا آتا تھا، جانِ انیس!
رونے سے ہر ایک گناہ جھڑا ہو گا

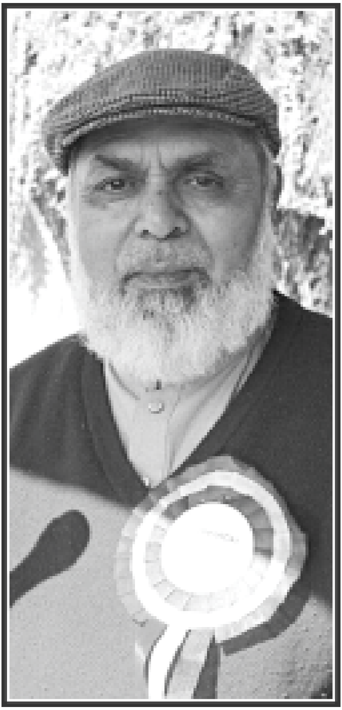

محمد انیس انصاری

غزل

اک دوسرے کو چاہنے والے نہیں رہے
میں سوچتا ہوں، سوچنے والے نہیں رہے

لے کر کہاں پہ جائیں یہ دل کا حسیں محل
دولت زمیں پہ بانٹنے والے نہیں رہے

بیٹھے بٹھائے فاصلے کٹتے نہیں کبھی
پنچھی فضا کو چیرنے والے نہیں رہے

گہرائیوں سے گوہرِ نایاب کیا ملیں
اب پانیوں میں تیرنے والے نہیں رہے

کیوں چہرہ داغ داغ ہے میرے جناب کا
کیا راستے میں آئینے والے نہیں رہے

جنگل اُداس ہو گیا مجنوں کی موت پر
صحرا نورد ڈھونڈنے والے نہیں رہے

کیسے دعاؤں میں ہو بھلا اب کوئی اثر
راتوں کو اُٹھ کے جاگنے والے نہیں رہے

زلفیں رُخِ حیات کی، بکھری ہیں اس طرح
اِن اُلجھنوں کو کھولنے والے نہیں رہے

بے کیف ہو کے رہ گئی اقبال زندگی
اب پیار سے وہ دیکھنے والے نہیں رہے

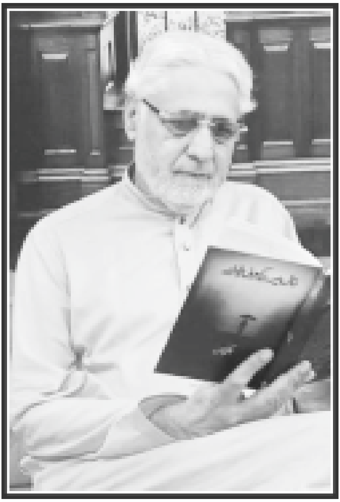

اقبال سروبہ

غزل

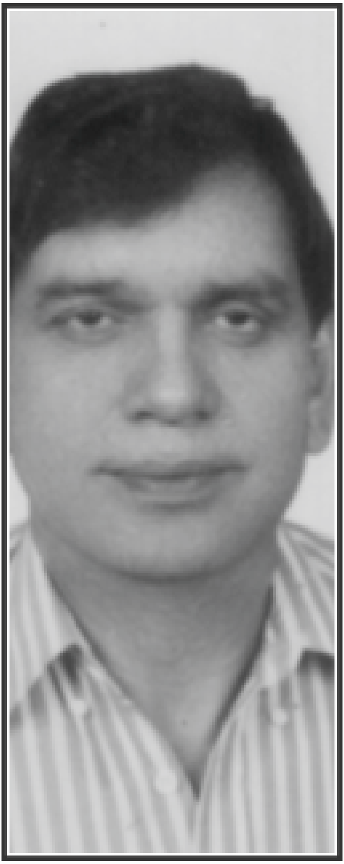

میں رائیگانی سے نکلا، کسی ٹھکانے لگا
گماں کے دشت سے، شہرِ نفس کو جانے لگا

یہ تلخ ذائقہ، کھلنے لگا تھا لفظوں میں
وہ نفی مانگتا بیٹا جو کچھ کمانے لگا

عزیز تر ہے یہ مہمانِ دلربا، لیکن
میں میزبانی سے کیوں ہاتھ اب اٹھانے لگا

وہ رکھنے والا ہے چاکِ فنا پہ جیسے مجھے
وہ میری خاکِ بدن کو بہت سجانے لگا

بلاوے بھیجتا مرطوب موسموں کا سفر
اک اور ہجر مجھے پھر سے آزمانے لگا

بچا کے خود کو چوراہے سے میں نکل آیا
وہ اک تماشا تعلق کو جب بنانے لگا

قیوم طاہر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دربدر گریہ کناں، طالبِ درماں کیوں ہیں؟
تیرے عشاق گرفتارِ غمِ جاں کیوں ہیں؟

غزل

راحت سرحدی

چھوڑ کر دو جہاں بنانا پڑا
اپنا کون و مکاں بنانا پڑا

جب کوئی مُنفرد زمیں سوجھی
اک نیا آسماں بنانا پڑا

مختصر تھی یہ کائنات بہت
دوسرا اک جہاں بنانا پڑا

ہونٹ جب سی دیے گئے تو پھر
زخم کو ہی زباں بنانا پڑا

تنگ آ کر بتوں سے آدمی کو
ربِ وہم و گماں بنانا پڑا

بجلیوں کی نظر میں تھا وہ شجر
آشیانہ جہاں بنانا پڑا

خود کو تھوڑا سا چٹ پٹا اور ترش
بہرِ شیریں لباں بنانا پڑا

لہر جب ناؤ بن گئی راحت
ابر کو بادباں بنانا پڑا

غزلیں

شوکت محمود شوکت

جانے والی ہے مری جان بھی، کھونے والی
اب نہیں مجھ سے محبت کوئی ہونے والی

وہ کرے بھی تو مداوائے دلِ محزوں کیا؟
جس نے دیکھی نہیں آنکھیں کبھی رونے والی

روز کٹتی نظر آئیں گی سروں کی فصلیں
رسم ، باقی ہے اگر نفرتیں بونے والی

میں نے سوچا تھا محبت نہ کروں گا، لیکن
دل مرا لے ہی گئی پھول پرونے والی

جن کی خواہش ہے ترا کوئی قصیدہ لکھیں
ان کی سوچیں ہیں ابھی مشک سے دھونے والی

کیسے منصوبے بھلا اور تدبّر کیسا
ہو کے رہتی ہے یقیناً جو ہو ہونے والی

اب تو آنکھوں میں کٹا کرتی ہیں راتیں شوکت
عشق نے چھینی طبیعت مری سونے والی

آپ اور وقتِ شام چہ معنی؟
اے گلِ لالہ فام! چہ معنی؟

پیش آئی کوئی ضرورت کیا؟
مسکرا کر کلام ، چہ معنی؟

پاس بیٹھو ، کبھی جو فرصت ہو
دور سے یہ سلام ، چہ معنی؟

اپنی دنیا میں مست رہتے ہیں
ہم فقیروں سے کام چہ معنی؟

تیرا شاعر جو خاص تیرا تھا
ہو گیا ہے وہ عام ، چہ معنی؟

مجھ سے نفرت سہی ، مگر میرا
تیرے ہونٹوں پہ نام ، چہ معنی؟

دورِ جشنِ طرب تمام ہوا
شوکت و احتشام ، چہ معنی؟

غزلیں

افتخار شاہد

جانا ہے اگر شہر سے سامان اٹھائے
دیوانہ کسی دشت کا امکان اٹھائے

سچ پوچھ تو ہیں ہجر سے کچھ درجہ زیادہ
جو ہم نے ترے وصل میں نقصان اٹھائے

بھیجے ہیں سدا جس نے خزاؤں کے سندیسے
اب وہ بھی چلا آتا ہے گلدان اٹھائے

سامان تو لے آئیں گے دربان وغیرہ
ملت کے گناہوں کو تو سلطان اٹھائے

اک عمر ترے وصل کی حسرت میں گزاری
اک عمر ترے خواب کے احسان اٹھائے

یوں ہم کو جھڑکنے کی ضرورت نہیں شاہد
چپ چاپ چلے جائیں گے ارمان اٹھائے

خوب سے خوب نشانے بھی تو لگ سکتے ہیں
سانپ کے ہاتھ خزانے بھی تو لگ سکتے ہیں

یاد کے ساتھ گزاری بھی تو جا سکتی ہے
بھول جانے میں زمانے بھی تو لگ سکتے ہیں

یہ مری آنکھ کی لالی بھی تو مر سکتی ہے
یہ ترے خواب ٹھکانے بھی تو لگ سکتے ہیں

جیسے بنتا ہوں میں شعروں میں کہانی یارو
سننے والوں کو فسانے بھی تو لگ سکتے ہیں

تم جو ہر وقت ستانے میں لگے رہتے ہو
یار لوگوں کو بہانے بھی تو لگ سکتے ہیں

آٹھواں رنگ جو مل جائے کسی روز ہمیں
تیری تصویر بنانے بھی تو لگ سکتے ہیں

اس قدر کان کے کچے نہیں ہوتا شاہد
لوگ بے پر کی اڑانے بھی تو لگ سکتے ہیں

غزل

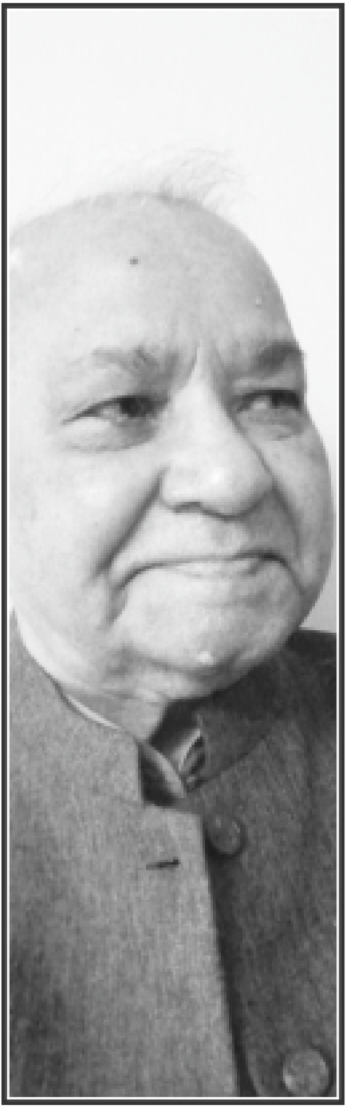

اجمل اعجاز

زخم دل ، زخم جگر دیکھا ہے
اُس کا اک کار ہنر دیکھا ہے

ہر طرف اُس کی ہے جلوہ ریزی
جس طرف حد نظر دیکھا ہے

کون بچ پائے گا ان آنکھوں سے
کس نے وہ تیر نظر دیکھا ہے

فیصلہ تھا کہ نہیں دیکھیں گے
پر بہ انداز دگر دیکھا ہے

تاب نظارہ نہ تھی آنکھوں کو
بند پلکوں سے مگر دیکھا ہے

آنکھ بھر کر کبھی دیکھا نہ اسے
ہم نے بس ایک نظر دیکھا ہے

شکل و صورت ہماری جیسی ہے
خواب میں نور نظر دیکھا ہے

دل ہے ویران سرائے اعجاز
کب یہ آباد نگر دیکھا ہے

غزل

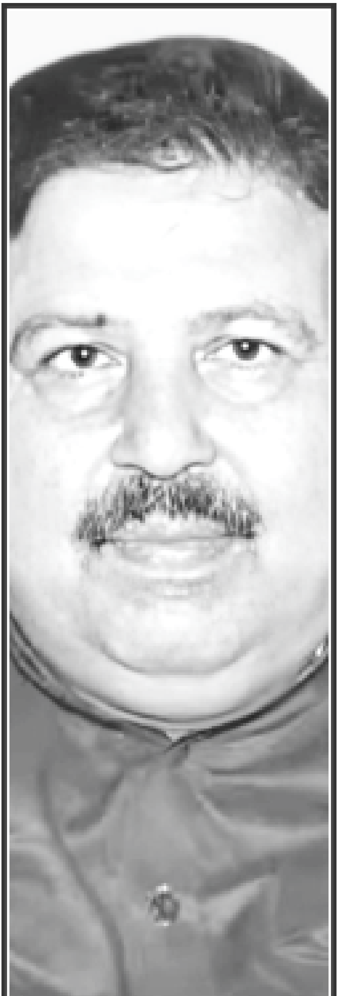

بجز اس کھال کے گھر میں ہی پوری گائے رکھتے ہیں
میاں ہم صاحب الرائے ہیں اپنی رائے رکھتے ہیں

بڑے امکاں روشن ہیں ہماری کامیابی کے
ہم اپنے حلقہ احباب کو ٹرخائے رکھتے ہیں

زمانہ عینی شاہد ہے ہماری کوڑھ مغزی کا
جہاں پہ عرض کرنی ہو وہاں فرمائے رکھتے ہیں

ہماری آرزو یہ ہے کہ ہم اس زلف سے الجھیں
مگر وہ گفتگو میں ہی ہمیں الجھائے رکھتے ہیں

وہ خوش خوراک اپنے سامنے کیا کیا نہیں رکھتے
ہمارے سامنے تو خالی خولی چائے رکھتے ہیں

غنیمت ہے ابھی تک یہ ہمارا منہ تو، باہر ہے
کہ پاؤں قبر میں اکثر ہی ہم لٹکائے رکھتے ہیں

ہمیں، بہلا رہے ہیں عید پہ بھی نان چھولوں سے
خیال اس مہ جبیں کا سب کے سب ہمسائے رکھتے، ہیں

مسعود احمد

غزل

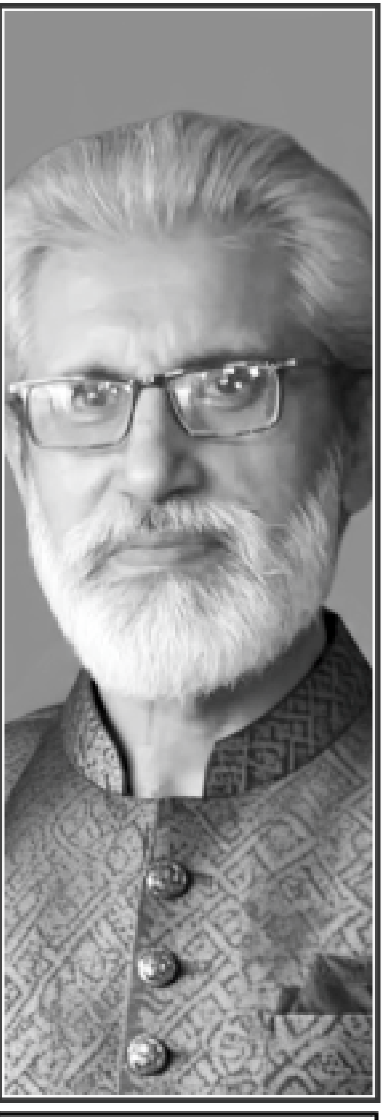

افضل ہزاروی

ہم فلک سے اتارے گئے
اپنی لغزش سے مارے گئے

سمجھو ہاتھوں سے منزل گئی
حوصلے جب تمہارے گئے

یارو اب تک جو گزرے ہیں دن
جانے کیسے گزارے گئے

ایسا گھیرا ہے گرداب نے
دسترس سے کنارے گئے

اب جوانی ہے اور الجھنیں
شوخ بچپن ، غبارے گئے

وصل میں یاد رکھنا انہیں
فرقتوں میں جو مارے گئے

دل ہمارا وہیں رہ گیا
جب کبھی ہم ہزارے گئے

آنکھ اب تو لگا لو ذرا
دیکھو افضل ستارے گئے

غزل

سعداللہ شاہ

حیرت نہیں کہ لوگ یہاں کیوں بدل گئے
سورج ڈھلا تو ساتھ ہی سائے بھی ڈھل گئے

بادِ صبا کے سامنے خوشبو کی بے بسی
کچھ پھول جو کہ رنگ کی گرمی سے جل گئے

حضرت بڑے خلاف تھے دربار کے مگر
تمغہ ملا تو بھاگتے کیوں سر کے بل گئے

کوئی تو غیب میں ہے جو آتا نہیں نظر
ٹھوکر لگی کسی کو مگر ہم سنبھل گئے

فردا کا ایک خوف ہمیشہ تھا سامنے
لمحات جو گزر گئے سمجھو کہ ٹل گئے

بارش ہو یا کہ گریہ ہو بے ساختہ ہے سب
یعنی کہ درد صبر کی حد سے نکل گئے

جن کو اثاثہ جانتے تھے لوگ سعد جی
وہ تو وطن کے سارے اثاثے نگل گئے

غزل

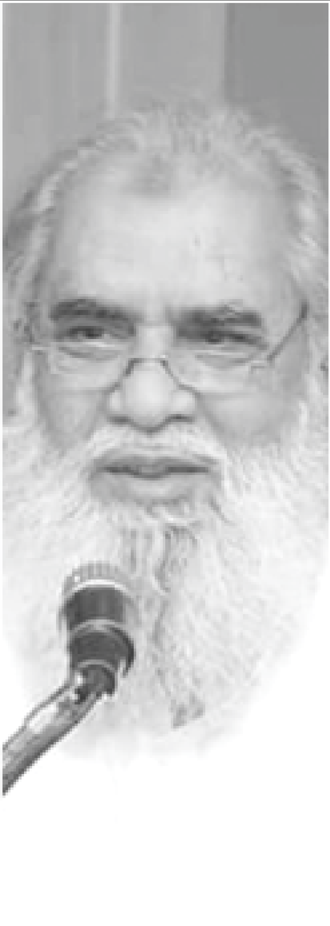

اکرم ناصر

سڑک کے بیچ میں لاشہ جو اک پڑا ہوا تھا
سنا رہا تھا جو قصہ بہت سنا ہوا تھا

وہ آج پنجرے پہ بیٹھا رہا ہے سارا دن
پرندہ قید سے کل شام جو رہا ہوا تھا

غضب خدا کا حویلی کا کیمرہ تھا بند
گلی کے موڑ پہ جو بلب تھا بجھا ہوا تھا

اسے خیال بھی آیا نہیں مرا کہ میں
اسی کے واسطے اس شہر میں رکا ہوا تھا

کیا نہ غور کسی نے بجز مجید امجد
نجانے کب سے شجر موڑ پہ جھکا ہوا تھا

میں اپنے ہاتھ سے لکھنے کی ضد میں مارا گیا
خدا نے فیصلہ تو ہاتھ پہ لکھا ہوا تھا

بڑی بہن بھی تو ماں ہی کا روپ ہوتی ہے
میں ماں کے روپ سے اس روز ہی جدا ہوا تھا

ابھی سنبھالی نہیں جا رہی تھی خلقت شہر
نیا نیا وہ زمیں پہ ابھی خدا ہوا تھا

غزل

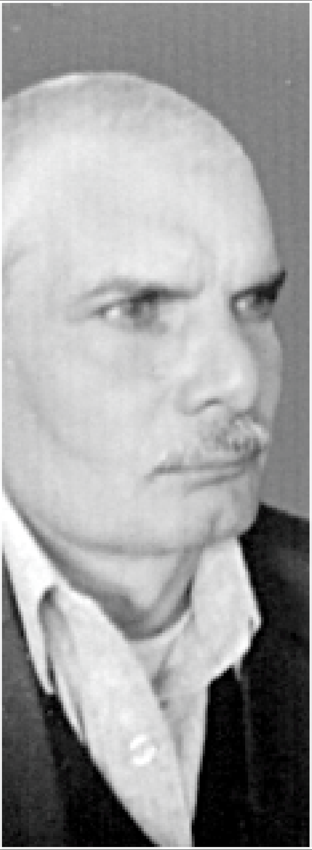

فکرِ بو ذر اب جوانوں میں نہیں
باغیانہ پن ترانوں میں نہیں

پوچھتی ہے تجھ سے گلشن کی فضا
فاختائیں آشیانوں میں نہیں

ناز تھا جن پر در و دیوار کو
لوگ ایسے اب مکانوں میں نہیں

جاگ جاتے خوابِ غفلت سے سبھی
جوش تیرے جو ترانوں میں نہیں

کرگسوں کو اب اڑائیں کس طرح
حوصلے یہ باغبانوں میں نہیں

جسارت خیالی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چاند کیا جل بجھے ستارے بھی
ہو گئے خوں یہ استعارے بھی

غزل

دیکھنے میں جو لگے شام و سحر کے ساتھی
وہ تو ساتھی تھے فقط راہ گزر کے ساتھی

اب کہاں ہیں وہ مرے اشک پرونے والے
اب کہاں ہیں وہ مرے دیدۂ تر کے ساتھی

تم کو دیکھا تو مرے دل نے کہا تم ہی تو ہو
زخمِ دل، زخمِ جگر ، زخمِ نظر کے ساتھی

اس میں کیا شک زمن افروز ہمارا ہے کلام
ہم بھی رہتے ہیں مدام اہلِ نظر کے ساتھی

میں اکیلی ہی چلی جانبِ منزل افروز
ہم سفر ٹھہرے مرے صرف سفر کے ساتھی

افروز رضوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بند دروازہ تھا خالد ، یا عبادت گاہ تھی
اس کے در پر سارے بے کس، سارے بے گھر سو گئے

غزل

اشک پارہ ہوں اور تمہارا ہوں
غم کا دھارا ہوں اور تمہارا ہوں

بے نظارا ہوں اور تمہارا ہوں
آشکارا ہوں اور تمہارا ہوں

مجھ سے ہے نامِ عشق قیس کے بعد
استعارہ ہوں اور تمہارا ہوں

تم سمندر ہو جو سبھی کا ہے
میں کنارا ہوں اور تمہارا ہوں

تم منافع ہو پر کسی کا ہو
میں خسارا ہوں اور تمہارا ہوں

تم مرے ہو مگر میرے نہ ہوئے
میں تمہارا ہوں اور تمہارا ہوں

تم ادھورے ہو پھر بھی میرے ہو
میں تو سارا ہوں اور تمہارا ہوں

جیت جس کی ہوئی وہ کس کا ہوا؟
میں تو ہارا ہوں اور تمہارا ہوں

تم حقیقت کا ایک رازِ نہاں
میں اشارہ ہوں اور تمہارا ہوں

لوگ کہتے ہی عشق کا ساگر
بے کنارا ہوں اور تمہارا ہوں

محمد سلیم ساگر

غزل

کسی بھی بات کو سننے کا حوصلہ رکھنا
پھر اس کے بعد کسی سے مکالمہ رکھنا

خود اپنے آپ سے ڈرتے ہیں قافلے والے
قدم بڑھاتے ہوئے ان سے فاصلہ رکھنا

حسین ایک ہی تھا کربلا کے مقتل میں
حسین کے لیے مختص تو کربلا رکھنا

تو چاہتا ہے روایت چلے قیامت تک
شہادتوں کا کسی طور سلسلہ رکھنا

جو سچ کے ساتھ رہے خیمہ زن، شہید ہوئے
یزید سے نہ کبھی تم معاملہ رکھنا

اٹھائے ایڑھیاں جتنے بلند قامت ہیں
تو اپنے آپ کو ان سے علاحدہ رکھنا

جو رہنما ہیں، وہی راہزن ہیں رستے کے
اکیلے چلنا، کبھی تم نہ قافلہ رکھنا

نہ ڈرنا وقت کی ان تیز دھار لہروں سے
خدا جو بنتے ہیں، کیا ان کو ناخدا رکھنا

صدق شعار نہیں، سچ کا پھر بھی دعویٰ ہے
تم ان کے سامنے اک بار آئنہ رکھنا

تجھے ڈرائیں گے غافر زباں دراز بہت
سماعتوں کو ذرا ان سے ماورا رکھنا

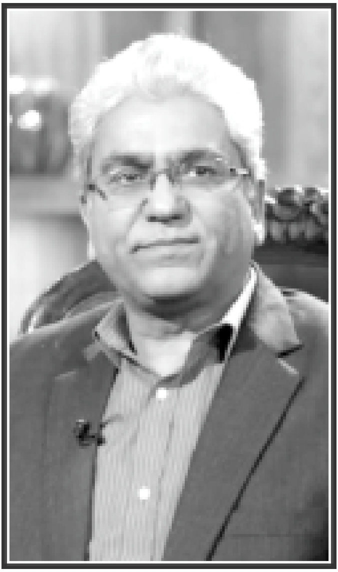

غافر شہزاد

غزل

گو ایک پل مرے دل سے گئی وہ تھی بھی نہیں
گئی تو ایسے کہ جیسے کبھی وہ تھی بھی نہیں

گو اس کے بعد کئی سال تک میں زندہ رہا
مگر وہ موت ہی تھی، زندگی وہ تھی بھی نہیں

نہ جانے کس لیے پتھر گرے میرے سر پر
جہاں کھڑا تھا میں اس کی گلی وہ تھی بھی نہیں

یہ دعویٰ کس نے کیا شاعری کے بارے میں
یہ شاعری نہیں ہے، شاعری وہ تھی بھی نہیں

جو کل تلک تھی مگر آج دور دور سے ہے
وہ دوستی تھی کہاں، دوستی وہ تھی بھی نہیں

جہاں سے مجھ کو ترے حکم پر اٹھایا گیا
ستم تو یہ ہے کہ محفل تری وہ تھی بھی نہیں

عجیب بات ہے پھر بھی عجیب بات نہیں
وہ اجنبی نہ لگی، اجنبی وہ تھی بھی نہیں

میں عارضی ہوں مجھے ملکیت کا حق کیسا
جو چیز اپنی لگی تھی مری وہ تھی بھی نہیں

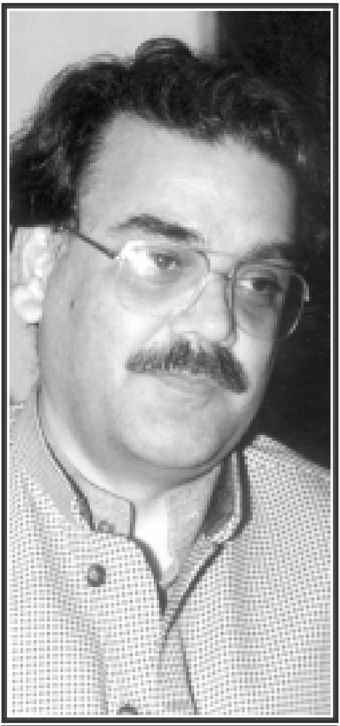

شاہنواز زیدی

غزل

ازل سے نکتہ وروں کو ہے جستجوئے ابد
ذرا سا خاک میں جھانکو، یہی ہے بوئے ابد

یہ کاروانِ تماشا بچھاتے پھرتے جمال
وہ قافلہ ہے حقیقی چلا جو سوئے ابد

ازل نے ایسی بلا خیزیاں زمیں کو دیں
کہاں ہے یاد کسی کو، کہاں ہے جوئے ابد

گلی میں اب کہ ازل کو کہیں پناہ نہیں
بچا ہے ایک ہی کوچہ، وہ ایک کوئے ابد

زمیں اپنے گناہوں پہ بے طرح سرشار
کہ لامکان سے مکاں تک اٹا ہے روئے ابد

فرخندہ شمیم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

گُل سے یا گلستاں سے ملتا ہے
رنگ کو نم کہاں سے ملتا ہے

غزل

مجھ پہ کھلتی ہی نہیں اپنی کہانی صاحب
دھند میں جیسے کوئی شام سہانی صاحب

کیوں نہیں آئے وہ راہوں کے شجر پوچھتے ہیں
پوچھے ہے چمپا کلی، رات کی رانی صاحب

اُس گھنی چھاؤں میں بیٹھے ہیں ملنگی بن کر
چھت محبت کی جہاں آپ نے تانی صاحب

آپ کی باتوں میں پربت کے سریلے نغمے
آپ کی چال میں دریا کی روانی صاحب

خواب تو خواب ہیں آنکھوں میں کہاں ٹکتے ہیں
دیں مجھے اور کوئی اپنی نشانی صاحب

چشمِ نم دیکھ کے غمگین نہ ہو جایئے گا
کچھ نہیں، ہے مری آشاؤں کا پانی صاحب

خود بخود ذہن میں صورت سے کوئی بنتی ہے
جب بھی آتی ہے کوئی یاد پرانی صاحب

شبہ طراز

غزل

چھاگل دریا پر نہیں بھرتے
ہم سے دل کے تھر نہیں بھرتے

شہر کی گلیاں بھیڑی ہوں تو
چوپایوں میں ڈر نہیں بھرتے

باغ کا کوئی وعدہ جیسے
بارہ دری کے در نہیں بھرتے

چٹھی ہونٹ اخروٹ ہی لکھیں
نامہ بر کا گھر نہیں بھرتے

نہیں کسمبڑا کپڑا کھلتا
سبھی کپاسی سر نہیں بھرتے

بھر جاتی ہے بارش کوزے
لیکن کوزہ گر نہیں بھرتے

نین ترے بیروں کا موسم
بیری جادوگر نہیں بھرتے

بھکشوؤں کے درشن مشکیزے
بھر جاتے ہیں پر نہیں بھرتے

تنویر قاضی

غزلیں

حیرت زدہ دریا کے کنارے پہ کھڑا ہوں
بچھڑے ہوئے پانی کی ادا دیکھ رہا ہوں

تجھ لمس کی حدت ہے مجھے یاد ابھی تک
میں گرچہ خد و خال ترے بھول گیا ہوں

اک ایسی نگہ ڈال کہ سانس آئے مجھے بھی
مدت سے ترے خواب کے پہلو میں پڑا ہوں

کیا کیا نہ مری خاک پریشاں پھری لیکن
دنیا کو یہ لگتا ہے سہولت سے بنا ہوں

بیتی ہوئی صدیوں میں مرا ذکر نہیں ہے
میں تازہ زمانوں کے صحیفوں میں لکھا ہوں

مدت ہوئی دیمک نے عصا چاٹ لیا ہے
اک دھج سے تجھے پھر بھی کھڑا دیکھ رہا ہوں

مرجھائی ہوئی شاخ بھی پھولوں سے لدی ہے
کب مجھ کو خبر تھی کہ سعید ایسا ہرا ہوں

سعید راجہ

حبس موسم کی حمایت بھی مجھے کرنی ہے
سانس لینے کی مشقت بھی مجھے کرنی ہے

رات دن کارِ جہاں بھی ہیں نبھانے مجھ کو
اک پری وش سے محبت بھی مجھے کرنی ہے

خود کو دینی ہے اذیت بھی مسلسل میں نے
اور پھر خود سے شکایت بھی مجھے کرنی ہے

اس کے ہونے کے دلائل بھی مجھے لانے ہیں
اپنے ہونے کی وضاحت بھی مجھے کرنی ہے

خود کو رکھنا ہے درندوں کی نگہبانی میں
اور پھر اپنی حفاظت بھی مجھے کرنی ہے

اپنے ہی خوف کے ہاتھوں سے بنانے ہیں خدا
عمر بھر ان کی اطاعت بھی مجھے کرنی ہے

در و دیوار بھی میں نے ہی بنانے ہیں یہاں
خواب کے شہر سے ہجرت بھی مجھے کرنی ہے

ساری تخریب کا ذمہ بھی مرے سر ہے سعید
اس پہ تعمیر کی ہمت بھی مجھے کرنی ہے

غزلیں

رخشندہ نوید

خوف کا شہر ہے اور شہر بدر ہوتے ہی
مار ڈالوں نہ کسی کو مَیں نڈر ہوتے ہی

کُھل کے جینے میں یہی خوف، خلل ڈالتا ہے
رات اک اور بھی ہے رات بسر ہوتے ہی

اِن پرندوں کا کوئی اور بھی ہوتا ہے پیام
جاگ تو جاتی ہوں ہر روز سحر ہوتے ہی

میرے اندر سے کوئی جھوم کے نکلا باہر
تیرے اس شہر میں آنے کی خبر ہوتے ہی

میں بھی دانوں سے بھری تھالی اٹھائے نکلی
شور سے بھر گیا دالان سحر ہوتے ہی

ڈر یہی رہتا ہے ٹہنی کو جواں ہونے پر
کاٹ کر پھینک نہ دے کوئی شجر ہوتے ہی

کسی کی یاد ہے ماہ و نجوم کی صورت
کہ میں اکیلی بھی ہوں اک ہجوم کی صورت

یہ کیسے اجڑے ہوئے شہر میں کھڑی ہوں میں
کہ فاختہ بھی لگے مجھ کو بوم کی صورت

کہاں ہے فرق کسی کے بھی ناک نقشے میں
ہے ایک جیسی خصوص و عموم کی صورت

شرارِ ہجر کی حدت سبھی کے چہروں کو
جلا کے راکھ نہ کر دے سموم کی صورت

نہ کر سکے گی مجھے ختم بار بار یہ موت
طلوع ہوتی رہوں گی نجوم کی صورت

مجھے دوام کی اس شکل میں نہیں رہنا۔۔
نگر میں اڑتی ہوئی ایک دھوم کی صورت

سفید رنگ پرندوں کا کس طرف ہے قیام
ہوئے ہیں جمع فلک پر ہجوم کی صورت

کبھی نہ ہوگا فراموش حافظے سے مرے
تو میرے دل پہ اترنا علوم کی صورت

غزلیں

محمد افضال انجم

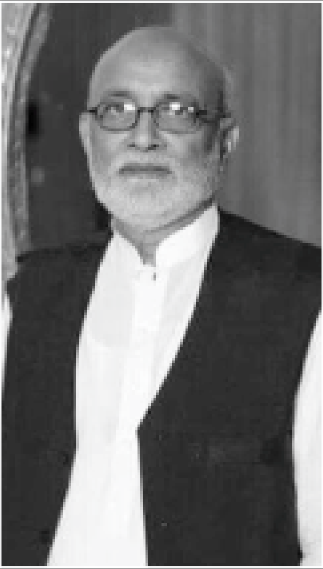

اب کے اس صحرا کی زمیں سے رنگ یہ کیسے پھوٹے
کچے پکے اجلے گہرے رشتے ناطے ٹوٹے

روپ نگر کے سنگی ساتھی چھوڑ کر ایسے بھاگے
رہتے سہتے سانجھ تعلق ٹوٹے غم سے چھوٹے

وصل، محبت، پیار، وفا، اخلاص، مروت الفت
سب ہیں پرانی ریت کی باتیں سب افسانے جھوٹے

وقت پرائی ڈال پہ بیٹھا اک انجان پکھیرو
آج اس شاخ پہ کوکو بولے کل کسی اور کے بوٹے

رنگ برنگی الفت نفرت کھولے بھید پرانے
دامن جھاڑو دور رہو کچھ اور نہ اب یہ لوٹے

منزل منزل گھوم کے دیکھا پریم کٹھا ہے ایک
دل کا بھید جو کھول دیا تو سمجھو کرم ہی پھوٹے

ہجر سے اپنا رشتہ ناطہ گہرا، پکا محکم
ایک یہی ہے ضبط و تعلق ساتھ نہ جس سے چھوٹے

من کب چاہے یاد سے اس کی ہٹ کر جینا مرنا
یاد ہی اس کی ظالم ہے جو من کے چین کو لوٹے

بدلی بدلی سی نظر دیکھ کے رونا آیا
کیا وہی ہے یہ نگر دیکھ کے رونا آیا

جس کو اصرار تھا دستار ہو میرے سر پہ
اس کے کاندھوں پہ نہ سر دیکھ کے رونا آیا

کل بٹھاتا تھا زمانہ جسے سر آنکھوں پہ
آج اسے خاک بہ سر دیکھ کے رونا آیا

میں نے کل جس پہ ترے نقش قدم دیکھے تھے
سونی وہ راہ گزر دیکھ کے رونا آیا

جس کو اوجھل ہوئے آنکھوں سے زمانہ بیتا
آج اسے بار دگر دیکھ کے رونا آیا

یہ نہ معلوم تھا کہتے ہیں محبت اس کو
اپنی آہوں میں اثر دیکھ کے رونا آیا

جن کے دیکھے سے پگھل جاتے تھے لوہے کے وجود
آج ان آنکھوں میں ڈر دیکھ کے رونا آیا

وہ جو کاٹی تھی بہت رو کے بڑی مشکل سے
یہ ہے اس شب کی سحر دیکھ کے رونا آیا

غزل

خالدہ انور

ایک اُمید کہ موہوم ہوئی جاتی ہے
خواہشِ زیست بھی معدوم ہوئی جاتی ہے

یہ زمیں امن سے محروم ہوئی جاتی ہے
یاں فضا ساری ہی مسموم ہوئی جاتی ہے

تیری ہر بات جو مرقوم ہوئی جاتی ہے
جانے کیوں خود سے ہی منظوم ہوئی جاتی ہے

جس سے نفرت ہے، اُسی سے ہے محبت بھی مجھے
یہ مری ذات تو مقسوم ہوئی جاتی ہے

شہرِ دل ، شہرِ تمنا کی ہر اک راہ گزر
تیرے ہی نام سے موسوم ہوئی جاتی ہے

اِس تعلق کو نہیں حاجتِ اظہارِ بیاں
اب تو خاموشی ہی مفہوم ہوئی جاتی ہے

شمعِ غم ہجر زدہ اشک فشانی سے تری
بزمِ غم اور بھی مغموم ہوئی جاتی ہے

غزل

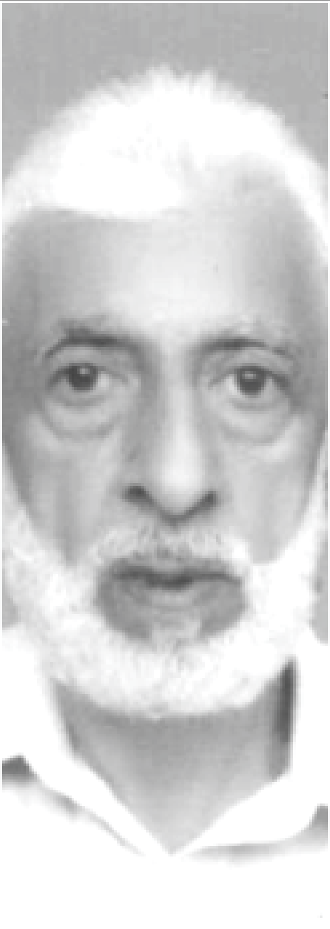

آگیا کونسے میں گاؤں میں
جسم جلنے لگا ہے چھاؤں میں

وہ ترا درد بن کے رہ جانا
وہ مرا دیکھنا خلاؤں میں

چھوڑ دیتا ہوں میں بھی ضد اپنی
تو بھی تخفیف کر سزاؤں میں

ٹوٹ جاتا ہوں آئینے کی طرح
اُس کو دیکھوں جو بے وفاؤں میں

آؤ ماضی کو یاد کرتے ہیں
بیٹھ کر برگدوں کی چھاؤں میں

دربدر ہوں ہوا کی صورت میں
کیسا چکر پڑا ہے پاؤں میں

ہے غنیمت مرے لیے شاہد
یاد رکھے کوئی دعاؤں میں

ہمایوں پرویز شاہد

غزل

شام ستم کا کوئی بھی چارا نہ کر سکے
ہم تو کوئی چراغ ستارہ نہ کر سکے

اُن سے سُنی گئی نہ کبھی میرے دل کی بات
اِک پَل بھی آرزو کو گوارا نہ کر سکے

دُنیا کے ساتھ بھی نہ ہوئی رسم و رہ کبھی
ہم اپنے قُرب میں بھی گواراہ رہ سکے

ابھرا ہزار بار ہی بامِ فلک پہ چاند
ہم کور چشم تھے کہ نظارہ نہ کر سکے

گزری تمام عمر مگر کاروبار میں
پورا محبتوں کا خسارہ نہ کر سکے

دُنیا کی بات مان کے وہ پھیر لے نظر
ایسا کسی طرح وہ خُدارا نہ کر سکے

پوری ہوئی نہ کوئی ضرورت کسی طرح
ہم کوئی کام سارے کا سارا نہ کر سکے

سارا لگا کے زور سفینے کے ناخُدا
گردابِ موجِ غم کو کنارا نہ کر سکے

اِک زعم جن کو اپنی مسیحائی پہ رہا
میرے کسی بھی زخم کا چارا نہ کر سکے

مایوس یوں ہوئے ہیں زمانے سے ہم نبیل
چاہت کی آرزو بھی دوبارا نہ کر سکے

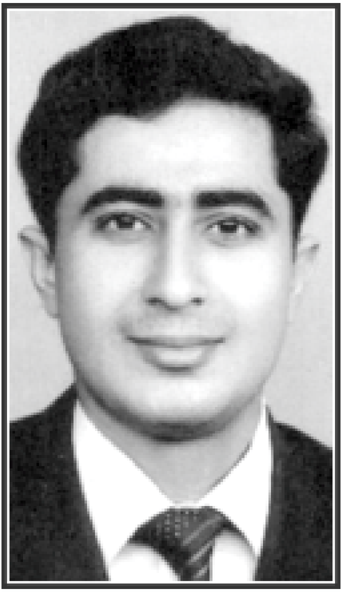

نبیل احمد نبیل

غزل

پیش آیا جب بھی کوئی خندہ پیشانی کے ساتھ
دیکھتا ہی رہ گیا میں اس کو حیرانی کے ساتھ

ایک غم نے آج پھر مجھ کو رلایا دیر تک
خون ہو کر بہہ گیا دل آنکھ کے پانی کے ساتھ

بند جتنے باندھ رکھے تھے وہ سارے بہہ گئے
آج دریا موج زن تھا ایک طغیانی کے ساتھ

بارہا ہوتی ہے دستک، بارہا جاتا ہوں میں
بارہا پھر لوٹ آتا ہوں پریشانی کے ساتھ

جب بھی راتوں میں کسی کی یاد آئی ہے مجھے
خوب رویا ہوں میں مل کر رات کی رانی کے ساتھ

جس کی یادوں کے نشاں ہر موڑ، ہر رستے میں ہیں
بھول سکتا ہوں اسے کیسے میں آسانی کے ساتھ

چھانٹ کر سارے غموں کو ہجر لے آیا ہوں میں
مل رہے تھے غم سرِ بازار ارزانی کے ساتھ

کوئی پوچھے تو سہی ان سے کہ آخر کیا ہوا؟
لوگ ماتم کر رہے ہیں مرثیہ خوانی کے ساتھ

اس سے باہر آؤں تو ہوتی ہے وحشت سی مجھے
میں بہت خوش ہوں میاں اس گھر کی ویرانی کے ساتھ

سنگِ مرمر سے بنے اونچے گھروں کے درمیاں
سر اٹھا کر جی رہا ہوں خستہ سامانی کے ساتھ

میں کہ شاعر ہوں، مجھے تھوڑی سی گنجائش ملے
شعر کہنے ہیں مجھے پر اتنی نگرانی کے ساتھ؟

میں نے اپنے آپ کو یہ بات سمجھائی تو ہے
"کون تیرا ساتھ دے اس شعلہ افشانی کے ساتھ"

میں ہوں اپنے آپ میں گم رہنے والا آدمی
کون رہنے آئے گا مجھ ایسے زندانی کے ساتھ

علمدار حسین

غزل

جو بھی ہے بس اسی میں خوش ہوں میں
اپنی دیوانگی میں خوش ہوں میں

آگیا دکھ میں مسکرانا بھی
اپنی زندہ دلی میں خوش ہوں میں

آپ میری خوشی کا مت پوچھیں
آپ ہی کی خوشی میں خوش ہوں میں

جنگ آئی کبھی نہ راس مجھے
امن اور آشتی میں خوش ہوں میں

دل تری ضد کے آگے بے بس ہے
اور اس بے بسی میں خوش ہوں میں

میں نے کرلی ہے دوستی خود سے
اور اس دوستی میں خوش ہوں میں

ہو گئے تارے اور بھی روشن
آج تو تیرگی میں خوش ہوں میں

پیار کرتا ہے صرف دل والا
اس لیے اس گلی میں خوش ہوں میں

اب میسر ہے مجھ کو تنہائی
جہل سے دشمنی میں خوش ہوں میں

دل کی مٹی گداز اسی سے ہے
آنسوؤں کی نمی میں خوش ہوں میں

تو نہ سمجھا وہ طعنہ و تشنیع
دل تری سادگی میں خوش ہوں میں

افشاں سجاد

غزلیں

انا سے لڑتے ہوئے گر سنبھل گیا ہوتا
میں اپنے آپ سے آگے نکل گیا ہوتا

دعا صحیفہ، امکاں ذرا سمجھ لیتی
لکھا نصیب کا شاید بدل گیا ہوتا

بس ایک عکسِ شناسا کی لو اسے ملتی
یہ انتظار کا تودہ پگھل گیا ہوتا

نظر پڑی نہیں عفریتِ وقت کی اس پر
وگرنہ موسمِ دل کو نگل گیا ہوتا

کہاں زمانے الجھتے مری سوانح کے
جہاں میں آج گیا ہوں جو کل گیا ہوتا

نمو کو روک دیا رت جگوں کی سازش نے
اک آدھ خواب تو آنکھوں میں پل گیا ہوتا

افتخار الحق

میں وجد میں ہوں کہ یہ کائنات وجد میں ہے
گماں یہی ہے رگِ شش جہات وجد میں ہے

ترے سبب سے ہے منظر پہ عالمِ مستی
تو کس لیے نظرِ التفات وجد میں ہے

نظارہ وقت نے دیکھا یہ ہوش کھوتے ہوئے
خضر سرور میں آبِ حیات وجد میں ہے

دکھائی دیں گی مرے دل کو اور دنیائیں
جنوں میں ہے نفی اور ثبات وجد میں ہے

بدن سے روح کا رشتہ سمجھ میں آنے لگا
کہیں پہ قید کہیں پر نجات وجد میں ہے

غزل

کسی طرح سے مرے دل کو ٹوٹ جانا تھا
تری جدائی تو اے دوست اک بہانہ تھا

وہ میرے شہر میں رکتا تو کب تلک رکتا
اُسے بھی لوٹ کے اپنے دیار جانا تھا

وہ چھوڑ جائے گا رستے میں لوگ کہتے تھے
میں ناسمجھ تھا کہ میں نے کہا نہ مانا تھا

علاج چارہ گروں نے بہت کیا اپنا
مگر جو زخم تھا دل پہ بہت پُرانا تھا

جو وہ نہیں جو سبھی راستے پرائے ہیں
وہ ساتھ تھا تو مرے ساتھ اک زمانہ تھا

ذرا سی بات پہ دامن چھڑا گئے عاشق
وہ جن سے سلسلہ اپنا بہت پرانا تھا

عاشق جعفری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اپنی جوت جگانا خالد اپنے الاؤ بنانا
اپنے عشق میں میرے جیسا اپنا حال نہ کرنا

غزل

محبت کے چُھپے اسرار سے پردے ہٹاتے ہو
کبھی سپنے دکھاتے ہو کبھی آنکھیں دکھاتے ہو

ابھی کتنے مراحل ہیں مری تکمیل کے باقی
جو ہر موسم میں میرا اک نیا نقشہ بناتے ہو

میں بولوں بھی تو کیا بولوں سبھی کچھ ہے عیاں تم پر
مری خاموشیء پیہم کے در کیوں کھٹکھٹاتے ہو

تجھے برداشت بھی ہوتا نہیں ہے ذکر پت جھڑ کا
بہارِ نو کے نغموں پر بھی تم قدغن لگاتے ہو

شبِ دیجور ہی جب راس ہے تم کو بیاباں میں
تو پھر کیوں روشنی کے خواب آنکھوں میں سجاتے ہو

مرے نادان ہم وطنو تمہیں میں داد دیتا ہوں
مری مشکل کو حل کر اور بھی مشکل بناتے ہو

تمھیں جب لکھ دیا مختار نامہ اپنے سانسوں کا
تو پھر کیوں لحہ لحہ اب تم مجھ کو آزماتے ہو

جسے بھیجا ہے روزی کے لیے پردیس میں فرحان
اسے ملنے کی خاطر خود ہی اب آنسو بہاتے ہو

سرور فرحان

غزل

درد کی دھوپ کو جس نے جھیلا نہیں
اُس پہ زلفِ محبت کا سایہ نہیں

جس نے غم کے لبادے کو اوڑھا نہیں
زندگی کا مزہ اس نے چکھا نہیں

بے رخی اُس کی اپنی جگہ ہے مگر
اُس نے محفل سے مجھ کو اٹھایا نہیں

رخ بدلتا رہا ہر گھڑی یہ جہاں
کوئی چہرہ یہاں پہلے جیسا نہیں

روشنی کی تمنا میں جلتی رہی
موم نے خود کو سایہ بھی بخشا نہیں

راہِ الفت میں جتنے مسافر ملے
رونے والے تھے سب کوئی ہنستا نہیں

وہ جو کہتا ہے وہ پارسا ہے بہت
اس نے شاید ابھی خود کو پرکھا نہیں

حق کی خاطر جو محفل میں خاموش تھا
وقتِ رخصت لبوں سے وہ بولا نہیں

مجھ کو جس کی تمنا رہی عمر بھر
میری آنکھوں میں منظر وہ ٹھہرا نہیں

منزلوں پر رہی ہے ہمیشہ نظر
ہم نے پیچھے کبھی مڑ کے دیکھا نہیں

تیرے وعدوں پہ کب تک جئیں گے بھلا
زندگی کا مجھے تو بھروسہ نہیں

سوچتا ہوں مجھے آج کیا ہو گیا
دیکھ کر تجھ کو دل آج دھڑکا نہیں

جب سے دل میں فروزاں ہوئے ہیں چراغ
روشنی کے تعاقب میں نکلا نہیں

شفیق آصف

غزل

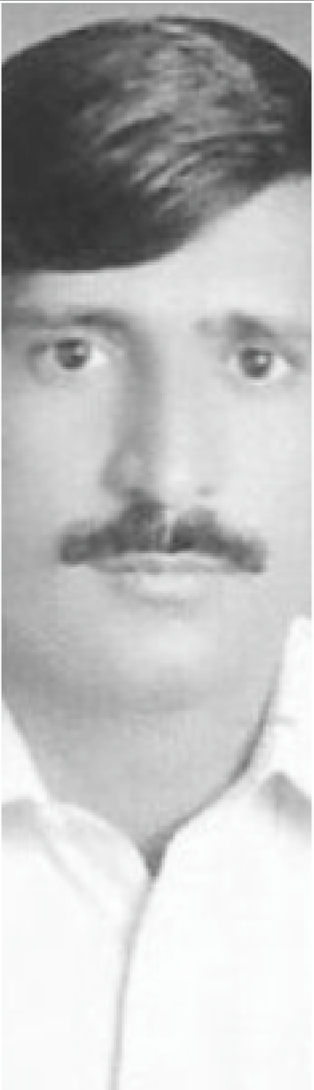

اور لوگوں نے تو گلدان میں رکھے ہوئے ہیں
پھول ہم میر کے دیوان میں رکھے ہوئے ہیں

ہم ہجرت میں بھی غافل نہیں ہوتے تجھ سے
تیری تصویر کو سامان میں رکھے ہوئے ہیں

تجھ کو پا کر بھی کہاں چین میسر ہے ہمیں
تجھ کو کھونا بھی تو امکان میں رکھے ہوئے ہیں

جانے کب ہونا ہے شرمندۂ تعبیر انھیں
خواب جو آنکھ کے دالان میں رکھے ہوئے ہیں

ہم وہ انسان ہیں انسان نہیں ہوتے جو
ہم پرندوں کو بھی زندان میں رکھے ہوئے ہیں

پھول اظہارِ محبت کے لیے کافی ہے
آپ کی بات کو ہم دھیان میں رکھے ہوئے ہیں

غالب و میر نظر رکھتے ہیں مجھ پر دانش
شعر کیا کیا میرے وجدان میں رکھے ہوئے ہیں

اعجاز دانش

غزل

تری ایک چھوٹی سی بے رخی مرے اعتبار کو کھا گئی
تری ایک ہلکی سی برہمی دلِ بے قرار کو کھا گئی

نہ تو نیند ہی مری نیند ہے نہ ہی جاگنا مرا جاگنا
مری رات دن کی یہ نوکری مرے اختیار کو کھا گئی

نہ وہ ہجر میں رہیں گرمیاں نہ وہ سوز ہے نہ گداز ہے
تری اک جھلک تری ایک چھب مرے انتظار کو کھا گئی

ترے لوٹ آنے کی آس تھی، مرے دل میں تیری ہی پیاس تھی
تری ان سنی، تری ان کہی جو اعتبار کو کھا گئی

وہ جو ایک فصلِ بہار تھی، وہ جو گل رخوں کی قطار تھی
وہ جو میری وجہِ قرار تھی وہ مرے قرار کو کھا گئی

میں جو کنجِ غم میں پڑا رہا، ترے راستوں میں کھڑا رہا
تری اک نگاہِ فسردگی دلِ غم گسار کو کھا گئی

اصغر علی بلوچ

غزل

کرنی ہے ابھی اور تگ و تاز کہاں تک
ہوگا نہ یہاں حُسن کا در باز کہاں تک

بے ساز رہوں گا مَیں سخن ساز کہاں تک
جھٹلائے گی دنیا مرا اعجاز کہاں تک

آخر مجھے ہونا ہے نمایاں سرِ محفل
تم مجھ کو کرو گے نظر انداز کہاں تک

پہنچو گے کبھی تم بھی وہاں تک تو کُھلے گا
جاتی ہے مرے لفظ کی آواز کہاں تک

کُھلتے ہی چلے جاتے ہیں اَسرار جہاں کے
رہتا ہے یہاں راز کوئی راز کہاں تک

معلوم جو ہوتا تو کسی طور نہ کُھلتا
ہم راز رہے گا مرا ہم راز کہاں تک

جُز اُس کے کسی کو نہیں معلوم کہ نازش!
ہونا ہے ابھی اور یہ آغاز کہاں تک

شبیر نازش

غزل

سنگ ہے، جاوداں اُداسی کا
پالیا اِک جہاں اُداسی کا

اس میں بوڑھے قیام کرتے ہیں
گھر ہے یہ نوجواں اُداسی کا

اُس نے دھیرے سے دل پہ دستک دی
چل پڑا کارواں اُداسی کا

اُس طرف حُسن کا دریچہ ہے
اِس طرف ہے مکاں اُداسی کا

دل سلگتے ہی یہ ہوا محسوس
اُٹھ رہا ہے دُھواں اداسی کا

چند لمحوں کا لُطف کب ٹھہرا
ہے سفر بے کراں اُداسی کا

آ! یہاں دیکھ لے، کسی سے نہ پوچھ
ہے ٹھکانہ کہاں اُداسی کا

کب کسی سے لپٹ لپٹ جائے
کیا پتا ہے میاں اُداسی کا

گرچہ کشتی حیات کی ہے سُست
چُست ہے بادباں اُداسی کا

تجھ میں عقل و شعور کافی ہے
حل بتا! مہرباں ! اُداسی کا

جھیل پر آفتاب اُترا ہے
کیوں ہے منظر یہاں اُداسی کا

آفتاب خان

غزل

شمار کرتے نہیں مجھ کو خاندان میں تم
مجھے یہ ڈال رہے ہو کس امتحان میں تم

یہ لگ رہا ہے نہیں مطمئن نشانے سے
رکھو گے تیر بھلا کب تلک کمان میں تم

یہ مانا حسن میں رکھتے نہیں تم اپنا جواب
کہ کامیاب نہیں عشق کی اڑان میں تم

تمہاری بندگی کرتا ہوں دیکھنا کیسے
حروف اپنے نہ ڈالو مری زبان میں تم

محبتوں کے خزانے بکھیرتے ہی رہیں
زمیں کی گود میں ہم اور آسمان میں تم

ہوا میں اڑتے پرندوں کو دیکھتے کیوں ہو
اکیلے ہی پڑے رہتے ہو کیا مکان میں تم

مجھے یقین ہے جب چھوڑ جاؤ گے مجھ کو
اکیلے ہی کہیں رہ جاؤ گے جہان میں تم

علی حسین عابدی

غزل

جواز ڈھونڈ رہا ہے جو برہمی کے لیے
ترس رہا تھا کبھی ہم سے دوستی کے لیے

گلابی ہونٹ یہ آنکھیں تمہیں مبارک ہوں
کہ ایک لمس کی حاجت ہے چاشنی کے لیے

مکان پختہ بناتے نہیں ہیں خانہ بدوش
ہم اس جہان میں آئے ہیں دو گھڑی کے لیے

دیارِ دل ہے میاں تم کدھر چلے آئے
سرائے عام نہیں ہے یہ ہر کسی کے لیے

ہمارے شہر پہ آتش پرست قابض ہیں
ہمارا خون جلاتے ہیں روشنی کے لیے

تمہارے ساتھ عداوت میں کس لیے کر لوں
بکھیڑے اور ہزاروں ہیں زندگی کے لیے

خدا زمین پہ آتا کسی نے دیکھا ہے؟
سہارا آدمی ہوتے ہیں آدمی کے لیے

غموں کی دھوپ میں جینا محال ہے ارشد
ترس رہا ہے یہاں ہر کوئی خوشی کے لیے

ارشد محمود ارشد

غزل

میں کائنات سے آگے بھی دیکھ سکتی ہوں
اندھیری رات سے آگے بھی دیکھ سکتی ہوں

وہ میرے سامنے بن کر کتاب بیٹھا ہے
تری بساط سے آگے بھی دیکھ سکتی ہوں

بہت سے رنگ ہیں دُنیا میں بے ثباتی کے
میں اک ثبات سے آگے بھی دیکھ سکتی ہوں

اُسی نے رکھا ہے سارا جہان مٹھی میں
میں اپنی ذات سے آگے بھی دیکھ سکتی ہوں

مری اُڑان ہے افلاک کے دریچوں تک
یوں ممکنات سے آگے بھی دیکھ سکتی ہوں

یہ ایک دل کہ زمیں زاد سے ہُوا منسوب
میں تیری بات سے آگے بھی دیکھ سکتی ہوں

یوں آشنا تو ہوں اپنی بھی حدود سے میں
میں تیری گھات سے آگے بھی دیکھ سکتی ہوں

تمھارے عشق نے مجبور کر دیا ورنہ
تمھارے ساتھ سے آگے بھی دیکھ سکتی ہوں

کہاں کہاں مرے زخموں کا اندمال ہُوا
تعلقات سے آگے بھی دیکھ سکتی ہوں

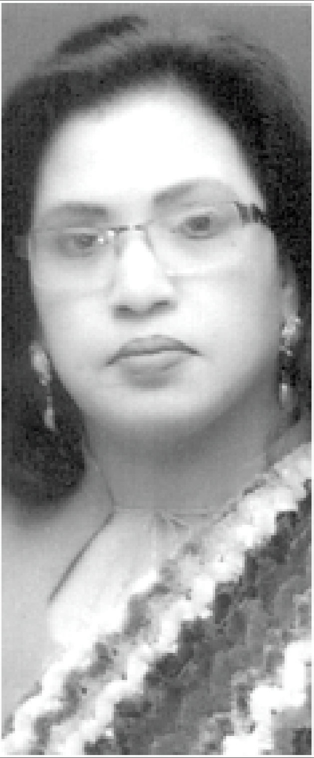

آسناتھ کنول

غزل

آ کے آنکھوں پہ ہاتھ رکھ دے گا
یوں وہ کمرے میں رات رکھ دے گا

دل ہتھیلی پہ جب رکھے گا وہ
کچھ دلیلیں بھی ساتھ رکھ دے گا

میرے حق میں لڑے گا مجھ سے وہ
اک طرف اپنی ذات رکھ دے گا

یوں دکھائے گا جیت کر مجھ سے
ہر طرف اپنی مات رکھ دے گا

پہلے چھینے گا مجھ سے سانسیں مری
سامنے پھر حیات رکھ دے گا

پیاس کا امتحان لیتے وقت
میرے آگے فرات رکھ دے گا

وہ مرے ہاتھ سے قلم لے کر
خود چھپا کر دوات رکھ دے گا

الماس شبی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک شجر کے کوئی دو پتے بھی اک جیسے نہ تھے
میری دنیا میں کسی شے کا کوئی ثانی نہیں

غزلیں

موسم کے پرندوں نے، یہ بات بتائی ہے
اس بار بھی قربت کے، موسم میں جدائی ہے

لگتا ہے مجھے تم بھی اب چھوڑ کے جاؤ گے
جو بات نہ بنتی تھی وہ تم نے بنائی ہے

اک طرفہ چبھن اس میں، اک طرفہ خلش اس میں
جو چوٹ بھی کھائی ہے، وہ جان کے کھائی ہے

رنگوں کی تپش سے ہے اب رقص کناں تتلی
گلشن میں بہاروں نے اک آگ لگائی ہے

میں یوں تو عناصر کا، اک طرفہ تماشا ہوں
پر جذبوں کی اک بجلی، رگ رگ میں سمائی ہے

ہر برگ و گل و تتلی، جن رنگوں کے مظہر ہیں
فطرت سے وہ رنگ لے کر، تصویر بنائی ہے

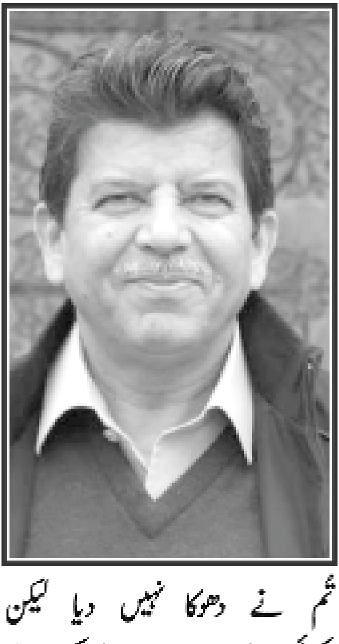

راجہ عبدالقیوم

تم سے ملنے کبھی جو آیا تھا
میں نہیں تھا وہ میرا سایا تھا

اس میں رہنا نہیں تھا میں نے کبھی
میں نے بس یونہی گھر بنایا تھا

گھر میں کتنے بھروسے رکھے تھے
انہیں پھولوں سے گھر سجایا تھا

کھل کے جب بارشیں برستی تھیں
کھل کے جنگل بھی مسکرایا تھا

تم نے دھوکا نہیں دیا لیکن
کوئی دھوکا ہی میں نے کھایا تھا

مل کے مٹی میں ہو گیا مٹی
جو بھی ڈھونڈا تھا جو بھی پایا تھا

وقت جیسے لڑھکتا پتھر تھا
جس نے سب کچھ مرا مٹایا تھا

غزل

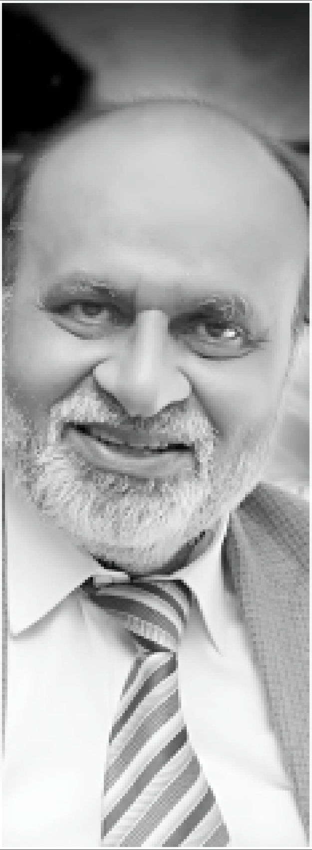

احمد مسعود قریشی

میرے بارے میں بھی تو نے کبھی سوچا ہوگا
تیری آنکھوں میں بھی بستا مرا سپنا ہوگا

رات بھر چاند کو تکتی رہی میری آنکھیں
ایسا لگتا تھا مرے بن تو بھی تنہا ہوگا

عشق کی رہ میں بہاروں نے قدم رکھے ہیں
اس کے رستے میں کوئی پھول تو مہکا ہوگا

تیری یادوں کی گھٹا ساتھ رہی ہے میرے
تیرے آنگن میں مرا پیار بھی اترا ہوگا

دل میں تصویر تری میں نے لگا رکھی ہے
تو بھی باتیں مری تصویر سے کرتا ہوگا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

عشق کا فخر نہیں ، یکسر و یکتا ہونا
عشق ہے سب سے الگ ہو کے بھی سب سا ہونا

غزل

ہوتی تھی جہاں ، ہے نہیں شنوائی ہماری
کام آئی نہیں زمزمہ پیرائی ہماری

کچے ہیں بہت عقل کی باتوں میں ابھی ہم
ڈرتی ہے جنوں سے ابھی دانائی ہماری

دعویٰ بھی وہی لوگ کریں غوطہ زنی کا
ساحل سے ہیں جو ناپتے گہرائی ہماری

گزری ہے سرِ راہ یونہی ٹھوکریں کھاتے
کونوں سے نہیں ٹھیک ابھی گولائی ہماری

نفرت ہے تو نفرت کے قرینے بھی تو آتے
کیوں آنکھ اسے دیکھ کے بھر آئی ہماری

جوڑیں بھی تو کیا رونقِ دنیا سے تعلق
محفل سے بھی ٹوٹی نہیں تنہائی ہماری

کیا پیش وضاحت کریں جب دوست سمجھ لیں
حکمت سے بھری ہوتی ہے پسپائی ہماری

اچھے ہیں جو کر دیتے ہیں جاذب نظر انداز
دیوار پہ لکھی ہوئی رسوائی ہماری

اکرم جاذب

غزل

قید گیسو میں ہی کفالت ہے
نہ جرح ہے نہ اب وکالت ہے

مسکرا کر جو اس نے دیکھ لیا
قابلِ رحم دل کی حالت ہے

آپ کیوں مبتلائے عشق ہوئے
اس میں تو سر بسر خجالت ہے

ذکر دیر و حرم نہ کر ساقی
مے کدے سے تری رفاقت ہے

کیسے قاتل پہ مر مٹے محسنؔ
خود ہی جو صاحب عدالت ہے

میتھیو محسن

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

پلٹ نہ جائیں ترے ہجر کے جہنم سے
یہ راستے کہ مری ہجرتوں کے ساتھی ہیں

غزلیں

قیمتی منزلِ محبوب سے رستے کیوں ہیں
آدمی ہیں تو زر و جنس سے سستے کیوں ہیں

کبھی اس رمز سے آگاہی نہیں ہوتی ہے
ہم اکٹھے ہیں تو ملنے کو ترستے کیوں ہیں

پیاس میں روٹھے ہوئے رہتے ہیں بادل اکثر
جب ضرورت نہیں ہوتی تو برستے کیوں ہیں

عزم کر لیں تو کوئی راہ نکل سکتی ہے
لوگ اس وادیٔ خوں رنگ میں بستے کیوں ہیں

امن کی راہ پہ چلنے کی اگر ٹھان ہی لے
سب کے ہاتھوں میں ہی تلواروں کے دستے کیوں ہیں

میری فطرت کا اگر جزو ہے آزادی مری
پھر شکنجے میں ولی کو سبھی کستے کیوں ہیں

شاہ روم خان ولی

خون جم جاتا ہے جسموں میں جہاں سردی سے
ہم سیاچن میں بھی رہتے رہے پامردی سے

نرم دیکھا ہی نہیں ہے کبھی موسم کا مزاج
اور دشمن بھی رہا گھورتا بے دردی سے

کیا بتاؤں نہیں احباب سمجھ پائیں گے
جس قدر پیار ہوا مجھ کو یہاں وردی سے

مالکِ ارض و سما نے ہمیں قوت بخشی
لالی چہرے کی بدلتی تو رہی زردی سے

اپنی مٹی کی محبت میں سہے زخم مگر
ہم نے کاٹے ہیں کڑے کوس جواں مردی سے

مستقل کوئی ٹھکانہ نہ بنا پایا میں
کبھی فرصت نہ ملی مجھ کو جہاں گردی سے

شدتیں درد کی خالص ہیں بہت اپنی ولی
ہم جو کتائے ہوئے رہتے ہیں ہمدردی سے

غزلیں

شاخِ گریہ کا خم نکلتا ہے
عشق ٹوٹے تو غم نکلتا ہے

چاہتا ہوں کہ تیرا نام نہ لوں
پر خدا کی قسم نکلتا ہے

خود کو مصلوب ہی نہ کر ڈالے
اب وہ گھر سے بھی کم نکلتا ہے

یہ ستائش نہیں ہے بے معنی
کچھ تو زیرِ قلم نکلتا ہے

یار آساں نہیں جدا ہونا
سوچتا ہوں تو دم نکلتا ہے

اپنی تصویر ہی لگائی تھی
اب بھی کمرے سے نم نکلتا ہے

کوئی جب بھی تمہارا پوچھتا ہے
میرے منہ سے تو ہم نکلتا ہے

انصر منیر

میں ہوں جس پر رواں یہ سفر اور ہے
میرے اندر کسی یاد کا شور ہے

یعنی ہم دونوں اک دن بچھڑ جائیں گے
بات ویسے بڑی قابلِ غور ہے

کل کو طعنے نے گی محبت کے وہ
جنبشِ لب بھی جس کو ابھی شور ہے

ملنے والے ہیں راہِ ابد پر کہیں
یہ ترے ہجر کا آخری دور ہے

یہ تو انساں کو بانہوں میں بھر لیتا ہے
اے مرے یار لاہور لاہور ہے

یہ لبھاتے ہوئے سب نگل جائے گا
وقت کا جو یہ اک ناچتا مور ہے

میں نے انصر شبِ ہجر بھی کاٹ لی
سب سمجھتے تھے یہ شخص کمزور ہے

غزل

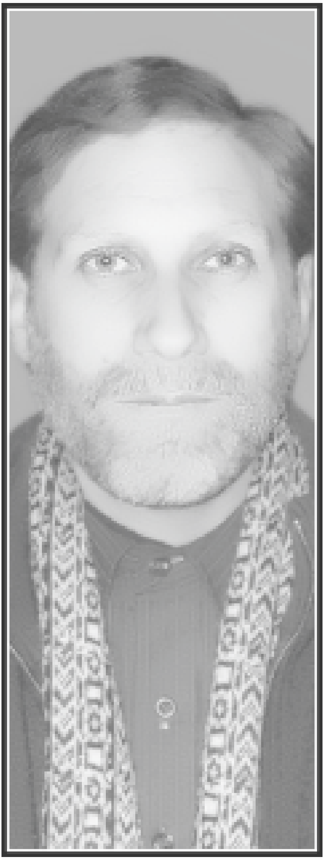

دل میں یادوں کی رقص کرتی صف
دھڑکنیں ہیں کہ بج رہا ہے دف

سُچّا موتی کسی میں بھی نہ ملا
ہاتھ آئی ہمیشہ خالی صدف

دیکھتی ہے نشانہ چلتے ہوئے
گولی کیا جانے کون کیوں ہے ہدف

وہی آنسو ہے حاصلِ گریہ
آنکھ سے بہ گیا جو دل کی طرف

خون سے خط لکھا ہے اُس کو امر
ساتھ میں دل بھی کر دیا ہے لف

امر مہکی

کھل کر بھی کھلا کب دَرِ اعجازِ علامت
کیا کچھ نہ چھپایا پسِ اظہار کسی نے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

غزل

بندشیں بھی نئی ہیں، نئی ہے غزل
محترم! آپ ہی نے کہی ہے غزل

عشق کا ایک اپنا ہی احساس ہے
وہ کسک ہے کہ خود ہوتی ہے غزل

بات کرتے ہوئے منھ کو آتا ہے دل
اپنے لہجے میں جب بولتی ہے غزل

دم نکلتا ہے ایک ایک ترکیب پر
بندشوں میں کچھ ایسی کسی ہے غزل

تب کہیں جا کے اُٹھتا ہے بارِ سخن
اپنے پلڑے میں جب تولتی ہے غزل

ناصحو! یہ بڑے ضبط کی بات ہے
میر کے بعد بھی جی رہی ہے غزل

کون ہے جو نہیں میر کا معتقد
میر کی معتقد تو رہی ہے غزل

مجھ کو پہچانتی ہے یہی ہے بہت
ورنہ کتنوں کو گردانتی ہے غزل

غزلیں ایسی ہی کہیے نہ تابش میاں
ہر نفس کہہ اٹھے یہ مری ہے غزل

تابش ردولوی

غزل

یہ دور تک جو نظر آ رہی ہے خالی سڑک
اِسی کو کہتے تھے سب پہلے شور والی سڑک

یہیں پہ خواب گرے تھے، یہیں پہ دل ٹوٹا
وہی درختوں کی چھاؤں، وہی ہے کالی سڑک

نشان قدموں کے اب بھی کسی کے تازہ ہیں
ذرا یہ غور سے دیکھو، جناب عالی! سڑک

عمارتیں ہیں نئی، لوگ بھی نئے ہیں مگر
نہ جانے کیوں مجھے لگتی ہے دیکھی بھالی سڑک

بڑھو جب آگے تو پیچھے دھکیل دیتی ہے
یہ زندگی بھی ہو جیسے کوئی نرالی سڑک

مجھے نہ چلنے کی عادت ہے بھیڑ میں، نہ ہی شوق
ظہور اِس لیے سب سے الگ بنالی سڑک

ظہور چوہان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر قدم خاک بہ سر، حشر بہ پا رہتے ہیں
ہم کہ چپ رہ کے بھی سرگرمِ نوا رہتے ہیں

غزل

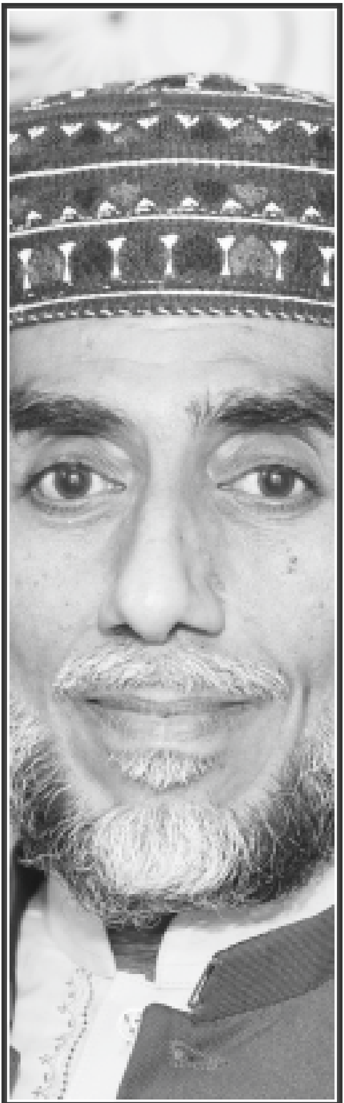

پیر و مرشد نے مجھے ایسا پڑھایا کلمہ
دل تو کیا، روح کی تہ میں اتر آیا کلمہ

جان کر وردِ سبق، جوں ہی پکایا کلمہ
جس طرف آنکھ اٹھائی نظر آیا کلمہ

ڈال کر جامِ رسالت میں شرابِ توحید
ساقیٔ بزمِ طریقت نے پلایا کلمہ

کفر و اسلام بھی ہے، وحدت و کثرت بھی ہے
درسِ درویش میں کچھ کچھ سمجھ آیا کلمہ

''لا'' کی دیوار میں ''اِلاَّ'' کا کھلا دروازہ
''کنت کنزاً'' کے لحن ساز پہ گایا کلمہ

نفی اثبات، فنا اور بقا، جبر و قدر
ہر حوالے سے گیا خوب دکھایا کلمہ

میں تو اک روئے کتابی کا ہوں قاری، فیضان
دوستوں نے مجھے کہہ کہہ کے پڑھایا کلمہ

فیض رسول فیضان

غزل

یہ اور بات کہ منزل کو اپنی پا نہ سکے
مگر جو عزم کیا تھا کبھی بھلا نہ سکے

وہ کیا کرے گا بیاں داستانِ غم اُن سے
جو ایک بات بھی دل کی اُنہیں بتا نہ سکے

ہزار تفرقے ڈالے غمِ جدائی نے
مری وفا کے قدم پھر بھی ڈگمگا نہ سکے

رکھے نہ وادیٔ اُلفت میں وہ قدم ہرگز
خزاں میں بھی جو بہاروں کے گیت گا نہ سکے

ملے ہیں زیست میں ایسے مقام بھی انجُم
دلِ حزیں کو جہاں وہ بھی یاد آ نہ سکے

انوار انجم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہجر نے ہم کو لازوال کیا
نفع دیتے ہیں کچھ خسارے بھی

غزل

ہے ندامت مگر حقیقت ہے
مہوشوں سے مجھے محبت ہے

تم کو دیکھا تو یہ ہوا معلوم
”زندگی کتنی خوبصورت ہے“

تیری خوشبو سے مہک اٹھے فضا
پھول کلیوں میں تیری نکہت ہے

آدمی ہیں شمار سے باہر
پھر بھی کیوں قحط آدمیت ہے

مستند ہے میری کہی ہر بات
بس یہی میری وجہ شہرت ہے

میں کہ اشفاق خود کو بھول چکا
بھولنا بھی تو ایک نعمت ہے

محمد اشفاق بیگ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

زندگی کے ہاتھ میں تو ہاتھ دے دیں گے، مگر
وحشتوں کے پاؤں میں کیا خاک پہنائیں گے ہم

غزل

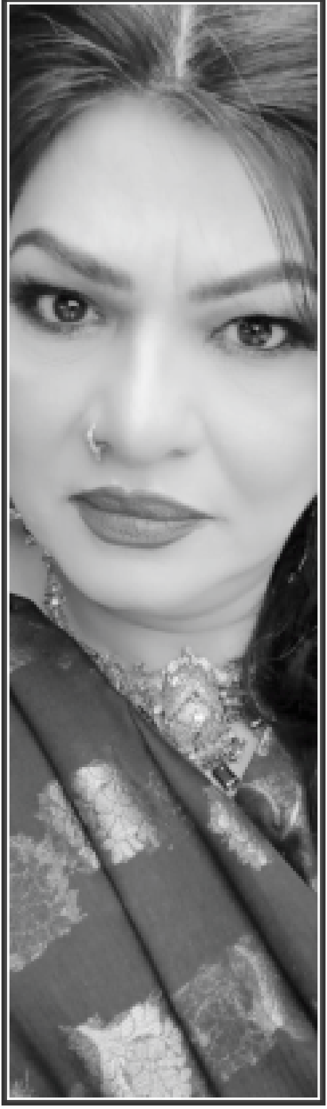

عمر ساری ہی خزاؤں میں گزاری میں نے
اور ہمراہ رکھی بادِ بہاری میں نے

لغزشِ پا کو زمانے پہ نہیں کھلنے دیا
کبھی محسوس نہ ہونے دی خماری میں نے

دوستوں کے لیے ہرگز نہ بنی بارِ گراں
اپنے سینے پہ تھکن اپنی اتاری میں نے

جیسے دربار پہ اک سکہ چڑھا دیتے ہیں
اس طرح زندگی اک شخص پہ واری میں نے

غوطہ زن بحرِ محبت میں ہوئی تھی لیکن
زندگی درد کی موجوں میں گزاری میں نے

اتنی بے درد جیا اپنے لیے بن کے رہی
عشق کی بازی بھی ہنستے ہوئے ہاری میں نے

جیا قریشی

غزل

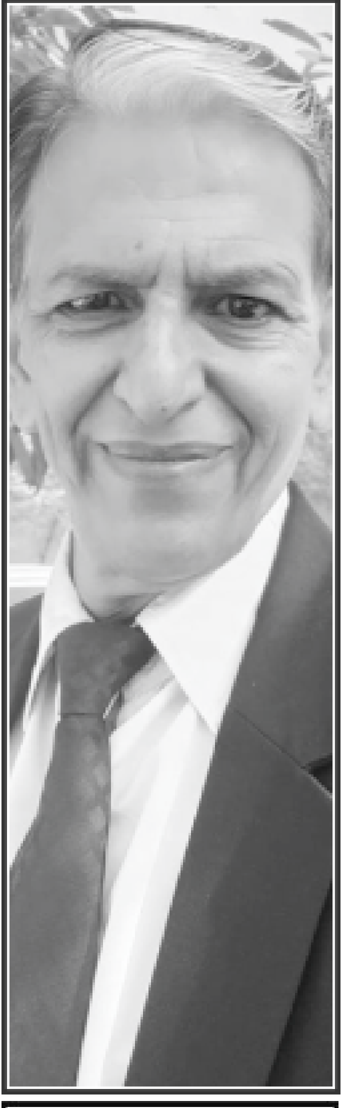

دل کے جلتے صحرا میں کچھ گلاب دیکھیں گے
کاش نیند آجائے ہم بھی خواب دیکھیں گے

کیا خبر تھی اب آگے ہجر کا سفر ہوگا
ہر قدم پہ رستے میں اک عذاب دیکھیں گے

بے قرار لمحوں میں ڈھونڈتے رہیں گے ہم
کچھ سکون کے سائے، کچھ سراب دیکھیں گے

لوگ سب چھپاتے ہیں درد کی کہانی کو
اور یہ سمجھتے ہیں، ہم حساب دیکھیں گے

کاش تم بھی آ جاؤ خواب کی فضاؤں میں
ہم تمھارے چہرے پر آفتاب دیکھیں گے

زندگی کی راہوں میں دھوپ ہی مقدر ہے
کیا کسی کے چہرے کا ماہتاب دیکھیں گے

اب ہوا کے رخ پر ہے کشتیِ تمنا بھی
سوچتے ہیں کس کو اب زیرِ آب دیکھیں گے

رات کے اندھیرے میں ڈوب کر بھی عابد
چاندنی کے چہرے پر ہم نقاب دیکھیں گے

عابد معروف مغل

غزل

شوق کا طوفان دل سے اب نکلتا ہی نہیں
دل جوانی میں سنبھالے سے سنبھلتا ہی نہیں

دیکھ کر تجھ کو دھڑکتا ہے یہ دل دیوانہ وار
عقل کا جادو کوئی اب دل پہ چلتا ہی نہیں

رخ بدل جائے زمانے کا مگر جانِ جہاں!
نقشِ الفت اب ترا دل سے نکلتا ہی نہیں

یوں تو اس محفل میں لاکھوں دلربا موجود ہیں
پھر بھی تیرے بن یہ دل اب تو بہلتا ہی نہیں

آگ اِس دل میں لگی ہے جو بجھے گی اب کہاں
درد کا چشمہ تو آنکھوں سے ابلتا ہی نہیں

یاد آتی ہے رفیقوں کی، عزیزوں کی مجھے
دل مسافر کا کہیں بھی اب بہلتا ہی نہیں

زینؔ ہم ٹکرائیں گے موجِ بلا سے ابھی
موت کا ڈر اب ہمارے دل میں پلتا ہی نہیں

عبدالروف زین

غزل

حسنِ جاناں کا پرستار نہیں بھی ہوتا
ہر کوئی غم کا خریدار نہیں بھی ہوتا

السیے یوں ہی تو رشتوں میں جنم لیتے نہیں
وہ جو کرتے ہیں انہیں پیار نہیں بھی ہوتا

ایسے ہمدرد بھی آتے ہیں تسلی دینے
جن کو کچھ خاص سروکار نہیں بھی ہوتا

اپنے ہی درد کی شدت سے بلک اٹھتا ہے
رونے والا کبھی غمخوار نہیں بھی ہوتا

لازمی ہوگی کوئی ایسی جگہ دنیا میں
جہاں رشتوں میں بیوپار نہیں بھی ہوتا

درگزر اے مرے سرتاج کہ مجبوری ہے
ہوش پورا دمِ دیدار نہیں بھی ہوتا

پیار والے جسے انکار سمجھ لیتے ہیں
بعض اوقات وہ انکار نہیں بھی ہوتا

بول اٹھتے ہیں محبت میں رویے بھی کرن
صرف لفظوں میں ہی اظہار نہیں بھی ہوتا

کرن گوندل

غزل

سننے والے سنانے والے لوگ
ہم ہیں گزرے زمانے والے لوگ

کیوں کسی پھول سے حسد کریں گے
اپنی بیلیں اگانے والے لوگ

ہم کسی کو برا نہیں کہتے
ہم مویشی چرانے والے لوگ

تم نے جا کر بتا دیا سب کو
ایسے جاتے ہیں جانے والے لوگ

یہ ہتھیلی پہ کام کرتے ہیں
یہ ہیں سرسوں جمانے والے لوگ

مجھ کو باہر سے آگ لگتے ہیں
مرا اندر جلانے والے لوگ

تجھ کو باتیں بتانے والے ہم
تیری باتوں میں آنے والے لوگ

حافظ الیاس حافظ

غزل

ہزار لوگوں سے جاں چھڑوائی تمہاری باتوں میں آ گئی ہوں
میں وشتِ وحشت سے بھاگ کر بھی نئے عذابوں میں آ گئی ہوں

یہ کن ہواؤں میں سانس لیتی ہوں چار جانب یہ کیا نشہ ہے!
گلاب جیسی مہکتی ہوں کیا تمہارے گاؤں میں آ گئی ہوں؟؟

فلاں کی آنکھوں سے خواب دیکھوں؟ فلاں لبوں والے گیت گاؤں؟
گھماؤ چابی، نچاؤ گڑیا، تمہارے ہاتھوں میں آ گئی ہوں

ہر ایک راحت ملی ہوئی تھی حیات جنت بنی ہوئی تھی
میں ماں سے کیا دور ہو گئی ہوں دکھوں کی بانہوں میں آ گئی ہوں

یہ جاں لٹا دوں گی، سر کٹا دوں گی، جی حضوری نہیں کروں گی
کہ میں پجارن نہیں ہوں جانے کیوں ان خداؤں میں آ گئی ہوں

شمع ملک

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پھوٹیں ہوا کی شاخ پہ لہروں کی پتیاں
کھلنے کو پھر کوئی گلِ گرداب اور ہے

غزل

اسی سبب سے ترے شہر سے رہا پیچھے
کہ بوڑھا باپ نہ ہو منتظر مرا پیچھے

پرانا دوست ہی کمزوریوں کو جانتا ہے
وہی بتائے گا ہر عیب برملا پیچھے

خدا کرے کبھی معلوم بھی نہ ہو پائے
میں کس کا نقش قدم چومتا گیا پیچھے

جہاں میں ماں سا کوئی دوسرا نہیں ہوتا
کہ ہم نے دیکھا ہے ثابت شدہ خلا پیچھے

میں اُس کے ساتھ رہا ہر جگہ مصیبت میں
پھر ایک دن مجھے اس نے کہا، ذرا پیچھے

تھکن کے دور میں طلحہ بہت ضروری ہے
پسِ گمان کوئی ماں ہو کھڑا ہی پیچھے

طلحہ غفور

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

گلشن کا دھوکا ہوتا ہے، سناٹوں کے شہر پر
گلی گلی پرتو ہے اس کی آہٹ کی مہکار کا

تہذیبی اسلامیت اور پاکستانی قومی تشخص

جلیل عالی

قوم کا جو تصور کتابوں میں ملتا ہے، اس میں عموماً زبان، جغرافیے اور نسل کو قومیت کی اساس قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن جب یہ کتابی تعریف ہمیں ناکافی محسوس ہوتی ہے تو ہم اس کے جواب میں ایک دوسری انتہا پر جا کھڑے ہوتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ پاکستان اسلام کے نام اور اسلامی تصورِ قوم کی بنیاد پر بنا ہے، اس لیے یہ قوم صرف اسلام کی بنیاد پر وجود میں آئی ہے۔ مگر یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر قومیت کی بنیاد صرف اسلام ہے تو پھر ترکی، انڈونیشیا، ایران اور دوسرے مسلم ممالک کی جدا جدا قومیت کی تفہیم کیسے ہو؟ ظاہر ہے کہ جتنے مسلم ممالک ہیں، اتنی ہی الگ الگ قومی وحدتیں بھی موجود ہیں۔ اس لیے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ پاکستانی قومیت کی اصل بنیاد کیا ہے اور جس بنیاد پر پاکستان حاصل کیا گیا، اس کی نوعیت کیا تھی۔

اس بحث کو سمجھنے کے لیے ہمیں کچھ پیچھے جانا ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مذہبیت بنیادی طور پر خیر و شر کے تصور پر قائم ہوتی ہے، اور یہ تصور آفاقی ہے۔ قرآن مجید کے مطابق اچھائی اور برائی کا شعور انسان کو وہبی طور پر دیا گیا ہے۔ اگر انسان کے اندر خیر اور شر میں تمیز کرنے کی استعداد موجود نہ ہوتو کوئی پیغمبر اس سے مخاطب نہیں ہوسکتا، کوئی فلسفی اس سے مخاطب نہیں ہوسکتا، کوئی مصلح اس سے مخاطب نہیں ہوسکتا۔ گویا ایک ہی بنیادی فیکلٹی ہے جس کو مخاطب کیا جاتا ہے، متحرک کیا جاتا ہے، منظم کیا جاتا ہے اور پھر ایک تحریک کی صورت دی جاتی ہے۔

اس اعتبار سے مذہبی قیادت کو سامنے رکھا جائے تو ہر مذہب کی تاریخ کو بڑی آسانی سے دو ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ جب تک مذہب کا داعی یا پیغمبر زندہ ہوتا ہے، وہ الوہی مذہبیت کا زمانہ ہوتا ہے۔ اس دور میں قدم قدم پر اللہ کی طرف سے رہنمائی آرہی ہوتی ہے کہ اس مرحلے میں یوں کرو، اب یوں کرو اور اب یوں کرو۔ اس میں بحث واختلاف کی قطعی گنجائش نہیں ہوتی۔ لیکن جب پیغمبر کی وفات ہو جاتی ہے تو اس الوہی مذہبیت کو تہذیبی مذہبیت میں ڈھلنا پڑتا ہے۔ یہ

تمام مذاہب کا مقدر ہوتا ہے۔
پیغمبر کی موجودگی میں جو بنیادی تحریک ہوتی ہے، اس کے طویل تاریخی اثرات فوری طور پر پوری طرح ظاہر نہیں ہوتے - اسی لیے ہمارے بہت سے مسلم دانش ور یا علما بڑی آسانی سے کہہ دیتے ہیں کہ اسلام صرف تیئس سال تک رہا اور اس کے بعد کا زمانہ محض صرف مسلمانوں کی تاریخ پر مشتمل ہے۔
مجھے اس موقف میں نعوذ باللہ رسولؐ اللہ کی تخفیف کا پہلو محسوس ہوتا ہے۔ وہ یوں کہ کیا رسولؐ اللہ نے تاریخ کو جو حرکت دی تھی اس کے اثرات صرف تیئس سال تک محدود ہو گئے؟ حقیقت یہ ہے کہ نظام کوئی بھی ہو، وہ تاریخ کے ارتقا کے ساتھ بدلتا ہے۔ غلامی کا نظام رسول اللہ کے زمانے میں بھی بطور ادارہ پوری طرح ختم نہیں ہوا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم قیامت تک اسلام میں غلامی کا جواز ڈھونڈتے رہیں۔ ہمیں اس آیت کی طرف بھی دھیان دینا چاہیے جس میں فرمایا گیا ہے کہ
'تمھیں ایک سخت گھاٹی سے گزرنا ہے، اور وہ گھاٹی کیا ہے؟ وہ ہے گردنوں کا چھڑانا۔'
یہ کام سب سے پہلے مسلمانوں کو انجام دینا چاہیے تھا کہ غلامی کے ادارے کو ختم کرتے، لیکن انھوں نے یہ کام نہیں کیا۔ اس سے ہماری تاریخی ذمہ داریوں کا ایک دوسرا پہلو سامنے آتا ہے۔
تہذیبی مذہبیت میں ارتقا بھی ہوتا ہے، وسعت پذیری بھی ہوتی ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ ہیں:
"کُلَّ یَوۡمٍ ھُوَفِیۡ شَاۡن"
ہر دن ایک نئی شان ہے
اقبال مومن کو بھی اللہ کا نائب ہونے کی حیثیت سے ایسا ہی دیکھنا چاہتا ہے۔ اور کہتا ہے:
ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان، نئی آن
گفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان

....

تہذیبی مذہبیت کی نمو ہر خطے میں ایک ہی صورت اختیار نہیں کرتی۔ مثال کے طور پر ہمارے ہاں ایران اور برصغیر کی تہذیبی اسلامیت میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ
"باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار"
ہمارے ہاں یہ رویہ ایک تہذیبی موقف کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ لیکن کیا سعودی عرب میں یہ بات اسی طرح لی جاتی ہے؟ نہیں لی جاتی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی اسلامی تہذیبی جوہر مختلف خطوں میں مختلف تہذیبی صورتیں اختیار کرتا ہے۔
اسلامی تہذیبی جوہر جہاں بھی جاتا ہے، وہاں چار جہتی عمل کرتا ہے۔
پہلی جہت تشکیل کی ہے یعنی خیر و شر میں تمیز کی آفاقی استعداد کی بنیاد پر اچھے مقامی تہذیبی عناصر کو من و عن قبول کر لیا جاتا ہے۔ یہاں بہت سے لوگوں کو مغالطہ ہوا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسلام جہاں جاتا ہے، وہاں کے کلچر کو اپنا لیتا ہے۔ یہ بات

درست نہیں۔ اسلامی تہذیبی جوہر انفعالی نہیں، فعال انداز میں عمل آرا ہوتا ہے۔ وہ اپنے فریم ورک کے اندر چیزوں کو قبول کرتا ہے۔ اپنے معیار خیر پر پورا اترنے والے ثقافتی وتہذیبی مظاہر کو ایک شرح صدر کے ساتھ اپنا لیتا ہے۔

دوسری جہت ترمیم کی ہے۔ مثال کے طور پر برصغیر کی روح میں موسیقی بہت گہرائی سے موجود تھی۔ یہاں کے مذہب کا بھی وہ حصہ تھی۔ اسلام میں موسیقی سے ایک طرح کا ابا دپایا جاتا تھا، لیکن خواجہ خورشید انور جیسے بڑے موسیقار کے بقول برصغیر کے اکثر بڑے کلاسیکی موسیقار مسلمان تھے۔ غور کیجیے کہ جن کی تہذیب میں موسیقی کے بارے میں ایک تامل تھا، وہ اس فن میں آگے نکل گئے، اور جن کی تہذیب کا وہ جزو تھی، وہ پیچھے رہ گئے۔

اس کی ایک وجہ مجھے یہ محسوس ہوتی ہے کہ مسلمانوں کا تنزیہی تصور توحید فن کار کے سامنے لامحدود آفاق کھول دیتا ہے۔ یہاں کا غیر مسلم فن کار ایک ایسے کلچر سے تعلق رکھتا تھا جس میں خدا کے کسی خاص تصور کو تصویر یا بت کی صورت دے لی جاتی تھی۔ اس عمل سے ایک حد قائم ہو جاتی ہے، ایک مرحلے پر شعور رک جاتا ہے۔ لیکن توحید تنزیہی کے باعث کوئی حتمی شکل، کوئی آخری تصویر نہیں بن سکتی۔ ایک لامتناہیت ہے جس کا کوئی اختتام نہیں۔ ایک بزرگ مسلمان موسیقار، جس کی عمر نوے برس کے قریب تھی، سے کسی نے پوچھا کہ موسیقی کے اتنے طویل سفر کے بعد آپ کو کیسا محسوس ہوتا ہے؟ اس نے کہا "موسیقی اب کچھ کچھ سمجھ آنے لگی ہے تو زندگی کی مہلت ختم ہو رہی ہے۔" یہ ہیں توحید تنزیہی کے اثرات۔

اسی طرح یہاں جلوسوں کی ایک تہذیبی روایت تھی۔ دیوی دیوتاؤں کے جلوس نکالے جاتے تھے۔ اسلامی تہذیبی جوہر نے اس روایت کی روح کو بدل دیا۔ ذوالجناح اور عید میلادالنبیؐ کے جلوسوں کی صورت میں ایک نیا تہذیبی مفہوم پیدا ہوا۔ بھجن کو قوالی میں تبدیل کر لیا گیا۔

تیسری جہت تنسیخ کی ہے۔ یہاں کے مسلمان نہ ایران سے آئے تھے نہ عرب سے۔ یہیں کے لوگ تھے، جن میں بڑی تعداد نچلی ذات سے تعلق رکھنے والے ہندوؤں کی تھی جو عزت ملنے پر اسلام میں داخل ہوئے۔ جو ہندو مسلمان ہوا، اس نے بت پوجنا چھوڑ دیا۔ جو ہندو عورت مسلمان ہوئی، اس نے ستی ہونا چھوڑ دیا۔ مسلمانوں نے ذات پات ترک کر دی۔ حتیٰ کہ ایک معنی میں عضویاتی تبدیلی بھی پیدا ہو گئی۔ صدیوں سے گائے کی پوجا کرتے چلے آنے والے لوگ جب مسلمان ہوئے تو گائے کا گوشت کھانے لگے۔ آپ آج کسی ہندو کے حلق سے گائے کی بوٹی اتار کر دکھا دیں، یہ ممکن نہیں۔ یہ کوئی چھوٹی تبدیلی نہیں تھی۔ یہ ایک کرشمہ تھا، ایک تہذیبی معجزہ تھا کہ اسلامی تہذیبی جوہر نے صدیوں کی عضویاتی فعلیت تک کو تسخیر کر لیا۔

اقبال کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی تہذیب میں پاپائیت نہیں ہے، ہو ہی نہیں سکتی۔ یہ بہت بڑا اشارہ ہے۔ اقبال یہ بھی کہتے ہیں کہ رسول اللہ اس لیے بھی خاتم النبیین ہیں کہ انسانیت

بلوغت کے مرحلے تک پہنچ گئی تھی۔ انسان کو بڑے بڑے رہنما اصول مل گئے تھے، اب ان کے اندر رہ کر اسے فیصلے خود کرنے تھے۔ ایک عرصے تک مسلمان قرآن کے لغوی معانی کے ساتھ اپنے علوم وفنون کی تطبیق کرتے رہے۔ چوں کہ یہ ایک نیا اور ترقی یافتہ مذہب تھا، اس لیے اس نے بہت کچھ ایسا عطا کر دیا جو کئی صدیوں تک تطبیق کے تقاضوں سے عہدہ برا ہوتا رہا۔ لیکن تاریخ کے آگے بڑھتے چلے جانے کے باعث تعبیر کی ضرورت پیدا ہو گئی۔ یہاں یہ مسئلہ سامنے آیا کہ اسلام کے اندر رہ کر فکر پر نظر ثانی کی جائے۔ اقبال کے خطبات کا نام Reconstruction of Religious Thought in islam ہے۔ اقبال کوئی اسلام کی نئی تشکیل نہیں کر رہے تھے اسلام کے اندر فکر کی نئی تشکیل کر رہے تھے۔

چوتھی جہت تخلیق کی ہے۔ اس کے بغیر تہذیب مردہ ہو جاتی ہے۔ کسی تہذیب کی زندگی کا اصل امتحان یہی ہے کہ وہ نئی چیزیں کتنی پیدا کرتی ہے۔ یہ "کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ" کا تہذیبی اظہار ہے۔ جسے اقبال نے اپنے ایک شعر میں یوں بیان کیا کہ

ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

....

اس فریم ورک کے تحت دیکھا جائے تو پوری دنیا کے مسلم ممالک اپنی الگ الگ شناخت رکھتے ہیں، مگر سب ایک بڑی وحدت سے بھی منسلک رہتے ہیں۔

جب علامہ اقبال مولانا حسین احمد مدنی کے جواب میں یہ کہہ رہے تھے کہ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد وطن سے نہیں مذہب سے منسلک ہے۔ تو انھوں نے رسول اللہ سے وفاداری کو اس کا مرکزی نقطہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ:

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

....

تو وہ مذہبی بنیاد کا اطلاق برصغیر کے تناظر میں کر رہے تھے۔ پوری دنیا کے مسلمانوں کے لیے ایک ملک کا مطالبہ نہیں کر رہے تھے۔ وہ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک مخصوص قومیت کی بات کر رہے تھے۔ یہ قومیت نہ اس سادہ معنی میں مذہبی قومیت تھی جس طرح عام طور پر سمجھ لی جاتی ہے، نہ معروف معنوں میں نسل پر مبنی تھی، نہ ایک زبان پر، نہ ایک جغرافیے میں محدود مقامی آبادی پر۔ پاکستان میں تو دوسرے علاقوں کے بھی بہت لوگ ہجرت کر کے آباد ہو گئے تھے۔ اور یہ کئی زبانوں، کئی قومیتوں اور کئی نسلوں کا مجموعہ ہے۔ اس لیے اسے یوں سمجھنا چاہیے کہ یہ ایک ہند اسلامی تہذیبی قومیت تھی جس کے لیے الگ وطن کا مطالبہ کیا گیا۔ یہ کوئی مجرد چیز نہیں تھی بلکہ ایک ٹھوس تہذیبی حقیقت تھی جو برصغیر کی مسلم تاریخ سے پیدا ہوئی تھی۔

قائداعظم نے تو یہ کہہ کر کوزے میں دریا بند کر دیا تھا کہ پاکستان اسی روز بن گیا تھا جب پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا۔ لیکن اسی روز ایک نئی تہذیبی

وحدت کی تشکیل آغاز ہوگئی تھی۔ وقت گزرتا گیا تو اس تہذیبی اکائی نے اپنا فنِ تعمیر پیدا کیا، اپنی موسیقی پیدا کی، اپنی زبان پیدا کی۔ اردو زبان اسی تہذیبی ضرورت کی پیداوار ہے۔ آپ نے تبلیغ کرنی تھی، تہذیبی ابلاغ کرنا تھا، چناں چہ ایک لچکیلی زبان پیدا ہوئی۔ ایک نئی زبان پیدا کرنا کوئی چھوٹی بات نہیں۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے کبھی پاکستان میں نہیں آنا تھا، وہ اجتماعی بصیرت کے اعتبار سے زیادہ سمجھ دار ثابت ہوئے۔ انکا انفرادی مفاد نہیں تھا، مگر انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ برصغیر میں ایک مسلم مملکت بننے کے آئندہ کیا معنی ہوں گے۔ اسی لیے انھوں نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا۔ ہمارے بہت سے لوگ الزامی انداز میں یہ کہتے ہیں کہ وہ مسلمان جو ہندوستان میں رہ گئے ان کے ساتھ زیادتی ہوگئی۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ان کی رائے کیا تھی اور اس رائے کے پیچھے شعور کیا تھا۔ وہ آج بھی پاکستان کے لیے دعائیں مانگتے ہیں۔ کرکٹ میچ کے دوران وہ پاکستان کے جھنڈے لہرانے لگتے ہیں، نعرے لگاتے ہیں۔ مشرقی پاکستان کا معاملہ دیکھیے، کشمیر کی داخلی آزاد تحریک دیکھیے۔ ہمارے زوال کی بہت باتیں کی گئی ہیں، لیکن کیا کوئی تحریک کسی زوال آمادہ طاقت سے حوصلہ لیتی ہے؟ کشمیر میں پاکستان کے جھنڈے کیوں لہرائے جاتے ہیں؟ پوری دنیا کے مسلمان پاکستان کی طرف کیوں دیکھتے ہیں؟ تشکیلِ پاکستان کتنی بڑی تاریخی پیش رفت ہے، ہم نے ابھی تک اس کی اہمیت کو نہیں سمجھا۔

روس سے جو مسلمان ریاستیں آزاد ہوئیں، اس میں بھی پاکستان کا کردار تھا۔ کیوں نہ ہوتا؟ روس نے پاکستان توڑنے میں گھناؤنا کردار ادا کیا تھا۔ جب روس نے وہاں اسلام کی بے توقیری کی تھی تو کیا ہم اسے بھول جائیں؟ ہم نے جو کیا، اچھا کیا۔

گاندھی سے کسی نے کہا کہ مسلمان آپ سے الگ ملک مانگتے ہیں، انھیں دے کر جان چھڑائیں۔ گاندھی نے کہا کہ یہ کوئی معمول بات نہیں ہوگی۔ یہ تاریخ میں بہت بڑا بریک تھرو ہوگا۔ جس علاقے میں وہ الگ وطن مانگ رہے ہیں، وہ مشرقِ وسطی اور مسلم دنیا سے منسلک ہے۔ دشمنوں کو معلوم تھا کہ یہ کتنی بڑی پیش رفت کا معاملہ تھا، لیکن تب یہ بات کئی اپنوں کو سمجھ نہ آئی اور بہت سوں کو ابھی تک سمجھ نہیں آرہی۔

اقبال نے خطبۂ آلہ آباد میں ایک اور بڑی بات کہی تھی۔ انھوں نے کہا تھا کہ جب ہم ایک الگ وطن بنا لیں گے تو ہمیں موقع ملے گا کہ ہم اسلام کے چہرے سے عرب کلچر کی استعماری چھاپ اتار سکیں، وہ چھاپ جو بادشاہتوں کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے یہاں اسلامیت کی ایک بے حد منفرد اور متحرک صورت پرورش پا رہی ہے۔ مسلم دنیا کے دوسرے ممالک کے مقابلے میں یہاں کی اسلامیت زیادہ متحرک اور آفاقی ہے اور اسی بنا پر یہ عالمی سطح پر بھی ہمیں کبھی شرمندہ نہیں ہونے دیتی۔ ایٹم بم کے معاملے میں بھی طویل عرصے تک ہمارا ریاستی موقف یہی رہا کہ جنوبی ایشیا کو ایٹمی ہتھیاروں سے پاک ہونا چاہیے۔ ہم نے کبھی نسلی

تقدس کی حمایت نہیں کی، بھارت نے کی ہے اور اب بھی کر رہا ہے۔ آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ بھارت میں پچھتر برس تک سیکولرزم کا چرچا ہوتا رہا، بغیر کسی تعطل کے جمہوریت چلتی رہی، لیکن آج لوگوں کے اکثریتی ووٹوں سے ہندوتوا والی فسطائی جماعت وہاں حکمران ہے۔

پاکستان کی تہذیبی قوت دیکھیے۔ یہاں جمہوری اجماع کو روکنے کے لیے چار مارشل لا لگتے ہیں اور اپنی مدد کے لیے دس دس سال ملائیت کی پرورش کرتے ہیں، اس کے باوجود جب الیکشن ہوتا ہے تو ملائیت کو پانچ فیصد ووٹ بھی نہیں ملتے۔ سادہ لفظوں میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ پاکستانی کبھی اسلام چھوڑیں گے نہیں اور ملا کی قیادت قبول نہیں کریں گے۔ اسی طرح کی ایک ملائیت اشتراکیت کی طرف سے آئی تھی، اب وہ سیکولر ملائیت میں بدل گئی ہے۔

ایک چیز اور دیکھیے کہ پاکستانی صرف اسلامی تہذیبی قوت سے متحرک ہوتے ہیں۔ اگر کوئی بات سمجھ نہ آئے تو استحصالی قوتوں کی طرف دیکھ لیا کریں۔ استحصالی زیادہ سمجھ دار ہوتے ہیں۔ انھیں معلوم ہوتا ہے کہ کون سی تہذیبی قوت سے کیا کام لیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے جلسوں میں سیاسی رہنماؤں کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ ذرا اسلامی ٹچ بھی لگائیں۔ تو اسلامی ٹچ کے بغیر آپ کی کوئی تحریک نہیں چلتی۔ مان لینا چاہیے کہ ہماری اصل قوت تہذیبی اسلامیت ہی ہے۔

اگر مختلف مسلم ممالک کی پہچان سمجھنی ہو تو ایک تو یہ دیکھیے کہ چاہے کوئی مسلم ملک اپنے نام کے ساتھ اسلامی لاحقہ لگائے یا نہ لگائے پوری دنیا سب کو اسلامی ممالک ہی کہتی ہے۔ ہمارا ایٹمی دھماکا کسی مذہبی قیادت کے زمانے میں تو نہیں ہوا تھا پھر بھی غیر مسلم دنیا کی طرف سے اسے اسلامی بم کا نام دیا گیا۔ میں تہذیبی بیانیے کی بات کر رہا ہوں۔ اس بیانیے کے ذریعے قوم کے ساتھ کیا کیا دھوکے ہوئے، یہ الگ موضوع ہے۔ یہاں صرف یہ عرض ہے کہ ہماری اجتماعی تحریکی قوت تہذیبی مذہبیت ہے۔

آج برصغیر میں ہماری تین تہذیبی قومی شناختیں ہیں۔ بنگلہ دیشی اسلامی تہذیبی شناخت، پاکستانی اسلامی تہذیبی شناخت اور ہند اسلامی تہذیبی شناخت۔ اسی طرح تمام مسلمان ملک اپنی الگ الگ پہچان رکھتے ہیں، لیکن کسی مسلمان ملک کی کلی شناخت اسلامی عنصر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت ایران اور عراق ہیں۔ شاید ہی کوئی مسلمان معاشرہ ایسا ہو جو اپنی قدیم تاریخ پر اتنا فخر کرتا ہو جتنا ایران اور عراق کے لوگ کرتے ہیں، لیکن کیا اسلام کے بعد وہ وہی رہ گئے جو پہلے تھے؟ اسلام جہاں جاتا ہے، کسی معاشرے کو پہلے جیسا نہیں رہنے دیتا۔ وہ اس میں انفعالی طور پر نہیں ایک فعال عنصر کی حیثیت سے عمل آرا ہوتا ہے۔ بیسویں صدی کے آخر میں ایرانی انقلاب آیا۔ کیا آپ نے اس انقلاب میں کہیں قدیم ایرانی تاریخ کا کوئی حوالہ سنا؟ اس موقع پر مجھے اپنا ایک شعر یاد آ رہا ہے۔ کہ

ایک تاریخ حنوطی ہے عجائب گھر میں
ایک تاریخ لہو بیچ رواں رہتی ہے

....

جو تاریخ آپ کے لہو میں رواں رہتی ہے، وہ راجا داہر کو ہیرو نہیں مان سکتی- وہ محمد بن قاسم کو ہیرو مانے گی- اسی طرح آپ پرتھوی راج کو اپنا ہیرو نہیں مانیں گے، محمود غزنوی کو مانیں گے- بڑے پڑھیں، اسے اپنے نصابوں میں بھی شامل کریں، موہنجوداڑو کو بھی شامل کریں، لیکن آپ انھیں ہمارے لہو کی حرارت نہیں بنا سکتے-

میں نے ایک شعر میں بھی یہ بات یوں کہہ رکھی ہے کہ

ہم حرائی ہیں زمانے کو خبر ہے لیکن
اپنے داناؤں کا دل اس پہ ٹھہرتا نہیں ہے

میری یہ باتیں سیکولرسٹوں کو بھی اچھی نہیں لگتیں، اشتراکیوں کو بھی اچھی نہیں لگتیں اور اپنے رجعت پسند اسلامیوں کو بھی پسند نہیں آتیں- میں ذرا جلی الفاظ میں یہ بات کہہ رہا ہوں کہ آج آپ غلاموں سے اچھے سلوک کے ساتھ غلامی کا جواز نہیں نکال سکتے- غلامی کا خاتمہ اسی حرکتِ خیر کا ثمر ہے جو رسول اللہؐ نے تاریخ کو دی تھی- آیندہ جتنی بھی اچھی پیش رفتیں ہوں گی، ان میں قرآن اور رسول اللہؐ کی برکات دکھائی دیتی رہیں گی- حضورؐ نے معاشرے کو قبائلی سطح سے ارتقائی سمت میں حرکت آشنا کیا اور نسبت و تناسب کی اعتباریت میں اپنے عہد کو خیر القرون بنا دیا-

اب اس پورے فریم ورک سے ہماری ذمہ داریوں کے تقاضے بھی بدل جاتے ہیں- پہلی بات یہ ہے کہ کوئی نہ فرشتہ ہوتا ہے نہ شیطان- اسلام ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ اعمال کو دیکھو- مسلمانوں کی تہذیب میں آپ کسی کو جنت یا دوزخ کا سرٹیفکیٹ جاری نہیں کر سکتے- پاپائیت یہ کرتی رہی ہے- اقبال نے روحانی جمہوریت کے حوالے سے بتایا کہ اجتماعی سروکاروں والا مذہب اجماعِ امت سے طے ہوگا- آپ کے ذاتی عقائد جیسے بھی ہوں، آپ شوق سے ان پر عمل پیرا ہوں- اجتماعی معاملات میں جمہور کے اجماع کے سامنے سرِتسلیم خم کریں-

ہمیں معروضی صورت حال بھی سامنے رکھنی چاہیے- مغرب نے تین چار سو سال پہلے سے مذہب کو اجتماعی دائرے سے بے دخل کر رکھا ہے- کیوں کہ ان کے ہاں مذہب سائنسی تحقیق میں رکاوٹ بنتا تھا، سماجی پیش رفت میں رکاوٹ بنتا تھا- انھیں اس سے نجات حاصل کرنی پڑی- اسلام ایک توازن اور اعتدال کے ساتھ چلتا ہے، اور اس کے اجتماعی سروکار اتنے زیادہ ہیں کہ اسے آپ معاشرہ بدر نہیں کر سکتے- تہذیبی اسلامیت اجتماعی سروکار سے دست بردار ہونے سے انکاری ہے-

اس کا ثبوت یہ ہے کہ بیسویں صدی کے وسط میں اسی تہذیبی مذہبیت نے پاکستان بنا دیا- بیسویں صدی کے آخر میں اسی تہذیبی قوت سے ایران میں انقلاب برپا ہوا- اسی تہذیبی قوت سے افغانوں نے پہلے روسی سامراج کو اپنے ملک سے نکالا، پھر پچاس ملکوں کو ساتھ ملا کر قبضہ جمانے والے دوسرے سامراج کو

نکالا۔ اگر استعمار خود آپ کو یہ کریڈٹ دے رہا ہے تو آپ اسے لینے سے کیوں انکار کریں۔ جو بائیڈن کے اس بیان کو کہ
"افغانستان میں ہماری شکست کے پیچھے پاکستان کا ہاتھ ہے۔"
اپنے لیے اعزاز سمجھنا چاہیے۔

البتہ یہ حقیقت ہے کہ پاکستان دو ہیں۔ ایک پاکستان پاور کلب کا ہے، اور ایک پاکستان ہم سب کا ہے۔ سب کے پاکستان میں پاور کلب بھی شامل ہے۔ بادشاہ کون سے بڑے بندے کے پتر ہوتے تھے؟ چاہے مسلمان بادشاہ ہوں چاہے غیر مسلم۔، بادشاہت کا نظام تو ایک تھا۔ پھر ول ڈیورانٹ کو یہ کیوں کہنا پڑا کہ جتنی تہذیبیں گزر چکی ہیں، ان سب میں مسلمانوں نے انسانی اقدار کی سب سے بہتر پاس داری کی ہے۔ ہمارے لیے اس میں اپنے تہذیبی جوہر کو سمجھنے کا اشارہ موجود ہے۔

ہمارا تہذیبی جوہر اتنا طاقت ور ہے کہ اس کے سامنے اکبر اعظم جیسے طاقتور بادشاہ کا دین الٰہی نہ چل پایا۔ چل ہی نہیں سکتا تھا۔ بادشاہت کے زمانے میں علما کی صورت میں، صوفیا کی صورت میں، تہذیبی دانشوروں کی صورت میں ایک مستقل دباؤ موجود رہتا ہے۔ یہی صورت پاکستانی صورتِ حال میں بھی موجود ہے۔ پاور کلب جتنا چاہے زور لگا لے ہمارے تہذیبی وجود پر مکمل تصرف حاصل نہیں کر سکتی۔ اس لیے میں ہمیشہ اسی پاکستان کی بات کرتا ہوں جو ہم سب کا ہے۔ تہذیبی زندگی کے لیے ضروری ہے کہ اقبال کے اس بصیرت افروز نکتے کو سامنے رکھا جائے کہ

صورتِ شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب

....

حق شعاری کا ایک واقعہ عرض کرتا ہوں۔ صفدر میر ایک نامور ادیب وصحافی تھے، جو زینو کے نام سے انگریزی کالم لکھتے تھے۔ وہ پکے کمیونسٹ تھے۔ لیکن 1965 میں جب بھارت کے ساتھ ہماری جنگ ہوئی تو انھوں نے ایک ٹرک پر سٹیج بنایا، مائک اور سپیکر رکھا اور لاہور کی سڑکوں پر اپنی ایک طویل نظم پڑھتے ہوئے گھومتے رہے۔ اس نظم کی چند سطریں سنیے:

میری آنکھوں میں خون اتر آیا ہے
تیری آنکھوں میں خون اتر آیا ہے

بیس کروڑ آنکھوں میں خون اتر آیا ہے
غازی صدر ایوب کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہے

....

ہمارے ٹینک بڑھتے ہیں علی حیدر! علی حیدر!
جہاں تک تم چلو گے ہم تمھارے پیچھے آئیں گے
علی حیدر! علی حیدر! علی حیدر! علی حیدر!

اس وقت مغربی اور مشرقی پاکستان کو ملا کر کل آبادی کے لحاظ سے بیس کروڑ آنکھوں کا استعارہ استعمال کیا گیا تھا۔ وہ شخص جو مسلسل ایوب خان کے خلاف لکھتا رہا تھا، سب کے پاکستان کی خاطر آمر ایوب کو بھی غازی صدر ایوب کہہ رہا تھا۔ وطنِ عزیز اور اپنے اجتماعی تہذیبی وجود کے لیے ہمیں اسی طرح کی وضع داری، فراخ دلی اور کشادگی کی ضرورت ہے۔

☆☆☆☆☆

اِس خوبصورت شہر لاہور میں میری جسارتیں

ایک اور میٹھی سی یاد نہاں خانہ دل سے اُبھر کر سامنے آگئی ہے۔ یہ غالباً 1954 یا 55 کا ذکر ہے۔ امریکہ ہمارے ان داتا نے اس نئے دیش کے غریب غربا کے لیے یقیناً بناسپتی گھی خیر سے صدقہ زکوۃ کی مد میں بھیجا۔ جس نے 5 کلو کے ڈبوں کا ایک مینا بازار ہمارے علاقے صدر بازار کے گول باغ میں بھی سجا دیا۔ اس کا اعلان منادی کرنے والوں نے زور وشور سے ڈھول بجا بجا کر علاقے کی سڑکوں اور بازار میں کیا۔ اب کہیں ممکن تھا کہ مجھ جیسی آوارہ گرد پھراوندو کے کانوں میں یہ پکار نہ پڑتی۔ بڑی اور میں نے اماں سے کوئی بات کیے بغیر یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ کل مجھے تو اس گھی کو گھر میں لانا ہی لانا ہے۔

اماں سے پوچھنا فضول تھا کہ ابا کی قلیل سی تنخواہ میں گزارہ کرنا اُن کے لیے ایسا ہی تھا کہ جس کے لیے کہا جائے۔ کیا ننگی نہائے اور کیا نچوڑے، مہینہ تو جیسے سوئی کے نکے میں سے گزرنے جیسا تھا۔ حالات کی اس درجہ نزاکت کے باوجود اماں کے ہاں شکر تھا اور اپنا بھرم رکھنے کا حوصلہ بھی تھا۔ انھوں نے کیا مجال کہ یہ نیا نیا بناسپتی گھی بازار میں آجانے کے باوجود بھی خریدا ہویا اُسے کسی سے مانگ کر ہنڈیا میں ڈالا ہو کہ اس کا استعمال ان دنوں ایک طعنہ ایک میہنا سمجھا جاتا تھا۔ غریب لوگ بھی چوری چھپے استعمال کرتے تھے۔

ہاں البتہ ہماری دائیں جانب کے اردو بولنے والے ہمسائے جو انبالہ، سہارن پور اور پانی پت سے آئے تھے اکثر اس سے صبح کو پراٹھے بناتے تھے۔ سچی بات ہے مجھے تو اس کی خوشبو بہت بھاتی تھی۔ چند بار میں نے ملتجی سے لہجے میں کہا بھی مگر اماں نے یوں گھُر کا جیسے کھا ہی تو جائیں گی۔

یہ غالباً جولائی یا اگست کے دن تھے۔ ہماری سکول سے چھٹیاں تھیں۔ علی الصبح اٹھ کر ہم

سلمیٰ اعوان

منہ ہاتھ دھو کر سکول کا کام کرنے بیٹھ جاتے۔ حساب کے سوال، خوشخطی کا صفحہ، معاشرتی علوم کا کام دینیات کے دو مشقی سوال ہر روز کا یہ کام تقریباً نو بجے تک میں کر کے میں فارغ ہو جاتی۔ اس دن بھی نو بجے میں نے زیڈ کی نب والا ہولڈر، کالی سیاہی والی دوات اور اپنا بستہ سمیٹ کر اپنے کمرے میں رکھا اور چپکے سے نکل کر گول باغ جا پہنچی۔ وہاں لوگوں کا ایک جم غفیر تھا۔ تقسیم ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ نو دس سال کی لڑکی کن سوئیاں لیتی مجمع میں گھستی آگے سے آگے پہنچنے کی تگ و دو میں جت گئی تھی۔

آج سوچتی ہوں اور داد دیتی ہوں اس وقت کو جب لوگوں میں صبر تھا، برداشت تھی۔ بچوں کی ایسی الٹی بلٹی حرکتیں دیکھ کر ان پر ہنسنے اور انہیں اُن کی من چاہی مرضی کرنے دینے کا چلن تھا۔ اب جب بانٹ شروع ہوئی میری چیخ و پکار اور ننھی سے بازوؤں کا لہرانا دیکھنے کے قابل تھا۔ بچہ سمجھ کر پانچ کلو کا ڈبہ عنایت ہو گیا۔ کسی فاتح کی سی شان سے میں اُسے گھر لائی۔ ڈیوڑھی کے بڑے دروازے کے پیچھے چھپا کر اماں کو خبر کی۔ اماں کا میری ہر ایسی حرکت پر سر پکڑ کر بیٹھنا معمول کی بات تھی۔ اب میں ان کا بازو پکڑ کر اُسے تھپکتے ہوئے بار بار کہہ رہی ہوں۔

"ارے اماں اس کے پراٹھے بہت مزے کے بنتے ہیں۔ اکمل کے گھر میں نے کھائے تھے۔"

اکمل میری ہم عمر ہماری ہمسائی تھی۔

اماں نے اسے چھپا دیا اور سچی بات ہے کہ جب میری نانی ایک ماہ بعد اپنے بیٹے کے پاس گلگت گئی تو اماں نے ڈبے کو کھولا اور پراٹھے پکائے۔ خدا گواہ ہے اس امریکی گھی کی خوشبو اور لذت کیا شاندار تھی؟ کہ آج بھی میں اُسے سونگھ سکتی ہوں۔ اُس ذائقے کو محسوس کر سکتی ہوں۔

سچ تو یہ ہے کہ میں بہت چٹوری تھی۔ ہمارے گھر کے داہنے ہاتھ رہنے والے لوگ سہارن پور کے اردو بولنے والے مہاجر تھے۔ جن کے ہاں کھانا پکانے کا بہت اہتمام ہوتا۔ سل بٹے پر سب کھڑے مسالے بمعہ چھلکوں سمیت لہسن تک کو باریک پیسا جاتا۔ اس گھر میں یہ تین بھائی ان کی والدہ اور اُن کی فیملیز جو ایک ایک کمرے میں رہتے تھے۔ ان کے گھروں میں اگر کونڈی ڈنڈے کا رواج نہیں تھا تو ہمارے گھر میں بھی سل بٹے سے وہ آشنائی نہ تھی۔ میں اکمل کی چچی کے پاس بیٹھ کر اُس کی اپنے دیس کی باتیں سنتی اور ساتھ ساتھ اُسے مہارت سے یہ کام کرتے ہوئے بھی دیکھتی۔ جس دن اُن کے ہاں کوفتے یا گائے کی زبان جسے وہ لوگ بے کہتے تھے یا پتنگ ڈلی کڑی پکتی میرا اُن کے گھر جا دھمکنا ضروری ہوتا۔

گرمیوں میں مغرب سے ذرا پہلے ہر فیملی اپنی اپنی ہانڈی روٹی کے ساتھ اپنی اپنی چھت پر ڈیرے جما لیتی۔ ہماری دو منزلہ حویلی کی چھت سے اِن نظاروں کو دیکھنے کا اپنا مزہ تھا۔ ہماری عورتیں دیہاتی ہونے کے باوجود اس کلچر سے واقف تھیں کہ ان کا بڑے شہروں میں اپنے شوہروں اور بھائیوں کے پاس آنا جانا لگا رہتا تھا۔ تاہم مجھے یہ ضرور یاد ہے کہ ماموں لوگ جب چھٹی پر آتے تو پھر ممانیاں اور خالائیں مل کر دن سونے کھانے پکاتیں۔ ہاں البتہ ہماری اماں بس گئے بندھے طریق پر ہی چلیں۔ میں ضرور جز بز ہوتی۔ اُن کا سر بھی کھاتی۔ ایسے میں ہمسائیوں کی وہ مہرباں سی عورت میرے چٹورے پن کی تسکین کا ضرور سامان بنتی۔

☆ صدقے خیرات کی روٹیاں توڑنے کا شغل کیسا دلچسپ تھا۔

اب ایک اور دلچسپ قصہ بھی سن لیں۔ وقت تو یہ بہت اچھا تھا۔ اب تک کی پاکستانی تاریخ کا سنہری دور جب ہر سُو امن تھا۔

ہمارے گھر کے سامنے ایک کھلا میدان تھا۔ محلے کی ہر قسم کی سرگرمیوں کا مرکز۔ شادی بیاہ کے تمبو قناتیں یہیں لگتیں۔ ایک طرف بارات بیٹھتی اور دوسری طرف کھانے کی سروس ہوتی۔ پیروں فقیروں کے پیروکار اپنے جلسے، عرس وغیرہ یہیں کرتے۔

ہر سال آتی سردیوں کی رتوں میں کسی پیر کے عُرس کے نام پر ایک میلہ بھی لگتا تھا۔ ہفتے کی رات کو قوالیاں ہوتیں اور دن میں تقریریں اور لنگر بٹتا۔ ایسی رونق ایسا میلہ۔ ہم بچے ساری رات جاگتے۔ سارا دن کدکڑے لگاتے، کھانے پینے کی چیزوں پر لوٹ مار کرتے۔ میلے کے انعقاد کی خبر سُنتے ہی ہمارے رگ و پے میں وہ مسرت دوڑتی کہ زمانے گزر جانے پر آج بھی اُس کی سرشاری محسوس ہوتی ہے۔

عید میلاد النبیؐ کے تہوار یہیں سجتے۔ کیا رونقیں ہوتی تھیں۔ ہم محلے کے بچوں کی سرگرمیوں کا بھی یہ بڑا منچ تھا۔ لڑکے لڑکیاں سب مغرب کے بعد یہاں کھیلتے اور یہیں اپنی ایک ہم عمر لڑکی جو محلے کی مسجد کے مؤذن کی بیٹی تھی سے میرا گہرا یارانہ ہو گیا۔

ایک دن اس نے کہا "میرے ساتھ چلو گی۔"

"کہاں؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"محلے کے گھروں سے روٹی لینی ہے۔ بڑے مزے کے کھانے ہوتے ہیں۔ تمھیں کھلاؤں گی۔" ایسی پیشکش۔ منہ تو پانی سے بھر گیا تھا۔

"چلو چلتی ہوں" کہتے ہوئے ساتھ ہو لی۔ کیسا انوکھا اور دلچسپ تجربہ تھا یہ۔ ان دنوں ابھی صدر بازار کے خال خال گھروں میں ہی بجلی تھی۔ کمروں میں بہت چھوٹے پاور

کے بلب لگائے جاتے تھے۔ میں تھوڑی سی خوف زدہ بھی تھی کہ کوئی مجھے پہچان نہ لے۔ شاید اسی لیے میں ڈیوڑھی میں ہی رک گئی۔ جب ابھی فریجوں کا رواج نہ تھا۔ تازہ سالن، تازی روٹیاں، نمکین چاول، کھیر، حلوہ۔

جب گھر مکمل ہوگئے تو وہ ایک گھر کے چبوترے پر بیٹھ گئی۔ مجھے ساتھ بٹھالیا۔ تھیلے میں سے روٹی نکال کر میرے ہاتھ میں دی، اس پر سالن ڈالا۔ دال، سبزی گوشت اور ون سونے گھروں کے سالن ایک طرح ان سب کا کاک ٹیل میری روٹی پر پڑا تھا۔ تین گھروں سے ملنے والے چاول بھی رکھ دیے۔ آج بھی وہ ذائقہ یاد ہے۔ اس کی لذت یاد ہے۔ اُس بوٹی کو کس شوق سے کھایا۔

”میرے خدایا“ یہ کاک ٹیل ٹائپ کھانا جس کی انوکھی لذت سے میرا بیچارہ غریب دہ سادہن پہلی بار آشنا ہوا تھا۔ اب اس کا خمار سر کو نہ چڑھتا تو اور کیا ہوتا؟ اگلی شام کا انتظار کسی محبوب کی طرح کا ہی تھا کہ سورج تو ڈھلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ کہیں رک گیا ہے جیسا لگتا تھا۔

یہ گزشتہ رات سے زیادہ شاندار تھی کہ ایک گھر میں برسی کا زردہ پلاؤ وافر ملا۔ رج کے کھایا۔ اب میری ہر شب کہیں عید تھی تو کہیں شب برات۔ مگر ایک خوف بھی جان سے چمٹ گیا تھا۔ میرے چھوٹے ماموں جو بھی بی اے کے طالب علم تھے، سیاست کرنے لگے تھے، اور جماعت اسلامی سے وابستہ ہی نہیں ہوئے تھے، بل کہ اپنے علاقے میں بھی کافی متحرک تھے۔ میری نانی اور صفو ماسی کا محلے میں اچھا خاصا آنا جانا تھا۔ ماموں کے دوستوں کی ماں بہنیں بھی گھر آتی جاتی رہتی تھیں۔

تو پھر چوری کا بھانڈہ تو پھوٹنا ہی تھا، اور وہ پھوٹا۔ ہوا کچھ یوں کہ بالعموم میں دومنزلہ گھر کی صورت میں چھتے ہوئے زینے کے آخری پوڈے پر کھڑی رہتی۔ کچھ برتن میرے ہاتھوں میں بھی ہوتے۔ یا کبھی آگے جا کر یہ خیراتی کھانا لے آتی۔ ایک منزلہ گھر کی صورت میں ڈیوڑھی میں رکتی تھی۔ اُس دن ڈیوڑھی میں کھڑا ہونے کی وجہ سے باہر سے آنے والی ایک نوعمر لڑکی کی نگاہوں کی زد میں آ گئی۔ جس نے چھوٹتے ہی کہا:

”تم علوی صاحب اور فاطمہ کی بھانجی ہو۔“

میں بھی اُسے پہچان گئی تھی۔ وہ تو اکثر ہمارے گھر آتی رہتی تھی۔ یہ لوگ بھی جالندھر کے مہاجر تھے۔ سچی بات ہے میں نے ہکلاتے ہوئے پردوں پر پانی نہیں پڑنے دیا۔ مگر اگلے دن اُس نے فامی ماسی کے پاس آکر اُسے ساری بات بتائی تو پھر آپ سوچ لیجیے کہ کیا طوفان اٹھا ہوگا۔ اور میں اماں سے کتنا پٹی ہوں گی۔

☆☆☆☆☆

نثار ترابی ___ بطور شاعر اور شخصیت

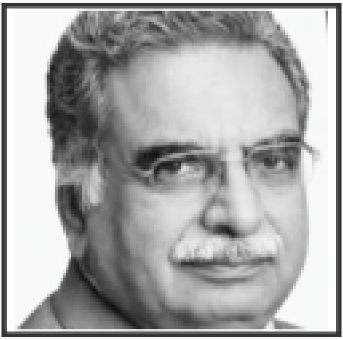

شاعروں کے بارے میں کچھ لکھنا کوئی مشکل کام نہیں۔ عموماً ایک مضمون کئی شاعروں کے لیے کام دے جاتا ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ عبارت میں سے صرف نام تبدیل کر دیئے جاتے ہیں۔ ہمارے ایک بزرگ ادیب فرمایا کرتے تھے کہ سب شاعروں کے اوصاف تقریباً ایک جیسے ہوتے ہیں۔ میں بھی ان کی اس رائے سے کافی حد تک متفق تھا مگر نثار ترابی کے معاملے میں یہ موقف تبدیل کرنے پر مجبور ہو گیا کیونکہ وہ ایک عام شاعر نہیں ہے۔ یہ بات میں پورے وثوق اور پورے خلوص سے کہہ رہا ہوں۔ نثار ترابی آسان سے مشکل اور مشکل سے آسان کی طرف سفر کرنے والا جداگانہ مزاج کا حامل انسان ہے۔ وہ ایک بے چین روح کی طرح ہے۔ وہ اپنی تخلیق سے کبھی مطمئن نہیں ہوا اگرچہ اس کی شاعری ہو یا نثر منہ بول کر کہتی ہے کہ مجھے ایک حقیقی تخلیق کار نے تخلیق کیا ہے اور مجھے تخلیق کرنے کے بعد بھی آزادانہ چھوڑ نہیں دیا گیا بلکہ میری اچھی طرح دیکھ بھال ہوئی ہے، مجھے تخلیق کرنے والا فنکار میری دائمی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔

یہ باتیں میں اس لیے کر رہا ہوں کہ نثار ترابی کی پوری زندگی بالکل سامنے کی چیز ہے اس کا لڑکپن علمی و ادبی طرز پر باقاعدہ تشکیل پایا ہے۔ شعر و ادب کی طرف اس کی رغبت ادبی زندگی کا آغاز، نام اور تخلص کے مراحل سب سامنے سامنے کی بات ہے۔ نثار احمد نثار اپنے شاعرانہ نام نثار ترابی کے طور پر سامنے آنے سے کئی سال قبل ہی عروسِ شاعری کو سنوارنے میں مشغول ہو گیا تھا۔ نوجوان شاعر کی حیثیت سے ریڈیو پروگراموں میں شرکت اس کے سفر کا آغاز ضرور تھا مگر یہ آغاز بھی کئی شاعروں کے انجام سے بہتر تھا۔ یہ تقریباً 1984-85 کی بات ہے۔ ایک لمبی قطار

منور ہاشمی

تھی نوجوان شاعروں کی جن میں نثار ترابی بھی موجود تھا۔ مجھے یہ کہتے ہوئے بہت خوشی ہے کہ نثار اس وقت بھی ان سب سے منفرد اور مضبوط تھا۔ ممکن ہے اس کی ابتدائی ادبی پرداخت میں کسی حد تک میری رہنمائی بھی شامل ہو مگر بقول اقبالؒ:

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسنِ معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی

....

تاہم مجھے یہ احساس ہوتا ہے کہ اگر نثار ترابی ہر جگہ اعتراف کرتا ہے تو یہ بھی اس کا مجھ پر احسان ہے کیونکہ وہ اس طرح کا اعتراف اتنی شدت اور خلوص سے کرتا ہے کہ میں اپنی مبینہ رہنمائی کو بھول جاتا ہوں اور مجھے یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ کاش واقعی میں نے کچھ رہنمائی کی ہوتی۔ یہ وہ دور ہے جس میں ہر شخص اپنے آپ کو افلاطون سمجھتا ہے اور کوئی کسی کا اعتراف نہیں کرتا بل کہ خود کو اپنے استادوں سے بھی بڑا ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن نثار ترابی ایک ایسا شخص ہے کہ وہ بھرپور اعتراف کرتا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس سے اس کا مرتبہ اور زیادہ بڑھ جاتا ہے اور اس کے بڑھتے ہوئے مرتبے سے اس کے استاد کا مرتبہ بھی بہت اونچا ہو جاتا ہے۔ نثار ترابی کی شخصیت ایسی جہات کی حامل ہے، جو ایک دوسرے کا تضاد ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے الگ نہیں۔ اس کی بڑی پہچان شاعری ہے لیکن وہ ایک ایسا شاعر ہے جس کی شاعری کو سرسری انداز میں نہیں دیکھا جا سکتا کیونکہ وہ اپنی شاعری پر خود تنقید کرتا ہے اور اس کی تنقید

رد و قبول کے نتائج بھی پیش کرتی ہے کوئی بھرتی کا شعر وہ اپنی غزل یا نظم میں نہیں رہنے دیتا۔ میں ایسے شاعروں کو بھی جانتا ہوں جو ایک نشست میں سو سو شعر کہہ جاتے ہیں اور ان پر نظرِ ثانی کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتے کیونکہ ان کے خیال میں مستند ہے میرا فرمایا ہوا۔ انہی پر صادق آتا ہے، یہ بسیار گو شعرا کاغذوں کے رِم کے رِم کالے کر دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ملک میں کاغذ کی قلت بھی ایسے ہی لوگوں کی وجہ سے ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ نثار ترابی شاعروں کی ایسی صف میں شامل نہیں ہے۔ ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جو اپنے نقاد خود ہوتے ہیں خود احتسابی ہی در اصل زندگی اور فن میں شفافیت پیدا کرتی ہے وہ غزل کے یا نظم دونوں میں ایک معیار قائم کرتا ہے اس کی موضوعاتی یا ہنگامی نظمیں بھی آورد کا تاثر نہیں رکھتی بل کہ ایک بے ساختہ پن کی حامل ہوتی ہیں جنھیں آمد کے علاوہ کچھ اور نہیں کہا جا سکتا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ غزل سے محبت رکھتا ہے۔ اس کی غزلوں کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شاید شاعری کی کسی دوسری صنف کے قریب نہیں جاتا مگر اس بات پر حیرت ہے کہ وہ ہر صنف سے انصاف کرنا جانتا ہے تاہم غزل کی صحیح خدمت کرتا ہے اس کی غزل صرف غزل نہیں بل کہ رجحان ساز غزل ہے۔ ایک غزل کے دو شعر دیکھیے:

رہِ حیات ہے باقی تو مل ہی جائے گا
بچھڑ گیا ہے جو لمحہ سفر کو جاتے ہوئے

سب اپنی اپنی کہانی لیے روانہ ہوئے
کسی نے کچھ بھی نہ پوچھا سفر کو جاتے ہوئے

....

یہ ساری غزل فنی لحاظ سے بہت مرصع اور فکری لحاظ سے واقعی فکر انگیز ہے حقیقت تو یہ کہ نثار ترابی کی ساری غزلیں اسی کیفیت کی حامل ہیں۔ چند مزید اشعار ملاحظہ فرمائیں:

نظر اُٹھی ہے جدھر بھی اُدھر تماشا ہے
بشر کے واسطے جیسے بشر تماشا ہے

....

کوئی تو کارِ ہنر ہم جنوں میں کر جائیں
زمیں بدلتی نہیں آسماں بدلتے ہیں

....

کسی بھی رت میں نمو پا سکیں نہ تعبیریں
ہمارے خواب کی مٹی میں نم ہی ایسا تھا
گزار دی ہے تحیر میں زندگی ہم نے
ہمارے ہاتھ کی ریکھا میں خم ہی ایسا تھا

....

اس میں لگ جاتی ہے عمروں کی ریاضت اکثر
آنکھ سے آنکھ کا اقرار بہت مشکل ہے
اے مری جان! ترا عشق نہ کر دے پاگل
اے مرے یار! ترا پیار بہت مشکل ہے

....

شعر، شعریت اور غزل، حُسنِ غزل میں تغزل کا تقاضا کرتی ہے اور نثار ترابی بھی اسی عقیدے کا آدمی ہے کہ غزل کو غزل ہی رہنا چاہیے۔ اس کے شعر کی ہیت ایسی ہوتی ہے کہ الفاظ جذبات سے ہم آہنگ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہ اس کی بہت مزیدار خوبی ہے۔ ہم

اکثر دیکھتے ہیں بعض شعرا کی غزلوں میں بعض اوقات ایسے الفاظ استعمال کیے ہوتے ہیں جو غزل کا حسن تغزل مجروح کر کے رکھ دیتے ہیں۔ کھردرے الفاظ بلاشبہ غزل کے لیے سمِ قاتل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ نثار ترابی کے ہاں ایسے الفاظ ہرگز نظر نہیں آتے۔ وہ لفظی اور معنوی نفاست اور شائستگی سے غزل کا خمیر تیار کرتا ہے۔ لفظوں کے استعمال میں بعض اوقات بڑے بڑے شاعر بھی لغزش کا شکار ہو جاتے ہیں مثلاً فیض احمد فیض نے ایک جگہ بہت کھردرا لفظ استعمال کر کے نظم کی ملائمت میں داغدار کر کے رکھ دیا مزا دیکھیں اور محسوس کریں۔

"تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے۔"

ایک لفظ "جھگڑا" نے پوری نظم کی خوبصورت رومانی فضا یہ تاثر پامال کر دیا۔ کیا جانے کیا مجبوری ہوگی کہ فیض جیسے عظیم شاعر نے اس طرح کی غلطی کی۔ حالانکہ فیض سے اس قسم کی غلطی کی توقع ہرگز نہیں ہو سکتی تھی۔ بہر حال نثار ترابی اس طرح کی کمزوریوں سے بچ کر چلتا ہے۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نثار ترابی کو فیض سے بڑھانا مقصود ہے بل کہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ شعر کی باریکیوں پر توجہ دے کر شعر کو بڑا کیا جا سکتا ہے۔ شاعر تو شاعر ہوتا ہے بڑا یا چھوٹا تو اس کو اس کے افکار کرتے ہیں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے قوی اطمینان ہے کہ نثار ترابی کی شاعری اس طرح کے تسامحات سے کافی حد تک پاک ہے، جن کی وجہ سے ہم اُسے چھوٹا شاعر کہنے پر مجبور ہوں اور یاد رکھیں جسے ہم چھوٹا شاعر نہیں کہہ سکتے وہ یقیناً بڑا شاعر ہوتا ہے۔ بلاشبہ نثار

ترابی میں بڑا شاعر ہونے کے تمام تر اوصاف موجود ہیں۔ اس کے شعر میں فنی پختگی، رومان کی چاشنی اور عصری آگہی بھرپور انداز میں موجود ہے اور یہی تین چیزیں غزل کو زندگی سے ہم آہنگ کرتی ہیں۔ آخر میں نثار ترابی کی غزل میں عصری شعور کی چند جھلکیاں بھی ملاحظہ فرمائیں:

مرے سخن میں یونہی روشنی نہیں آئی
ترے خیال نے پلکیں اُٹھا کے دیکھا ہے

....

عجیب طلسم میں ڈوبے نگر کے باسی ہیں
سحر کو ڈھونڈ رہے ہیں سحر کے ہوتے ہوئے

....

میں اس کے واسطے ہو جاؤں بے خبر کیسے
تمھاری آنکھ کا جادو ہے، چل بھی سکتا ہے۔

....

چلے بھی آؤ، ہوا تو شریک سازش ہے
سو بادباں کا اشارہ ملے ملے نہ ملے

....

ہے اک فریب مسلسل تماشا گاہوں میں
خبر نہیں ہے کہاں ہیں کہاں نہیں ہیں ہم

....

آج کی نشست میں شاعر نثار ترابی پر کچھ بات ہوئی ہے اس کی شخصیت کی دیگر جہتوں پہ بات کے لیے کئی دیگر نشستوں کی ضرورت ہے خصوصاً اس کے ذوق تنقید پر گفتگو کے لیے تفصیلی وقت درکار ہے۔

نثار ترابی آج ایک مقبول و ممتاز شاعر ہے۔ اس کی علمی و ادبی خدمات اور خصوصاً شعری فتوحات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ بطور شاعر وہ پاکستان سے باہر بھی بے شمار ملکوں میں کامیاب مشاعرے پڑھ چکا ہے۔ کتنی ہی ادبی کانفرنسوں اور سیمیناروں میں تحقیقی مقالے پیش کر کے اپنا نام ومقام بنا چکا ہے۔ اکثر ملکوں میں تو اس کا نام مشاعرے کی کامیابی کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ میں شعر کے حوالے سے اس کے تنقیدی رویے پر بات کر چکا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ تحقیق و تنقید کے میدان میں بھی اس کا اپنا ایک منفرد اسلوب ہے۔ پاکستان کے تقریباً تمام مصدقہ اور مسلمہ جرائد میں اس کے سینکڑوں تنقیدی و تحقیقی مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ جنھیں ادب کے سکالرز حوالے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ صرف ایچ ای سی کے منظور شدہ جرائد میں ۳۶ سے زائد مضامین چھپ چکے ہیں۔ اس کی طرف سے نظم ونثر میں جھنڈے گاڑنے کا یہ سفر تیز رفتاری سے جاری ہے۔

میں آخر میں صرف یہی عرض کروں گا کہ نثار ترابی کی پوری زندگی خلوصِ فن سے عبارت ہے۔ اس نے خود بھی کسی صنف کو سرسری انداز میں برتنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی اس کا سرمایہ فن اپنے ساتھ سرسری سلوک کی برداشت کر سکتا ہے میں نے آغاز میں اسی لیے عرض کیا تھا کہ نثار ترابی ایک عام شاعر نہیں ہے، اس لیے انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ اس کے ساتھ خاص سلوک کیا جائے اس کے شعری تفصیل اور ادبی ذوق کا وسعت قلبی سے اعتراف کیا جائے اور اس کو وہ مقام ملنا چاہیے جس کا وہ بغیر کسی رُو رعایت کے حقدار ہے۔

☆☆☆☆☆

صابر رضا کی غزل میں ''سفر'' بطور استعارہ

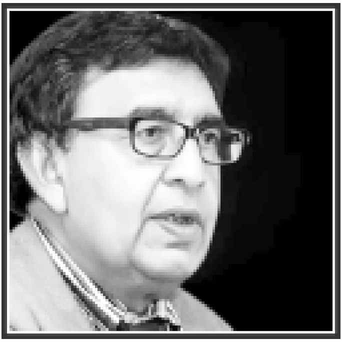

سفر زندگی کا استعارہ ہے۔ زندگی کے ارتقا پر یقین رکھنے والا ہر فن کار، شاعر اور ادیب سفر کے تسلسل کو ایک بنیادی حقیقت مانتا ہے۔ ایسے میں منزل کا تعین یا حصول ایک بے معنی عمل ہو کر رہ جاتا ہے کہ اصل حقیقت سفر جو ٹھہرا۔ بقول سلیم احمد:

ہم تو منزل کو بھی اک راہگذر جانتے ہیں
ٹھہر جاتے ہیں کہ آداب سفر جانتے ہیں

....

گویا اہلِ عشق کے ہاں منزل بھی اک راہگذر قرار پاتی ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے کسی پڑاؤ پر قیام سفر کے مقاصد میں شمار نہیں ہوتا بل کہ یہ محض آدابِ سفر کا تقاضا سمجھا جاتا ہے۔

صابر رضا صحرائے غزل کا ایک ایسا بصیرت مند مسافر ہے جو زندگی کے تحرک، ارتقا اور سفر کے تسلسل اور دوام پر پختہ یقین رکھتا ہے۔ ان کا یہی رویہ انھیں اہلِ عشق کی صف میں سرکشیدہ اور ممتاز رکھتا ہے کہ وہ منزل کو راستے کا حاصل نہیں بل کہ راستے کو منزلوں کا حاصل قرار دیتے ہیں۔ ذریعے اور مقصد کی یہ اکائی ان کے ہاں ہوس کے بجائے عشق کے روّیے کو جنم دیتی ہے۔

ان گنت منزلوں کا حاصل ہے
صرف اک راستہ اداس اداس

....

راستے کی یہ اداسی شاعر کے باطن کی وہ گھمبیر کیفیت ہے جو اس کے پراسرار تخلیقی سفر کو ایک گہرائی عطا کرتی ہے۔ اندر کی یہ پراسراریت شاعر کو باطنی سطح پر ایسی تقویت فراہم کرتی ہے کہ سفر کے دوران میں خارجی سطح کی تمام تر آسائشیں شاعر کے

نذر عابد

پاؤں کی ٹھوکر کی زد میں آ جاتی ہیں اور اس کا سفر وقت سے ماورا ہو کر رواں دواں رہتا ہے۔اس ماورائی کیفیت میں شاعر کے ہاں وقت بھی ایک اضافی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ گویا وقت بذات خود اسے بیک وقت حرکت و سکون کے مابین سیال و ثابت صورت میں ایک اضافی حقیقت کے طور پر محسوس ہونے لگتا ہے۔

وقت ساکن ہے یا سفر میں ہے
قافلہ اب بھی رہگذر میں ہے

کوئی چشمہ، کوئی سایا نہیں منزل ہماری
جنھیں ٹھکرا کے ہم دن رات چلتے جا رہے ہیں

....

صابر رضا کے ہاں سفر کے دوران میں نہ صرف خارجی سطح کی عارضی آسایشوں کو مسلسل ٹھکرانے کا عمل جاری رہتا ہے بل کہ وہ بظاہر بہت بلند سطح کی منازل کو بھی اپنے پاؤں کی ٹھوکر میں رکھتے ہوئے امکانات کی حدوں کو بھی پامال کرتے چلے جاتے ہیں۔وہ زندگی کی رفعتوں کی پُرکشش آواز کے تعاقب میں منزلوں پر منزلیں سر کرتے ہوئے انسان کی امکانی اوج گاہوں کی سمت اپنا سفر جاری رکھتے ہیں۔انھیں معلوم ہے کہ یہ کائنات انسان کے لیے مسخر کر دی گئی ہے،اب یہ الگ بات ہے کہ انسان کس قدر تسخیری مراحل طے کرتا ہے۔

رُکے ہوئے ہو رضا کس لیے ڈھلانوں پر
نظر اُٹھاؤ تمھیں رفعتیں بلاتی ہیں

ہماری ٹھوکروں میں تھے ستارے
جو نکلے حدِّ امکانات میں ہم

....

صابر رضا چونکہ ترقی پسند سوچ اور روشن خیال بصیرت رکھتے ہیں سو ان کے ہاں سفر کی ایک معنوی سطح اندھیروں سے روشنی کی طرف کا سفر بھی ہے۔ وہ ظلم و تعدی، عدم مساوات اور جہالت جیسی زندگی کی منفی اقدار کو اندھیروں کے مترادف گردانتے ہیں اور اس کے مقابل اپنے لہو کی روشنی میں سماجی عدل و انصاف، طبقاتی مساوات اور روشن خیالی کے سفر کو تسلسل کے ساتھ جاری رکھنے پر یقین رکھتے ہیں یہاں تک کہ روشنی کا سب سے بڑا منبع سورج بھی اندھیروں میں ماند پڑنے لگے تو انھیں اپنے اندر کی روشنی پر اس قدر بھروسا ہے کہ اس باطنی روشنی کے سہارے وہ زندگی کی تاریک راہوں میں مثبت اقدار کے چراغ روشن کرتے چلے جاتے ہیں۔

اندھیرے میں اتر جائے جو سورج
تو جگنو اور شاعر جاگتے ہیں

مقابل رات کے صابر چلے ہیں
چراغ سر لیے اک ہاتھ میں ہم

جو لوگ سروں کو چراغ بنانے کا حوصلہ رکھتے ہیں، انھیں اپنے سفر کی صعوبتوں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ صابر رضا کا شمار بھی ایسے ہی حوصلہ مند افراد کے قافلے میں ہوتا ہے جو مسافرانِ راہِ وفا ہوتے ہوئے نہ صرف خود جادۂ حق میں بچھے کانٹوں کو اپنے لہو سے سیراب کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں بل کہ توواردانِ صحرائے عزیمت کو ایسے مصائب کی پیش بندی کرنے کی تلقین کرنا بھی ضروری خیال کرتے ہیں۔

سفر ہے صحرا کا لیکن یہ دھیان بھی رکھنا
کسی نے ریت پہ مضموں کوئی لکھا تو نہیں

....

قدم اُٹھانے سے پہلے یہ سوچنا یارو!
وفا کی راہ میں پتھر ہیں اور کانٹے بھی

....

محبتوں کو گھنے پیڑ یاد آتے ہیں
سفر ہے دشت کا اور پاؤں جلتے جاتے ہیں

....

کبھی وہ مسافرانِ رہِ وفا سے صعوبتوں کی یہ داستان اس انداز میں سننے کے خواہش مند نظر آتے ہیں کہ صعوبتوں بھرے اس سفر میں رائگاں ہوتی حیات کی کہانی کے کچھ نہاں گوشے یوں روشن ہوں کہ رائگانیِ حیات کے ذمہ دار بہت سے کردار اپنی تمام تر خباثت کے ساتھ نمایاں نظر آنے لگیں۔ یقیناً یہ ایسی درد بھری داستان ہے جو انسانی حیات کے انفرادی اور اجتماعی ہر دو سطح کے دکھوں سے عبارت ہے۔

تجھے یہ سر پھری ہوا کہاں کہاں لیے پھری
بگولہ زادو! جوئے بے کراں کی داستاں سنا

سفر کی سب صعوبتیں فضا میں تو اچھال دے
مگر مجھے حیاتِ رائگاں کی داستاں سنا

....

رائگانی کے اس سفر میں کبھی یوں بھی محسوس ہوتا ہے کہ جیسے انسان کے روحانی ارتقا کے سفر میں مادّی سطح کی بے پناہ رکاوٹیں در آئی ہیں۔ مادّی سطح کی ان رکاوٹوں اور بندشوں کے حصار میں انسان نہ صرف لحۂ موجود میں اپنے آپ کو بے بس تصور کرتا ہے بل کہ گذشتہ سفر میں سمیٹی گئی تمام تر روحانی اور قلبی سرشاری بھی چھن جانے کا احساس ہونے لگتا ہے۔ صابر رضا کے ہاں یہ احساس بھی شدت سے نمایاں ہوتا ہے۔

ہماری روح کے ہر راستے پہ
بدن دیوار ہو کر رہ گیا ہے

نئی ہجرت کے بعد اکثر کھو گئے
کہ سب بے کار ہو کر رہ گیا ہے

....

تاہم صابر رضا رائگانی کی اس کیفیت کو روگ نہیں بناتے بلکہ وہ سفر کے تسلسل پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ انسانی زندگی کے سفر کو ہر صورت میں وقت کی دائمی روانی کے تناظر میں دیکھتے ہوئے سفر کے دوام کے

قائل ہیں۔ اُن کا شوق اسیرِ درودیوار نہیں رہ سکتا اور اُن کا جنوں کسی صورت زندانیِ بام و در ہونے کی ذلّت گوارا نہیں کر سکتا۔

یہ اسیرِ در و دیوار نہیں رہ سکتا
طائرِ شوق گرفتار نہیں رہ سکتا

اس کی فطرت ہے مسلسل ہی سفر میں رہنا
اک جگہ وقت تو سرکار نہیں رہ سکتا

....

غلام گردشِ ایّام کا نہیں ہوتا
جنوں کو شوق درو بام کا نہیں ہوتا

....

اقبال کے نزدیک انسان کی انفرادی اور قوموں کی اجتماعی زندگی میں کبھی کوئی ایسا مرحلہ بھی آجاتا ہے کہ صدیوں کا سفر ایک لمحے اور ایک جست میں طے ہو جاتا ہے۔

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں
(اقبال)

صابر رضا کے ہاں اس صورت حال کے برعکس ایک ایسی کیفیت کا اظہار بھی ہوا ہے کہ جب بظاہر ایک مختصر قدم کا سفر اس قدر طویل ہو جاتا ہے کہ انسان کو تاریخی و تہذیبی سطح پر اس یک قدمی سفر کو طے کرنے کے لیے بھی صدیاں درکار ہوتی ہیں۔

کبھی کبھی اسے صدیاں بھی طے نہیں کرتیں
جو دیکھنے میں سفر گام کا نہیں ہوتا

یہ بات ایک ایسا دانش ور شاعر ہی کہہ سکتا ہے جو اپنی بصیرت کی روشنی میں صدیوں کی انسانی تاریخ اور تہذیب کے مختلف ارتقائی مراحل کو جانچنے اور پرکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

صابر رضا سفر اور محض سفر پر پختہ یقین رکھنے والے ایک ایسے شاعر ہیں جو قراتِ زندگی کے تھپیڑے کھانے کے بعد جب ساحلِ عافیت سے ہم کنار ہو جاتے ہیں تب بھی اپنے سفر کو جاری رکھنے کا اعلان کرتے ہوئے پکار اُٹھتے ہیں۔

ساحل سمجھ رہا تھا جسے اپنا میں رضا
وہ بھی ہے میرے واسطے اک امتحاں کھلا

....

سوال یہ ہے کہ صابر رضا کے اِس مسلسل سفر کی سمت کیا ہے؟ اس روشن سمت کا اعلان انھوں نے خود کر رکھا ہے۔ یہ وہ سمت ہے جو ریاکاری، ظلمت اور بے وفائی جیسی زندگی کی تمام تر منفی قدروں کا پردہ چاک کرتی ہے اور وفا، استقامت، ظلم کے خلاف ڈٹ جانے اور حریتِ فکر جیسی مثبت اور روشن قدروں کا پرچار کرتی ہے۔ صابر رضا اور اُن جیسے سچے اور کھرے شاعروں کا یہ روشن سفر ہمیشہ کے لیے جاری و ساری ہے۔

کوفے آباد ہیں، ہر سمت ریاکاری ہے
کربلا تیری طرف اپنا سفر جاری ہے

☆☆☆☆☆

ریاض ندیم نیازی......ایک صوفی شاعر

نذیر قیصر

ریاض ندیم نیازی کی شخصیت میں اپنے نام کی تمام صفات موجود ہیں وہ اس دشت نمازندگی میں ایک مہکتا ہوا باغ بھی ہیں اور اچھے دوست اور نیازی روایت کی طرح بہادر بھی ہیں۔ ہمارے عزیز دوست اجمل نیازی نے سانحہ مشرقی پاکستان جنرل نیازی کے بارے میں لکھا تھا کہ "یا تم نیازی نہ ہوتے یا پھر میں نیازی نہ ہوتا" کیوں کہ نیازی قبیلے کی روایت میں ہتھیار ڈالنا نہیں ہے۔

ریاض ندیم نیازی ایک سچا، بہادر اور محبت کرنے والا نیازی ہے۔ اجمل نیازی اور منیر نیازی کی طرح۔ ایک بار منیر نیازی نے کہا تھا۔

"گلابوں کا رزق آکاش بیلیں کھا رہی ہیں"

سیاست اور سماج کے بہت سے شعبوں کی طرح

....

آکاش بیلیں علم و ادب اور آرٹس کے سایہ دار درختوں پر بھی جا بجا پھیلتی دکھائی دیتی ہیں مگر ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں۔ جب تک ندیم نیازی جیسے اچھے اور پیارے لوگ علم و ادب کی دنیا میں ہیں یہ دنیا آباد اور شاداب رہے گی۔ یہ بات میں نے اس لیے بھی کہی ہے کہ ندیم نیازی محبت کی شاعری کے ساتھ ساتھ سیاسی سماجی شعور بھی رکھتے ہیں اور اس کا اظہار بھی ان کی شاعری میں رونما ہوتا ہے۔

تم کو دھوپ سے لیکن ہم کو سایوں سے ڈر لگتا ہے
درگاہوں سے اور عبادت گاہوں سے ڈر لگتا ہے

....

ہم سب ایک ڈرے ہوئے شہر اور ڈری ہوئی دنیا کے باشندے ہیں اور آج کل تو عبادت بندوقوں کی چھتری تلے کی جاتی ہے۔ ندیم نیازی نے ایک اور شعر میں کیسی خوب صورت اور الم ناک صورت حال بیان کی ہے۔

میں سوچتا ہوں اکثر کتنے مخلص تھے وہ دن
شاعر نے جب کہا تھا سارا جہاں ہمارا

....

شاعر بلا امتیاز رنگ و نسل اور عقیدے کے

سارے جہان کا شہری ہوتا ہے۔ وہ دنیا کے دل میں اور ساری دنیا اُس کے دل میں آباد ہوتی ہے۔ حضرت جنید بغدادی نے فرمایا تھا: ''صوفی اُس سرزمین کی طرح ہوتا ہے جس پر نیک اور گناہ گار دونوں چلتے ہیں''

....

اور سچا شاعر بھی صوفی ہوتا ہے۔ ندیم نیازی ایک صوفی شاعر ہیں، شریعت اور طریقت کے درمیان بال جیسے نازک فرق کو سمجھنے کے لیے امرتا پریتم کا جملہ مجھے ہمیشہ یاد رہتا ہے وہ کہتی ہیں: ''ہمارا عہد یہ ہے کہ ہم مذہبی ہیں، ہمیں مذہبی نہیں روحانی ہونا چاہیے۔'' روحانی ہونا ہی سچا مذہبی ہونا ہے مگر ان دونوں کے درمیان ہونے اور نہ ہونے کا بھید کون جانتا ہے؟ صوفی شاعر اور آرٹسٹ اِس بھید کو پالیتے ہیں اور ندیم نیازی نے بھی یہ بھید شاید پالیا ہے اور وہ کبھی کبھی ایسے بال جیسے باریک اور نازک شعر بھی کہتے ہیں:

چوڑیوں سے بجتا ہے
ساز اُس کلائی کا

....

شعری دنیا میں داخل ہونے کے لیے بیداری اور ہوشیاری نہیں چلتی اِس دروازے میں داخل ہونے کے لیے بچوں کی سی معصوم آنکھیں اور دل چاہیے۔ محبت اور شاعری سے ملنے کی کوئی تیاری نہیں ہوتی:

کچھ اس سے گفتگو کرنے کی تیاری نہیں کرتی
کہ دانستہ کوئی بھی کیفیت طاری نہیں کرتی

یہ ہم جو شاعری اور محبت کرتے ہوئے لفظوں کی مصنوعی زرہ بکتر پہن لیتے ہیں اس میں محبت اور شاعری کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ شاعری اور محبت صاف شفاف بہتے ہوئے چشمے جیسی ہوتی ہے جس میں پریاں اور فرشتے اپنے پر بھگوتے ہیں۔

ندیم نیازی نے اپنی شخصیت اور شاعری پر لفظوں کی کوئی زرہ بکتر نہیں پہنی وہ سیدھے سادے سجاؤ کی شخصیت اور سیدھی سچی شاعری کرتے ہیں۔ ان کی شخصیت اور شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے بہت سے مثبت امکانات روشن ہوتے ہیں - وہ بلوچستان کی پتھریلی، ریتلی اور گرم سرزمین کے رہنے والے ہیں جس پر اُنھیں ناز ہے اور ہم سب کو بھی سندھ، پختون خوا، پنجاب، گلگت اور بہادر اور سچے بلوچستان پر ناز ہے کہ وہاں بھی شعروادب اور علم کی شجرکاری ہو رہی ہے۔ ندیم نیازی نے سبی میں ایک لائبریری بھی بنا رکھی ہے جس سے وہاں کے لوگ علم وادب سے سیراب ہو رہے ہیں۔ افلاطون نے کہا تھا: ''جس گھر میں لائبریری نہ ہو وہ اس جسم کی طرح ہے جس میں روح نہ ہو''۔ اور ندیم نیازی جیسے روحانی لوگوں کو اپنے گھروں اور شہروں کو کتابوں سے آباد کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ ہمارے گھر اور شہر بے جان جسموں کی طرح بے جان نہ ہو جائیں۔

☆☆☆☆☆

محمد حامد سراج کی افسانوی دنیا

محمد حامد سراج (پ: 21 اکتوبر 1958ء - م: 13 نومبر 2019ء) کے بارے میں بہت پہلے سن رکھا تھا کہ وہ ایک اچھے افسانہ نگار ہیں اور ان کا تعلق میانوالی کی ایک خانقاہ، ''سراجیہ'' سے ہے۔ لیکن 2014 میں جب میں نے ان کو اپنے سات افسانے بھیجے کہ ان پر اپنی قیمتی رائے سے نوازیں تو انھوں نے مختصر اور جامع تاثرات کے ساتھ، میرے افسانوں کی بجا طور پر پزیرائی کی، جس سے میرا حوصلہ بڑھا اور کچھ ہی عرصے کے بعد (23) افسانوں پر مشتمل میری کتاب ''تکمیل ذات'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ جس میں محمد حامد سراج کے مذکورہ تاثرات بھی شامل ہیں۔ یہ تاثرات اتنے عمدہ تھے (یا شاید مجھے اچھے لگتے تھے) کہ میں نے محمد حامد سراج کے افسانوں کو پڑھنے کا ارادہ کیا۔ اسی دوران میں، مجھے ان کا لکھا ہوا، ماں کے حوالے سے ایک خاکہ ''میا'' دستیاب ہوا، وہ اتنی خوب صورتی کے ساتھ لکھا گیا تھا کہ اسے بار بار پڑھنے کو دل چاہتا تھا۔ ان کا لکھا ہوا یہ خاکہ (میا) نہ صرف مواد کے اعتبار سے وقیع تھا بلکہ خاکے کے فنی لوازم بھی پورے کرتا تھا۔ پھر کچھ ہی عرصے بعد ان کا ایک افسانوی مجموعہ ''چوب دار'' میرے ہاتھ لگا۔ جس میں کل (19) افسانے ہیں اور جس کا انتساب اول ''ہم سفر، ہمدم، غم گسار، چارہ ساز، شگفتہ حامد سراج اور عمر رواں کی بے اعتبار تسلسل امامہ، حفصہ، اسامہ احمد، قدامہ احمد کے نام'' ہے۔ جب کہ انتساب ثانی ''معتبر نقاد، ادیب، دانش ور، افسانہ نگار، محمد حمید شاہد اور کتاب شناس، کتاب دوست سائرہ غلام نبی کے نام'' ہے۔

کتاب ہذا، کے پہلے افسانے کا عنوان ''اجتماعی مات'' ہے۔ پہلی نظر میں یہ عنوان یوں لگتا ہے جیسے کہ، یہ کوئی پیش لفظ ہے، لیکن جب اسے پڑھا تو یہ ''غلام عباس'' کے افسانے ''اوور کوٹ'' کی یاد دلانے لگا۔ حال آں کہ، اس افسانے کے آغاز ہی میں

شوکت محمود شوکت

انھوں نے لکھا ہے:

"اس نے اوورکوٹ پہن رکھا تھا۔ اگر میری یادداشت کی چولیں ڈھیلی نہیں پڑیں تو اوورکوٹ کا رنگ سبز تھا۔ یہ عرض کرتا چلوں کہ اس اوورکوٹ کا سلسلہ کہیں بھی غلام عباس کے مشہور افسانے اوورکوٹ سے نہیں جڑتا۔"

مگر، مجھے ذاتی طور پر پہلا احساس یہی ہوا کہ یہ غلام عباس کے افسانے "اوورکوٹ" ہی کے تتبع میں لکھا گیا ہے۔ تاہم، مکمل افسانہ پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ کلی طور پر، غلام عباس کے افسانے "اوورکوٹ" سے مختلف ہے۔ البتہ! کچھ الفاظ، غلام عباس کے افسانے "اوورکوٹ" اور ان افسانوں میں استعمال ہونے والے اوورکوٹس کے رنگ مختلف ہیں۔ غلام عباس کے افسانے "اوورکوٹ" میں اوورکوٹ کا رنگ "بادامی" جب کہ محمد حامد سراج کے افسانے "اجتماعی مات" میں اوورکوٹ کا رنگ، سبز ہے۔

اس کتاب کے دیگر افسانوں میں "خودداری کی نیند"، "قدیمی کرسی اور کتاب کی مرمت"، "الٹے پاؤں"، "لرزیدہ لمحوں کا تاوان"، "شور بہت کرتا تھا"، "میکینک کہاں گیا"، "لالٹین جلتی رہے"، "بوسیدہ آدمی کی محبت"، "امام غزالی کا گم شدہ کردار"، "ڈرائنگ روم اک گزرگاہ ہے"، "ذہن بازار"، "گرمی بہت ہے"، "بے انت صحرا"، "اعلان"، "کنجی"، "کنواں کٹورا اور کوا"، اور "کاغذ کی راکھ" شامل ہیں۔

متذکرہ بالا افسانوں کے علاوہ، جو افسانہ کتاب کا سرنامہ لیے ہے، وہ ہے "چوب دار"۔ یہ ایک ایسے بادشاہ کی کہانی ہے جو رعایا پر ظلم کرتے کرتے، ساری رعایا کو مار دیتا ہے، پھر پوری دنیا میں اکیلا رہ جاتا ہے، اب پوری دنیا ختم ہو چکی ہے مگر اس کے کانوں میں وہی آوازیں سنائی دیتی ہیں جو کسی بھی بادشاہ کی آمد یا استقبال پر سنی جاتی ہیں یعنی "جنبش مکن، ہوشیار، نگاہ روبرو...... بادشاہ سلامت تشریف لاتے ہیں۔"

کتاب ہذا (چوب دار) کا مطالعہ کرنے کے بعد، ان کے افسانوں پر مشتمل دوسری کتاب "برائے فروخت" سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ جس کا انتساب "پروفیسر محمد فیروز شاہ (مرحوم)" کے نام ہے، جس میں کل (21) افسانے شامل ہیں، جو عنوانات، موضوعات اور فکری جہات کے حوالے سے مختلف ہیں۔ ان میں سے ایک افسانے کا عنوان "عادت ہی بنا لی" ہے جو معروف شاعر منیر نیازی کی ایک مشہور غزل، کہ جسے غلام علی (مرحوم) نے گایا بھی ہے، جس کا مطلع ہے:

بے چین بہت پھرنا، گھبرائے ہوئے رہنا
اک آگ سی جذبوں کی دہکائے ہوئے رہنا

جب کہ اس غزل کا مقطع ہے:

عادت ہی بنا لی ہے تم نے تو منیر اپنی
جس شہر میں بھی رہنا، اکتائے ہوئے رہنا

اس مقطعے کے پہلے چار الفاظ ”عادت ہی بنالی“ کو انھوں نے اس افسانے کا عنوان بنایا ہے۔ اس کے علاوہ، ایک اور افسانہ۔ جس کا عنوان ہے: ”کھیلن کو مانگے چاند“ یہ عنوان بھی، اردو کے معروف شاعر اور افسانہ نگار اسد محمد خاں کا لکھا ہوا کلام (گیت) ہے، جسے گلوکارہ بلقیس خانم نے گایا اور بعد ازاں، استاد بڑے غلام علی خان کی گائیکی کے باعث بھی اسے خاصی شہرت ملی، اس گیت کے پہلے چند مصارع ملاحظہ ہوں:

انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے چاند
کیسی انوکھی بات رے
تن کے گھاؤ تو بھر گئے داتا
من کا گھاؤ نہیں بھر پاتا
جی کا حال سمجھ نہیں آتا
کیسی انوکھی بات رے
انوکھا لاڈلا کھیلن کو مانگے چاند

اس افسانوی مجموعے کے بعد، جب ہم، ان کے تیسرے افسانوی مجموعے ”بخیہ گری“ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہماری سب سے پہلے نظر آشنائی، کالا باغ، اٹک، حضرو، میانوالی، ڈیرہ اسماعیل خان اور لیہ کے چند معروف اہل قلم کے نام، انتساب اور نیچے ”ناصر کاظمی“ کے اس شعر سے ہوتی ہے:

رقم کریں گے ترا نام انتسابوں میں
کہ انتخاب سخن ہے یہ انتخابوں میں

اس مجموعے میں کل (13) افسانے شامل ہیں۔ اس افسانوی مجموعے کے آغاز میں دو دیباچے ہیں۔ پہلا طویل دیباچہ بہ عنوان ”بخیہ گری میں آوا گونیت کی تلاش“ ہے۔ جسے اسلامیہ یونی ورسٹی بہاول پور کے پروفیسر مظہر حسین (شعبہ تاریخ) نے بڑی محبت اور عرق ریزی سے تحریر کیا ہے۔ جب کہ دوسرا دیباچہ، سائرہ غلام نبی کا تحریر کردہ ہے، جس کا عنوان ہے ”فطری قصہ گو“...... جس کا آغاز کچھ یوں ہوتا ہے:

”محمد حامد سراج بطور کہانی کار نہ کسی منصوبہ بندی کے تحت کہانی سوچتا ہے نہ کہانی کے تار و پود بننے کے لیے کیل کانٹوں سے لیس ہوتا ہے، نہ ہی کہانی کہنے کے لیے دانش وری کا چولا پہنتا ہے، اور نہ ہی اپنی کہانی کو کس دائرے (نظریے) کا قیدی بناتا ہے۔ پر کہانی کو اس کہانی کار سے کچھ تعلق خاص ہے، یوں لگتا ہے کہ وہ اس کی تلاش میں رہتی ہے، اور پھر کہیں نہ کہیں سے آ کر ڈھونڈ لیتی ہے۔“

ان دو دیباچوں کے علاوہ، پس ورق،

معروف افسانہ نگار ''حمید شاہد'' کے تنقیدی تاثرات سے مزین ہے۔ اس افسانوی مجموعے کے تمام افسانے بیانیہ انداز میں خوب صورتی کے ساتھ اخلاقی اور سماجی دروس لیے ہوئے ہیں۔ جب کہ آخری افسانہ ''آواگون'' یعنی نظریہ تناسخ (theory of Transmigration) کے حوالے سے ہے، جس میں افسانے کا مرکزی کردار، کسی پرانی مہک کو بہت عرصے کے بعد محسوس کرتا ہے۔ اس کے بعد، جب ہم، ان کے چوتھے افسانوی مجموعے ''وقت کی فصیل'' کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اس میں کل (19) افسانے ملتے ہیں جب کہ اس کا انتساب ''ماں باپ کی گمشدہ چھاؤں کے نام'' ملتا ہے۔

اس افسانوی مجموعے میں بھی سارے افسانے، بیانیہ طرز پر لکھے گئے ہیں۔ پہلا افسانہ ''گلوبل ولیج'' جب کہ آخری افسانے کا عنوان ''بخت جلے'' ہے۔ ان کے پانچویں افسانوی مجموعے کا نام ''برادہ'' ہے جو ایک مختصر افسانوی مجموعہ ہے جس کا اہم افسانہ ''برادہ'' ہے جو دہشت گردی سے متاثرہ پاکستانی معاشرے اور سماج کے دکھ، درد، آلام اور مصائب اور ٹوٹی بکھی آشاؤں کی کہانی سناتا ہے۔ مذکورہ، افسانوی مجموعوں کے علاوہ، ان کی اور تصانیف بھی منظرِ عام پر آچکی ہیں جن میں ''آشوب گاہ (ناولٹ)، ''ہمارے بابا جی خان محمد''، ''عالمی سب رنگ افسانے''، ''نامور ادیبوں کی آپ بیتیاں''، ''مشاہیرِ علم و دانش کی آپ بیتیاں''، ''بادشاہوں کی آپ بیتیاں'' اور ''نقش گر'' (25 منتخب افسانے) شامل ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ محمد حامد سراج (مرحوم) نے اپنی اکسٹھ برس کی عمر میں اردو زبان و ادب کو نثر کا اچھا خاصا خزانہ عطا کیا ہے جس کے لیے اردو ادب ہمیشہ ان کا مقروض اور شکر گزار رہے گا۔ جہاں تک مجموعی طور پر، ان کے افسانوں کی بنیاد امتیازات یا انفرادیت کی بات ہے، تو ان کے بیشتر افسانوں میں انگریزی اور پنجابی زبانوں کے الفاظ کا استعمال جا بجا ملتا ہے۔ اس کے علاوہ، انھوں نے اپنے کچھ افسانوں میں اپنے علاقہ جات اور ماحول کا تذکرہ بھی کیا ہے۔
آخر میں ان کی ایک بات یاد آرہی ہے جو انھوں نے اپنے افسانوں مجموعے ''برائے فروخت'' کے شروع میں لکھی ہے:

''جس روز میں لکھنا چھوڑ دوں گا، اس روز میں مر جاؤں گا''

اور واقعی، انھوں نے اپنی موت سے قبل لکھنا بند کر دیا تھا۔

☆☆☆☆☆

اپنا اپنا لوکیل: ایک پیروڈی

بدیسی روایت کا حلب سے ایسے شہر میں پہنچنا، جس کی جڑیں ہوتیں تو وہ جڑاں والا کہلاتا۔ شاخاں والا بھی۔ ایک آتشیں عمل۔ گھونگھٹ کا تکلم غصے سے عاری۔ مقامی حجام صدیوں سے چاندی کی کٹوری میں صابن کا جھاگ بناتے چلے آرہے تھے۔ چاہے ختنے کا معاملہ ہو یا ٹھوڑی کی دمک ___ مطلوبہ دل نشینی کا اہتمام غسل خانے میں تو ممکن نہیں۔ پیر سائیں اہلِ دیہہ کو دعا دے کر بکر منڈی کی اور تنہا روانہ ہوگئے۔ موسم کی کسے پروا! تمازت کا مصدر زمین یا سورج؟ البتہ آفتاب نصف النہار پہ تھا۔ ویران کچے راستے میں انھیں ایک چوبی تاول سٹینڈ نظر آیا۔ اس پر بے حد اجلا تولیہ مصلوب تھا۔ اس کے عین نیچے میلے کی چار بوتلیں رکھی گئی تھیں، جن میں تازہ کانجی بھری ہوئی تھی۔
پٹل اور کانجی کے ملاپ سے مقامی ثقافت کی حوصلہ شکنی ہو یا نہ ہو، اس روز بوڑھے لوگ اجتماعی حقہ کشی کے دوران نیل آرم سٹرانگ سے قرض لے کر مکئی کے دانے ضرور بھنواتے تھے۔ حقے کی چلم، نیلے شعلوں کا رقص، لاٹ کہہ لو! یہ داستان زبان زدِ عام رہی۔ خاص بات یہ ہوئی کہ عام بات باقی نہ رہی۔ بیلوں کے گلوں میں بجتی گھنٹیوں اور سودی کاروبار کے بیچ مشترک عناصر کی تفہیم؛ ہیملٹ کے بھوت کا اپنی ذریت میں نمودار ہونا؛ اوسلو سے ٹوبا ٹیک سنگھ تلک سنگتری کی سیٹی؛ سنگترے کی پھانک اور لکڑی کے دروازے پہ جڑی آہنی جالی؛ بیش قیمت دروازہ اپنی جگہ مگر اس کے باہر جالی والا دروازہ لازم۔ مکھیوں، مچھروں، چھپکلیوں کو کوپرنیکس نے جسٹیفائی کر دیا۔ رہنے دیتا زمین کو مرکز میں۔ انسان محور سے کیا ہٹا؛ ارضی گولے نے سورج کے گرد گھومنا شروع کر دیا۔ رموز اوقاف کا بخارات بن کر کے فضا میں پرواز کر جانا؛ ان سب کو سدا مصری تہذیب کا تناظر درکار رہا۔ قتل و

جمیل احمد عدیل

غارت گری جو صدیوں کو برباد کر گئی۔ سورماؤں کی شجاعت کے قصے۔ جنگوں سے نفرت لیکن جنگجوؤں کی پوجا۔ سکندر۔ پورس۔ تاریخ کی ایف آئی آر۔ ساڈا بابا آتے رہوے۔ رزمیہ کی کشش دیوانہ کر دینے والی رہی۔ متناقضہ۔ متناقضہ۔ متناقضہ------ دبدھا کب نجات دے گا؟ جب تک ناشتے میں نہاری رہے گی؛ قضایا اور آنات کے معنے کھوپڑی میں نہیں ٹھہریں گے۔

وریام کنجلو نے سازش کو من میں چھپانا چاہا مگر وہ اس کی سفید کنپٹیوں سے چھلک پڑی۔ اگر بالفرض رائل پور سے اٹھنے والا استعمار ماموں ساجن کو اپنی نوآبادیات نہ بنا پاتا تو گھنٹا گھر کی تعمیر اسی قصبے میں ہوئی تھی۔ ممکن ہے چک جھمرا کو یہ اعزاز مل جاتا۔ سو، ایسے میں ہل پھل کا جدی پشتی کاریگر دتو اپنے ہڈیاں کو اطمینان دلانے کی خاطر کماد کے کھیت کا رخ نہ کرتا تو کیا کرتا۔ واپسی پر کوڑتموں سے اس کی آدھی جھولی بھری ہوئی تھی۔ باقی آدھی میں یہ غم تھا کہ اگر کالے انجن کی ایجاد نہ ہوتی تو اس کے گاؤں نے اپنے چھپڑ کی وسعت پہ ناز کرنا تھا۔

یونانی ناموں/تسمیوں کا کنوئیں سے برآمد ہونا بکواس! پہلے بودی بالوں ہی میں چھپی ہوئی ہوتی تھی۔ مدرسے والے تو بہت بعد میں بدہضمی کے علاج کی جانب متوجہ ہوئے۔ چتکبرے چیتے نے چتون چڑھا کر دیکھا تو ٹیلی گراف آفس کی جون ہی بدل گئی۔ اک عالم اضطراب۔ اب وہاں تیزی سے جلیبیاں تقسیم ہو رہی تھیں۔ خوف کو اندھیرا کھویا دسترخوان ___ سرگوشی کے معانی حتمی رہیں گے۔ چیک والی پتلون اور چیک والی شرٹ پہننے سے افق کے دائروں میں ارتعاش کا مفہوم سمندر کو ایک بار تو اچھال دے گا۔ عود کی پوتر مہک میں لاجوردی رنگ کی آمیزش سے مقامی بولی نے اکثر کھاؤ کھایا۔ پھر ایک زمانے نے دیکھ لیا کہ استرے کی دھار گیلی راکھ کو اور گیلا کر گئی۔

چودھری شرفو مسکرات نے گوتھک طرز کی حویلی تعمیر کرائی۔ اس کے ڈاٹوں والے برآمدے میں نصب قد آدم آئینے اور درزی کی قینچی کے درمیان ایک گہرا تعلق پہلی بار محسوس کرنے والا ایک جہاندیدہ کوا تھا، جو اکثر سامنے منڈیر پہ براجمان رہتا۔

نہ اس کوے کی بات ہے نہ اس حویلی کی۔ وہ کوئی اور ہے۔ جس کی آنکھ بے حیا تھی۔ نہاتی ہوئی عورتوں کے گرد منڈلاتی رہتی۔ ہر گھر کا روشن دان بھی اس کی آنکھ ہی میں واقع تھا۔ کبھی روشن دان اور بایاں ہاتھ، داہنے ہاتھ کی انگلی کا سرمدی تحرک--- ہر کوئی شیطان۔ انسان کو ہرن بنا کر بھیجا گیا۔ دکھ شکاری کتے۔ دوڑ تھم نہیں سکتی۔ سنکھو باو نے

جب بھی فون کان سے لگایا۔ دلدوز چیخ ہی سنائی دی ہمیشہ ___ دو مور اور دو ہی چور ___ سرائیکی حکایت کی تہ میں ایک مخفی خزانہ ___ سب۔ نہیں۔ کچھ۔ ہاں ! سب۔ امشب !!! جیب میں رکھے تمام کرنسی نوٹ اپنے آپ دھاتی سکوں کے اندر تبدیل ہونے لگے تو کسان کا دل خود بخود اندیشوں میں گھر گیا۔ بچپن میں اس کا سکول سے بھاگ جانا کیا خوش آئند ثابت ہوا یا عمر بھر کا روگ ؟ کرسی میز والی افسری یا دھرتی سے جڑت ؟ کاغذ یا مٹی ؟ فیصلے سے بڑھ کر ابتلا کیا ہوگا! خیرو کو خیال آیا کہ آج جمعرات تھی اور اس نے اگر بتیاں نہیں خریدیں۔ شربت فولاد اور ابن رشد کی کتابوں سے ہونے والے سلوک نے خوش کن سوگواری کی پیش کار کھچڑی سی پکا ڈالی۔ جس کی رنگت کے سنہرے پن میں جامنیت نمایاں رہی۔ ابھی گھریلو نوکر نے ملک ترامو سے کچھ بھی نہیں کہا تھا کہ اچانک گندے بیروزے کی ہمک سارے میں پھیل گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک خونی لکیر نے فرش پر اپنی سلطنت قائم کر ڈالی۔ درس گاہ کا قیام ترجیح بنا۔ طلبہ سے فیس کی وصولی بروقت۔ ڈگری/ میڈل/۔ سب جعلی۔ بے ہودہ خفطہ: ناک کی نوک پہ نیلی رگوں کا پھوڑا۔ کراہت سے قے آجائے۔ کود کود کر پڑتا کیبن کی آکسیجن۔

اگر ایک کتے کا رنگ کالا ہو اور دوسرے کی سکن کیمل کلر کی تو بھیک کی صورت حال شام کے شیشے کو کانپنے پہ مجبور کر دے گی۔ یکایک سونے کی اشرفیاں صحن میں گرنے لگیں تو کسی کا دھیان پورن ماشی کے چاند کی جانب منتقل نہیں ہوگا۔ وہاں بھی یہی ہوا۔ البتہ زماں اپنے تعین سے انکاری ہے۔ ہوا تو ضرور پر کب ؟؟؟؟ ہندسے، ڈائل، گنتی گنتی ___ بعد کی اختراع۔ نیم شبی کا اسرار جب اپنے عروج سے ہمکنار ہوا تو دیکھا گیا مالی مرجان کی دستی والے کھرپے کے ساتھ پائیں باغ میں زمین کھود کر ہموار کر رہا ہے۔ ایسے میں کسے ہوش تھی کہ وہ تائی بی بی کے ماتھے کی تیوریاں شمار کرے۔

عقاب نے اڑتے اڑتے پورے عہد کو بروئے کار لاتے ہوئے نچلی پرواز کو چنا تو ٹن شیڈ پہ بیٹھی ذہین چڑیا نے دیکھ لیا، اس ظالم پرندے کی ایک آنکھ پتھر کے ڈیلے سے اپنی مقتدرانہ حیثیت کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ سٹک اور حاکمیت۔ قاضی غلام۔ جب قفل تین ہوں اور چابیاں چار تو حاملہ عورت چینی کی دو پیالیاں بیک وقت توڑ دینے کا ارادہ کرلے تو کیسا تعجب ! اس دوران میں بھکو بیوپاری گڑ کی بھیلی سے شغل کرتا رہا ___ ویدئی انہماک ___ مگر اس کے لمبے کانوں کی لرزتی لویں نمک پاروں کی

تعریف میں رطب اللسان تھیں۔ بھرے ہوئے سگریٹ کے کش لگانے کی معنویت جاننا ہو یا شوہر/بیوی کی بے وفائی کا اصلی بھید دریافت کرنے کی جستجو ہو تو مال گاڑی میں طویل سفر اختیار کرنا لازم ٹھہرا۔ آخر میں گارڈ والا ڈبا ___ ایک اشارا ___ ایک استعارہ ___ ان دونوں نے مختلف مقامات سے یہ سفر اپنایا۔ کہہ لیں وہ دونوں رقیب تھے مگر اس کے باوجود وہ دونوں ہمقدم پرشور بازار سے ہوتے ہوئے ایک ریستوران میں داخل ہوئے۔ ایک ہی ٹیبل کے گرد تادیر بیٹھے رہے - پہلے فالسے کا شربت پیا پھر ماہی گیر مرغ پلاو سے بڑی آنت کو شانت کیا۔ شکم کے آخری طالب کونے کو ملک شیک سے راضی کیا۔ دنیا جہان کی باتیں کیں مگر دھوکا دہی اور فریب کا موضوع بالواسطہ بھی گفتگو کا حصہ نہ بنا ___ مخفی رکھا جانے والا ہی ظاہر ___ جھینگر کی آواز اور مٹیاری کی دکان میں ایسی تاریکی سے واسطہ پڑے گا جو روشنی سے معمور ہوگی۔ نہیں کہا جا سکتا کہ بابے نواب نے اس نایاب چمک کا مشاہدہ کیا یا نہیں۔

نہر میں تیراکی ہو یا پہاڑ سے اترائی؛ بارسلونا سے رجانہ یا اوسلو سے سمندری تک کی مسافرت؛ ایک تو پیتل اور کانچ کے ملاپ سے مقامی ثقافت کی حوصلہ شکنی ہوگی، دوسرے پیاس ہونٹوں سے نہیں پیالوں کے کناروں سے طلوع ہوگی۔ فضلو اور کرمو نے تشنگی کے اسی مقام کو ایک ساتھ اپنے شعور میں اترتے ہوئے پایا۔ تیسری بات بھی ہوئی انھوں نے ایک ہی آن میں جانا کہ الجبرے میں مہارت ہو یا گڈوئے پکڑنے کا عمل ___ دونوں ___ سرمئی جھاڑکو بالآخر عنابی کر کے رہیں گے۔

دونوں میں عداوت/رقابت پوری طرح سلگتی رہی۔ اندر ہی اندر۔ اس کے باوصف وہ متفق تھے کہ دانتوں کی صفائی ٹوتھ پیسٹ کی بجائے خود تیار کردہ لیپ سے کرنی چاہیے: سرسوں کا تیل + ہلدی + گلابی نمک ___ ممکن ہو تو تھوڑی سی پسی ہوئی پھٹکڑی بھی ___ تسلیم انھیں طبی بنیادوں پر مکمل ورک نہیں ہوگا کہ حب جواہر کے استعمال سے کیسے اعضائے رئیسہ کو تقویت ملتی ہے نیز خفقان و وساوس اور مالیخولیا کا معالجہ کیسے ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ کیسری کو کسی شک کے بغیر مفید یقین کرتے تھے، اگرچہ انھیں قطعاً خبر نہ تھی کہ اس میں شامل کشنیز خشک کیا ہے اور اس کا محلل اور ام حارہ ہونے سے مطلب کیا ہے۔ ان کی عملی یگانگت اور اس جناتی زبان کو جذبے سے دہرانا دراصل ایلوپیتھی کے خلاف مزاحمت کا علامتی اظہار تھا۔

☆☆☆☆☆

کہ جاتی ہے اردو زباں جاتے جاتے

اگست ہمارا ماہِ آزادی ہے لہٰذا سوچا کہ اس مناسبت سے قومی زبان کی بابت کچھ تحفظات، محسوسات اور گزارشات کو باقاعدہ مضمون کی صورت پیش کیا جائے۔ جب داغ دہلوی نے متذکرہ بالا مصرع کہا تھا تو کسی کے وہم وگمان میں نہ ہوگا کہ کوئی صدی سوا صدی بعد ان کا مصرع اپنی معکوس معنویت کے بوجھ تلے دبا المدد پکار رہا ہوگا۔ گو کہ رئیس امروہوی نے 1972 میں کچھ ایسی ہی بات بالکل مختلف سیاق وسباق میں کی تھی:

اردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

لیکن اردو اپنی دوربین نگاہوں سے ان دو مصرعوں کے درمیان 67 برس کے بعد میں اپنا قدرے تبدیل اور بیشتر مسخ شدہ چہرہ بخوبی دیکھ رہی تھی اور اسے دور دور تک اپنے اصلی خدوخال لوٹانے والا جراحِ مشاطگی یعنی پلاسٹک سرجن بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ طاقتور اقوام کی کمزور قوموں پر ثقافتی یلغار صدیوں پر محیط عمل ہے اور اس یلغار کو روکنے کے لیے اجتماعی قومی شناخت ناگزیر ہوتی ہے جو یا تو زبردست اور مسلسل مساعی سے حاصل کی جاتی ہے یا ان کے لیے قومی تشخص کا مضبوط تاریخی پس منظر درکار ہوتا ہے۔

دبستانِ سرسید نے جہاں ادب میں مقصدیت اور سائنسی طرزِ فکر کو فروغ دیا، وہیں اس عمل کی بھاری قیمت اردو کی لسانی روح سے چھیڑ چھاڑ کی صورت ادا کی۔ اس ضمن میں غالباً سب سے مشہور لفظ یا اصطلاح ''نیچر'' ہے جسے خواہ مخواہ اس کے قومی اور موزوں متبادل فطرت، قدرت اور جبلت جیسے آسان اور خوب صورت الفاظ کو مسندِ روزمرہ سے ہٹا کر ایک تحریک کے تحت اسی طرح براجمان کیا گیا جیسے فرنگی استعماری قوتوں نے مغل دربار کو قطب صاحب جیسی مزار آمیز جگہ پر دھکیل کر خود کو شاہی قلعے جیسی پرشکوہ اور جاندار عمارت میں جانشین کیا۔ دنیا کی کم وبیش تمام السنہ ایک ناگزیر تعامل کے تحت غیر زبان، خاص طور پر انگریزی، سے ذخیرۂ الفاظ کا لین دین کرتی رہتی ہیں لیکن اس ضمن میں راقم کے علم کے مطابق اردو پر انگریزی کا غلبہ بہت زیادہ رفتار اور کثرت سے ہوا۔ اس کی ایک بڑی وجہ تو یہ ہے کہ بیشتر سائنسی ایجادات کو اردو نے بعینہٖ قبول کرلیا، جیسے بلب، گلاس، انجن، ریل اور موٹر کار وغیرہ۔ ریل کو ابتدا میں تو بکثرت آہنی سڑک کہا گیا

افتخار الحق

لیکن شاید مردانِ آہنِ انگلستان نے اردو کے سینے پر ریل کی آری چلانے کا حتمی فیصلہ کر لیا تھا، سو اردو کی پٹری پر انگریزی ریل چلتی ہی گئی۔ اس کے علاوہ اس فہرست میں سب سے دلچسپ معاملہ بلب کا ہے۔ اردو میں کافی عرصے تک برقی قمقمے جیسا خوبصورت متبادل رائج رہا لیکن رفتہ رفتہ جب بلب کی جگہ انرجی سیورز آئے تو گویا ایک اور ہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ فانوس جیسے دلکش لفظ کی جگہ شینڈ لیر، بجلی کی جگہ لائٹ، برقی تاروں اور کھمبوں کے بجائے الیکٹرک پولز وغیرہ کی طرز پر متعدد الفاظ گویا اردو کے ہو کر رہ گئے۔ رہی سہی کسر ضیائی دور میں متعارف کردہ بجلی کے عارضی تعطل کی جگہ لوڈ شیڈنگ کی اصطلاح اردو زبان اور پاکستانی معاشرے میں گھپ اندھیرا پھیلاتی چلی گئی۔

اگست 1947 میں آزادی کے بعد بھارت میں بولی جانے والی ہندی کی آمیزش والی اردو نے کافی ڈٹ کر انگریزی حملے کا دفاع کیا۔ اس بابت ہاکی اور کرکٹ کے رواں تبصرے بطور مثال ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں جب مبصر بلے باز اور گیند باز جیسے الفاظ بلا تکلف و تذبذب استعمال کرتے ہیں۔ بدقسمتی یا اتفاق سے پاکستان میں ابتدا سے معاملہ مختلف رہا۔ پہلے تو اردو۔ بنگالی تنازعہ پیدا کر کے قوم کو ایک غیر ضروری مسئلے میں الجھایا گیا اور پھر اردو کو ایک طرف انگریزی اور دوسری طرف علاقائی زبانوں سے اس کی پنجہ کشائی کرانے کی سعیِ لاحاصل کی جاتی رہی۔ اس طرزِ عمل کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ پاکستان کے بانیوں نے ایک نئی قوم کی شناختی علامات متعین کرنے کی جو بھی کاوشیں کیں انھیں یا تو کمزور کیا گیا یا ناکام بنا دیا گیا۔ ہماری سرکاری مشینری / افسر شاہی یا سول سرونٹس انگریز سرکار کی پروردہ ہونے کے سبب نئی قومی شناخت کے عمل کو پیچیدہ بناتی چلی گئی۔ سونے پر سہاگہ یہ ہوا کہ آزادی کے چند سال بعد ہی ایسا سیاسی عدم استحکام بے چاری قوم پر مسلط کیا گیا جس کے نوکیلے دانت آج تک ہماری سیاست میں گڑے ہوئے ہیں۔ خالص آمریت اور جمہوریت ملی آمریت کی ایسی بساط بچھائی گئی کہ عوام کی اکثریت مزید الجھتی چلی گئی اور اس سیاسی اتھل پتھل میں پتا ہی نہ چلا کہ:

عوام کی بھی ہے بولی خواص کی بھی زباں

اشرافیہ و مقتدرہ کی کن گنجلک سیاسی و سماجی غلام گردشوں میں چکراتی رہ گئی۔ گو آزادی سے لے کر اب تک فراز، فیض، منیر نیازی، احمد ندیم قاسمی اور افتخار عارف جیسے بلند قامت نثر و نظم کے مینار ابھرتے رہے، تاہم ان ہستیوں کے متوازی گاہ بدسلیقگی سے اور گاہ نہایت مشاقی سے روزمرہ کے قالب پر زبانِ غیر کا پیرہن چڑھایا جاتا رہا۔ اس پراسرار عمل میں یکساں قومی پہچان کسی راستہ بھولے نوعمر بچے کی طرح کہیں کھو گئی۔

قومی شناخت کے تذکرے کی تکرار اس لیے ضروری ہے کہ ہمارے ہمسائے ایران نے صدیوں سے قائم اجتماعی ثقافتی پہچان کے نقوش کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ مسلسل ان کی تزئین کا اہتمام بھی کرتا رہا۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ وہاں ہائی سکول، کالج اور یونیورسٹی کی جگہ دبیرستان، کلیہ اور جامعہ جیسے الفاظ کے فروغ کے ساتھ ساتھ زبانِ فرنگ سے ہم آہنگ ہونے کا بندوبست بھی ہوتا رہا، جیسے دکتور/ ڈاکٹرز اور ماشین/ مشین یا کار وغیرہ۔ اور تو اور ہمارا کینو بھی وہاں نارنجِ پاکستان جیسا دلآویز اور

لذیذ متبادل پا کر ترشی و شیرینی کا مرکب بن چکا ہے۔ کم و بیش یہی حال اسی خطے کے عرب ممالک کا ہے۔ روزمرہ عربی قواعد کے اعتبار سے سائنسی ترقی اور غیر عرب آبادکاروں کی وجہ سے کافی بدل چکی ہے لیکن اس نے بھی انگریزی الفاظ اردو کی طرح حیران کن تناسب سے قبول نہیں کیے اور یوں اللسان العربی کی روح مجروح نہ کی جا سکی۔ ایرانیوں کی طرح عرب اقوام نے بھی صدیوں پرانی ثقافتی اقدار اپنائے رکھنے کا صحت مند عمل جاری رکھا۔ ہم بوجوہ پون صدی سے زائد گزرنے کے باوجود ایک آزاد قوم کی وہ حیثیت نہ پا سکے جو متذکرہ اقوام کے نصیب میں آئی۔ یہ ایک الگ، طویل اور گمبھیر موضوع ہے جو کسی الگ تحریر کا متقاضی ہے۔

جہاں تک ان سائنسی اور تکنیکی اصطلاحات کا تعلق ہے جو روانی سے بولتے ہوئے ادا ہو جاتی ہیں، ان پر شاید مضبوط اعتراض نہیں بنتا لیکن عام بول چال کے کچھ نسبتاً مضحکہ خیز نمونے دیکھیے اور خود فیصلہ کیجیے کیا ایسی ہی باتیں بالکل سلیس اور سادہ اردو میں کرنے سے کیا بگڑتا ہے:

''مجھے آجکل سٹریس اور ڈیپریشن ڈیلی ہی بہت رہتا ہے اور آئی ڈونٹ نو کہ باؤ تو ٹیکل دیس۔''

''یو نو میرے ڈومیسٹک پرابلمز میری روٹین کو بہت افیکٹ کر رہے ہیں''

''میں لیٹ ایوننگ تک مین روڈ کے قریب پہنچ جاؤں گا۔ اِف یو ڈونٹ مائنڈ تو کائنڈلی ویٹ فار می۔''

''یو سی وی بیٹر گو فور دیٹ پلیس ٹوگیدر۔ ادر وائز تمھیں پتا ہے کتنی سیریس سچوایشن ہو جائے گی اور ہم دونوں کی پوزیشن بہت آکورڈ ہو سکتی ہے۔''

اگر ایسے جملوں کا معروضی تجزیہ کریں تو کیا یہ طرزِ گفتگو منصفانہ اور دانشمندانہ کہلائے گی۔ جواب ظاہر ہے کہ بہت بڑے نہیں کی صورت ہوگا۔ اس منظرنامے کا بغور جائزہ لیں تو رومن رسم الخط میں اردو لکھنے کی روش نے بھی اس پُرلطف صورتحال کو جنم دینے میں کافی اہم کردار ادا کیا ہے۔ ہمارے ٹی وی ڈراموں کے سنجیدہ کردار بھی جب ایسی بے ہنگم مخلوط زبان میں مکالمے ادا کرتے ہیں تو بیک وقت حیرت اور افسوس کا سماں بندھتا ہے۔

انگریزی کے علاوہ بھارتی روزمرہ بھی ڈراموں اور حقیقی زندگی میں بری طرح دخیل ہونے سے اس سلسلے کا رخ کسی اور جانب ہی ہونے لگا ہے۔ اس کے بھی کچھ ترش ترخوشے چکھیے اور فیصلہ کیجیے کہ کون سا پھل کس درخت پر لگایا گیا ہے:

''لگتا ہے آپ کے فلاں رشتے دار کو ہارٹ اٹیک ''آ'' گیا ہے۔''

گویا ہارٹ اٹیک کافی عرصے سے اپنے ہدف کی جانب باقاعدہ دو رکعت نیت کر کے چل پڑا تھا اور اب منزل مقصود تک ''آ پہنچا'' ہے۔

''کئی بار ٹرائی کی لیکن اس کا (فون) نمبر نہیں لگ رہا''۔ یعنی فون نمبر اپنے دل پر اشتہار وغیرہ کی صورت لگانا تھا لیکن دل کی سطح پھسلواں ہونے کے باعث ایسا ہو نہیں پا رہا۔

'' آپ بھی اس معاملے میں کیا '' ہی '' کریں گے؟''

''بیٹی کا سسرال ہے، ایسے تھوڑا نہ جاتے ہیں''

حالانکہ معنوی اعتبار سے فون نمبر ''ملتا (رابطہ ہوتا)

"اور" دل کا دورہ پڑنا/ ہارٹ اٹیک ہونا" کہیں زیادہ بلیغ صورتیں ہیں جو طویل عرصے سے رائج اور مقبول رہی ہیں۔بعینہٖ "آپ" بھی/ بھلا" اس معاملے میں کیا کریں گے؟" ادائیگی کے لحاظ سے رواں اور مفہوم کے ابلاغ کے لیے درست اور موزوں ہیں۔ پاکستانی اردو پر یہ حملہ بھارتی ڈراموں اور فلموں کے ذریعے ہوا اور ہمارے نام نہاد اہلِ زبان بھی بات چیت کے اس انداز کے خلاف اردو کا دفاع کرنے کے بجائے اسے اپنانے کو ترجیح دیتے چلے جا رہے ہیں۔

اس تمام سلسلے کا خوش گوار پہلو یہ ہے کہ درست اور معیاری اردو میں شاندار ادب پیہم تخلیق ہو رہا ہے جس کے سبب روزمرہ کی بابت خدشات کا کچھ ازالہ ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ یہی پہلو اس نظریے کی بڑی حد تک تردید بھی کرتا ہے کہ جس زبان کو سرکاری سرپرستی حاصل ہو وہی فروغ پاتی ہے جب کہ بھارت میں اس وقت کی حکمران جماعت اور اس کے وزیر اعظم صاحب نے تو ایسی کوئی سرپرستانہ حکمتِ عملی نہیں اپنائی بل کہ وہاں صورت تو اس کے برعکس ہے۔ پاکستان میں بھی نجی سطح کی مکمل طور پر غیر سرکاری ادبی تنظیمیں زبان و ادب کے فروغ میں شاندار کردار کر رہی ہیں اور ان میں زمینی اور غیر زمینی/ آن لائن/ ورچول دونوں طرح سے اردو سمیت دیگر زبانوں کی نمو میں مصروف ہیں۔ شکر ہے کہ ماضی قریب میں حکومت کی طرف سے اکادمی ادبیات جیسے عظیم ادارے کو بند کرنے کا فیصلہ بھی مخلص ادبا شعرا کی طرف سے چلائی گئی تحریک نے تبدیل کرایا۔

اب ذرا تاریخی، سماجی و سیاسی تناظر میں انگریزی کے اردو سے زبردستی اختلاط کا جائزہ لیتے ہیں۔

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ انگریزی فی زمانہ تقریباً ایک آفاقی زبان بن چکی ہے کہ اب تو چین میں بھی اس کے اساتذہ کی طلب ہے اور کچھ بڑے یورپی ممالک جیسے جرمنی، ہالینڈ (جسے بھلے وقتوں میں ولندیز/ ولندستان اور یہاں کے باشندوں کو ولندیزی کہنا عام بھی تھا اور غیر معیوب بھی)، سویڈن اور فن لینڈ میں پوسٹ گریجوایشن/ بعد از کلیاتی تعلیم انگریزی میں حاصل کرنا عام ہوتا جا رہا ہے۔ تاہم فرانس اور یورپ کی دیگر ریاستوں تک انگریزی کی یہ دست درازی یا دراندازی اتنی عام نہیں ہے۔ اقوامِ متحدہ کی بھی واحد زبان انگریزی نہیں ہے۔ وطنِ عزیز میں البتہ انگریزی کی یورش کم و بیش بے مثال ہے نو آبادیاتی حکومت کے لسانی اثرات کم و بیش تمام محکوم ممالک پر واضح اور مسلمہ ہیں لیکن وطنِ عزیز میں ان اثرات کی گہرائی کہیں زیادہ ہے۔ اس کا ایک بہت بڑا ثبوت رنگوں کی دنیا ہے جہاں شوخ گلابی جیسی شاعرانہ ترکیب کی جگہ شاکنگ پنک، جامنی یا ارغوانی جیسے خواب ناک لفظ کی جگہ پرپل جیسا غیر ہموار سا متبادل اور فیروزی کی جگہ ٹرکوائز جیسا ٹرخانے والا ترجمہ اپنی جگہ بنا چکے ہیں۔ اللہ بھلا کرے مشتاق یوسفی کا جنھوں نے اپنی شہکار کتاب "آبِ گم" میں کوئی دو درجن کے قریب وہ تمام رنگ اور ان کی ہلکی یا گہری جھلکیاں کس روانی سے تحریر کر کے تمام اہلِ قلم کو جھنجھوڑنے کی کاوش کی۔

بھارتی اور فرنگی اثر اندازی کے علاوہ بھی اردو کے بگاڑ کی ایک صورت مقامی بھی ہے جس میں متعدد درست الفاظ و تلفظ کو غلط العام اور

غلط العوام کرنے کی سازش خود ہم نے کی:

یہ تیغ اپنے لہو میں نیام ہوتی رہی

اس کی بھی روز بروز بڑھتی ہوئی تعداد میں مثالیں پیش کرکے کچھ تو جہاد بالقلم ہم سب ہی کر سکتے ہیں۔ اس بگاڑ کی کچھ معروف اشکال دیکھیے:

مِن وعَن کی جگہ مَن وعَن۔ جیسے ''مِن الظلمت الی النور''۔ شکر ہے ''مِن جانب'' کو ''مَن جانب'' نہیں پڑھا جاتا۔

فریقین: اقواعد کے صولِ تثنیہ کے مطابق: دو فریق، جیسے والد اور والدہ کو ملا کر والدین۔ اسی طرح حرمِ مکہ اور حرمِ مدینہ کو حرمین شریفین بولا اور لکھا جاتا ہے۔

لیکن خیر سے میڈیا اور عام گفتگو میں ''تمام فریقین'' کہنے اور لکھنے کو عام کیا جا رہا ہے۔ ذرا سوچیں کہ کوئی کسی کو مخاطب کر کے کہے: آپ کے تمام والدین، تو کیا ہو۔

احساسوں: حس سے مشتق لفظ احساس ہے

جذباتوں: جذبہ کی جمع جذبات ہے اور اس کی غلط جمع الجمع جذباتوں کو فروغ دیا جا رہا ہے۔

عدم اطمینان، عدم اعتماد: اطمینان اور اعتماد کا نہ ہونا لیکن اسے زبردستی عدمِ اعتماد اور عدمِ اطمینان (م مکسورہ کر کے/ م کے نیچے زیر لگا کر) لکھا اور پڑھا جانے لگا ہے۔ بڑے بڑے اینکر پرسن نہایت اعتماد سے عدمِ اعتماد پڑھتے ہیں جب کہ ان کا تعلق اچھے خاصے پڑھے لکھے گھرانوں سے ہوتا ہے۔ اسی تسلسل میں پس منظر کو پسِ منظر اور سرورق کو سرِورق کی اضافت شدہ شکل میں لکھنے اور بولنے کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ بینَ الاقوامی، بینَ الصوبائی (ن مفتوحہ/ ن پر زبر درست ہے)، لیکن عرصۂ دراز سے ن پر پیش ڈال کر بینُ الاقوامی/ بینُ الصوبائی لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ یونہی عرصۂ دراز سے ایک اور لفظ کو غلط تلفظ سے پڑھا جاتا ہے: اوسَط کے بجائے اوسْط، یعنی س پر زبر کے بجائے سکون/ جذم کے ساتھ پڑھنا۔ غلط تلفظ اور الفاظ کو درست طریقے سے ادا نہ کرنے کے علاوہ کچھ معنوی اغلاط بھی ٹی وی ڈراموں کے توسل سے رواج پا رہی ہیں۔ یہ طے کرنا باقی ہے کہ انھیں مصنف کے کھاتے میں ڈالا جائے یا ہدایت کار ذیلی لغزشات میں۔ اس بابت صرف ایک دلچسپ مثال پیش کرنا کافی ہوگا۔ اکثر ڈراموں میں کوئی لڑکا یا لڑکی یہ کہتے پائے جاتے ہیں:

''غلطی کی معافی ہوتی ہے، گناہ کی نہیں۔''

جانے یہ عجیب و غریب فلسفہ کس نے برسوں کی محنت کر کے ناظرین پر مسلط کرنے کا نیک فریضہ انجام دیا۔

اگر ہم ماضی پر نگاہ ڈالیں تو یہ خوشگوار انکشاف ہوتا ہے کہ جب تک پی ٹی وی کا دور تھا، یہ سب شین قاف درست کرنے کا مکمل اہتمام ہوا کرتا تھا لیکن نجی چینلز کی یلغار کے ساتھ اردو کے متعدد الفاظ و تراکیب پر بھی غلط تلفظ کے پے در پے حملوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل نکلا۔ تعلیمی اداروں میں جب اچھے خاصے تعلیم یافتہ اساتذہ ایسی اغلاط کی ترویج کر کے بالواسطہ غلط تدریس کرتے دکھائی دیتے ہیں تو اس کے دور رس منفی نتائج کا شدید احتمال ہوتا ہے۔ آج کے تمام اہلِ قلم کا فرض ہے کہ پی ٹی وی کے سنہری دور کا ہر ممکن سطح پر احیا کر کے نئی نسل کو تلفظ کے صراطِ مستقیم پر چلنے میں مدد کریں۔

☆☆☆☆☆

مقدمہ: ردیف بطور روایت، ردیف بطور ضرورت

شعری مجموعہ "دریافت" کے تناظر میں

حسنین سحر

(حصہ اوّل)

سب سے پہلے تو یہ نوٹ فرما لیں کہ اشفاق ناصر کا تازہ شعری مجموعہ ''دریافت'' اپنی ساخت کے اعتبار سے بظاہر غیر معمولی ضرور ہے مگر اسے لسانی یا ساختیاتی تجربہ کہنا ہرگز مناسب نہیں۔

غزل کی روایت میں ردیف کو عموماً ایک فنی پابندی سمجھ لیا جاتا ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ردیف پابندی سے زیادہ امکان ہے۔ قافیہ صوتی ترتیب قائم کرتا ہے، بحر آہنگ کو سنبھالتی ہے، مگر ردیف وہ مقام ہے جہاں شعر ہر بار اپنے معنی کی طرف لوٹتا ہے۔ یہی لوٹنا، یہی واپسی، غزل کو محض اشعار کا مجموعہ نہیں رہنے دیتی بلکہ اسے ایک داخلی وحدت عطا کرتی ہے۔

زیرِ نظر شعری مجموعہ دریافت اسی وحدت کی ایک بامعنی مثال ہے۔ اس مجموعے کی تمام غزلیں ایک ہی ردیف ''ہے مجھ میں'' میں کہی گئی ہیں مگر ہر غزل اپنی زمین، بحر اور قافیہ کے اعتبار سے آزاد اور خود مختار ہے۔ یہ مستقل ردیف کسی تجربے کا شاخسانہ نہیں۔ اس لیے کہ اصل شعری تجربہ وہ نہیں ہوتا جو

روایت کو توڑ دے، بلکہ وہ ہوتا ہے جو روایت کے اندر رہتے ہوئے اس کے امکانات کو نئی سطح پر آشکار کرے۔

شعری تجربہ نئی ہیئت یا اجنبی ساخت کا نام نہیں بلکہ زبان اور معنی کے مانوس رشتے کو نئے شعور کے ساتھ برتنے کا عمل ہے۔ اگر کوئی تخلیق صنف کی داخلی منطق سے انکار کرے تو وہ تجربہ نہیں بلکہ انقطاع بن جاتی ہے۔ دریافت اس انقطاع کا شکار نہیں ہوتی بلکہ غزل کی روایتی ساخت کے اندر ردیف کو ایک وسیع معنوی مرکز بنا دیتی ہے۔ یہاں ردیف سہولت نہیں بلکہ ذمہ داری ہے۔ شاعر کو ہر غزل میں یہ ثابت کرنا ہوتا ہے کہ وہی اختتامی فقرہ نئے معنی کیسے پیدا کرتا ہے۔

دراصل ردیف کی اصل قوت فارسی اور اردو کی نحوی ساخت میں مضمر ہے۔ ان دونوں زبانوں میں فعل، نفی اور تکمیلِ جملہ عموماً آخر میں آتی ہے۔ اس نحوی ترتیب کے باعث شعر کا اختتام ایک ایسے مقام پر ہوتا ہے جہاں پورا مفہوم جمع ہو جاتا ہے۔ ردیف اسی مقام پر آ کر محض آواز نہیں رہتی بلکہ جملے کا لازمی جز بن جاتی ہے۔ مثلاً ”ہے مجھ میں“ جیسے فقرے کو حذف کر دیا جائے تو جملہ ادھورا رہ جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اردو اور فارسی میں ردیف محض تکرار بند نہیں رہتی بلکہ معنی کا بوجھ اٹھاتی ہے۔ یہی نحوی سہولت وہ بنیاد ہے جس پر ردیف نے ان زبانوں میں اپنی جگہ بنائی اور آہستہ آہستہ غزل کا مرکزی عنصر بنتی چلی گئی۔

فارسی شاعری کے اوّلین معمار رودکی کے ہاں ہمیں ردیف بطور باقاعدہ فنی ضابطہ نہیں ملتی مگر ہمیں وہاں ردیف کا شعور ضرور ملتا ہے۔ آپ کا مشہور شعر ہے:

بوی جوی مولیان آید ھمی
یادِ یار مہربان آید ھمی

....

یہاں ”آید ہمی“ کسی عروضی قانون کے تحت نہیں آیا، بلکہ زبان کی فطری روانی اور احساس کی شدت نے اسے بار بار دہرانے پر مجبور کیا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ردیف ایجاد نہیں بلکہ دریافت ہوتی ہے۔ دراصل رودکی کے ہاں ایک ہی فعلی ساخت بار بار آتی تھی جسے متاخرین نے ردیف کی صورت میں نہ صرف قبول کیا بلکہ اسے وسعت بھی بخشی۔

یہ عمل فارسی شاعری کو عربی شاعری سے واضح طور پر مختلف کر دیتا ہے۔ عربی قصیدہ ایک ہی قافیہ پر قائم رہتا ہے مگر وہاں نحوی اعتبار سے ردیف کے لیے وہ گنجائش نہیں جو

فارسی میں موجود ہے۔ رودکی کی یہ فطری تکرار دراصل فارسی زبان کی نحوی قوت کا شعری اظہار ہے جسے بعد کے شعرا نے پہچانا، سنوارا اور فنی روایت میں بدل دیا۔
اہم بات یہ ہے کہ رودکی نے ردیف کو ایجاد کرنے کا کوئی اعلان نہیں کیا۔ انہوں نے محض وہ کہا جو زبان اور جذبہ ایک ساتھ کہلوانا چاہتے تھے۔ بعد کے شعرا نے اسی فطری تکرار کو پہچانا، سنبھالا، نکھارا اور بالآخر فنی ضابطے میں بدل دیا۔ سعدی، حافظ اور پھر اردو میں میر اور غالب تک پہنچتے پہنچتے ردیف ایک ایسا مرکز بن گئی جس کے گرد پوری غزل گھوم سکتی تھی۔ یوں ردیف کی تاریخ ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ پہلے ضرورت پیدا ہوتی ہے، پھر فن اس ضرورت کو تسلیم کرتا ہے ۔یوں کہا جا سکتا ہے کہ رودکی نے ردیف ایجاد کر کے فارسی شاعری کو نہ صرف ایک نئی صوتی شناخت دی، بلکہ اسے عربی شاعری کے سائے سے نکال کر اپنی الگ جمالیات عطا کی۔
جس طرح رودکی نے زبان کی فطری تکرار کو شاعری میں جگہ دی اور سعدی و حافظ نے اسے شعوری فن میں ڈھالا، اسی طرح ہر عہد کا شاعر اس روایت میں اپنی سطح پر اضافہ کرتا ہے۔ روایت جامد نہیں ہوتی؛ وہ ہر دور میں نئے سوالات کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔
دریافت اسی تسلسل کی جدید شکل ہے۔ اس مجموعے نے روایت سے انکار کا جھوٹا پرچم نہیں بلکہ روایت میں اضافے کا سچا علم تھاما ہے۔ اس سعی کا مقصود شکستِ روایت نہیں بلکہ روایت کو شعورِ امروز سے گزارنا ہے۔ لیکن اس مجموعے کو سمجھنے کے لیے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ شعری تجربہ ہوتا کیا ہے اور روایت اس تجربے کو کس طرح جذب کرتی ہے۔
شعری تجربہ محض نئی ترکیب، نئی ہیت یا غیر مانوس ساخت کا نام نہیں۔ دراصل شعری تجربہ وہ ہے جس میں شاعر زبان کے مانوس امکانات کو نئی معنویت دے، روایت کے اندر رہتے ہوئے اس کی سرحدوں کو وسیع کرے اور قاری کو اجنبیت کے بجائے شناخت کی نئی سطح تک لے جائے۔ اس معیار پر دیکھا جائے تو دریافت میں "ہے مجھ میں" کی تکرار کوئی تجرباتی چال نہیں بلکہ وہ داخلی سوال ہے جو ہر غزل میں نئے تناظر کے ساتھ خود کو دہراتا ہے۔
یہ صورتِ حال ناصر کاظمی کے مجموعے پہلی بارش سے اس معنی میں مختلف ہے کہ وہاں یکسانیت ایک ہی زمین میں مختلف غزلوں کی صورت میں سامنے آتی ہے (یہ بھی ایک

علاحدہ بحث ہے کہ اسے غزلوں کا مجموعہ کہنا بھی چاہیے یا نہیں) اور یہ تجربہ زمین کے تسلسل، ایک خاص فضا اور کیفیت تک محدود رہتا ہے؛ جبکہ دریافت میں ہم باقاعدہ غزل کی صنف کے اندر رہتے ہوئے ردیف کو ایک فکری محور بنتے دیکھتے ہیں۔ یہ مجموعہ غزل کو توڑتا نہیں، بلکہ اسے اس کی داخلی قوت پر واپس لے آتا ہے۔ یہ بات البتہ قابلِ غور ہے کہ ایک ہی ردیف کو مختلف بحور اور قوافی میں برتنا شاعر کے لیے آسان نہیں۔ یہاں ردیف سہولت نہیں بلکہ ذمہ داری بن جاتی ہے۔ شاعر کو ہر بار یہ ثابت کرنا پڑتا ہے کہ وہی لفظی اختتام نیا معنی کیسے پیدا کرتا ہے۔ اس اعتبار سے دریافت ردیف کے ذریعے وحدت پیدا کرنے کی ایک کلاسیکی روایت کا تسلسل ہے، نہ کہ اس سے انحراف۔

درحقیقت، اگر اس مجموعے کو "تجرباتی" کہا جائے تو پھر ہمیں رودکی سے لے کر حافظ اور میر تک بہت سی شعری روایتوں کو بھی تجربہ کہنا پڑے گا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ردیف کا بار بار لوٹنا غزل کی داخلی ساخت کا بنیادی وصف ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں یہ واپسی صرف ایک غزل کے اندر نہیں، بلکہ پورے مجموعے میں پھیلی ہوئی ہے۔ دریافت اس معنی میں ایک دریافت ہی تو ہے: ردیف کی دریافت، باطن کی دریافت، اور اس سوال کی دریافت جو ہر شعر کے آخر میں خاموشی سے کھڑا رہتا ہے۔۔ "ہے مجھ میں"

اس مجموعے کو تجرباتی کہنا دراصل ردیف کی تاریخی، نحوی اور معنوی حیثیت کو نظر انداز کرنا ہے۔ دریافت تجربہ نہیں بلکہ تسلسل ہے:

رودکی کی فطری تکرار سے حافظ کی شعوری ردیف تک

اور وہاں سے آج کے داخلی سوال تک۔

اور یہی داخلی سوال اس یک ردیفی مجموعے کو جواز بخشتا ہے۔

ہمارا عہد بکھراؤ کا عہد ہے۔ خیالات بکھرے ہوئے، شناخت منتشر، اور زبان ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایسے وقت میں ایک ہی ردیف پر قائم رہنا کوئی تکنیکی ضد نہیں بلکہ ایک فکری اصرار ہے کہ بات کو کسی ایک مرکز پر لا کر دیکھا جائے۔ دریافت اسی مرکز کا نام ہے جہاں یہ مجموعہ ہمیں بتاتا ہے کہ ہر سوال باہر نہیں، ہر خلا میں عدم نہیں۔

اور یہی وہ مقام ہے جہاں یہ کتاب رودکی کی روایت سے جڑتی ہے۔ رودکی نے زبان کے اندر چھپی تکرار کو پہچانا تھا، ہزار سال بعد اشفاق ناصر اپنے باطن میں چھپی تکرار کو پہچان رہا ہے۔

دریافت : غزل کی نئی روح

(حصہ دوم)

اس مقدمے کے حصہ اوّل میں ہم نے دریافت کی غیر معمولی ساخت پر گفتگو کی۔ مقدمے کے اس حصہ دوم کو ایک الگ مضمون کے طور پر اس لیے نہیں لیا جا سکتا کہ دریافت کی غزلیہ ساخت، بشمول تکرار و ترتیبِ ردیف، اس امر میں پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اسے عہدِ حاضر کے تقاضوں سے منطبق کر کے اس کے ارتباط کا یقین کیونکر کیا جا سکتا ہے۔

مزید یہ کہ اس حصہ کے معروضات، غزل کے ارتقا کے حوالے سے، حصہ اوّل کی تکنیکی موشگافیوں سے یکسر آزاد ہیں، اس لیے اسے ایک ہی مضمون میں شامل کر کے ایک خواہ مخواہ کی اُلجھن کا شکار نہیں کرنا چاہیے۔

غزل اپنی تمام تر مقبولیت کے باوجود اپنے ارتقا کے لیے ایک نئے جینئس کی منتظر ہے، اور یہاں ہمیں یہی دیکھنا ہے کہ دریافت غزل کے ارتقا میں شاید غزل کی تاریخ کا اہم ترین موڑ کیوں ہے؟

حصہ اوّل میں ہم نے اس پہلو کا احاطہ کرنے کی کوشش کی کہ کس طرح صرف فارسی اور اردو انشا، ردیف کی معنویت کو مستحکم کرنے پر قادر ہے۔ قافیے اور ردیف کی یہی مجبوری ہے جو غالب تک کو غزل میں ایک تنگنا دیکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ جب غالب جیسے غزل کے محافظ کا یہ عالم ہے تو ہم غزل کے عمومی ناقدین کو کیوں کر اس کی مخالفت پر موردِ الزام ٹھہرا سکتے ہیں۔

انسانی علم، عقل اور درک کے ارتقا کے ساتھ ساتھ غزل ہر دور میں اپنی فطری عمر پوری کرتی نظر آتی رہی ہے، اور یقین مانیے کسی بھی دور میں غزل کے ناقدین کی یہ قضاوت کسی تعصب پر مبنی نہیں۔ یہ احباب غزل کی موت کی پیش گوئی کرنے میں کسی فکری بددیانتی کے سزاوار نہیں۔ بھلا اس قدر ساختیاتی اور فکری پابندیوں میں جکڑی صنف کہاں تک اپنا بوجھ سنبھال سکتی ہے؟

پابندیوں کا سامنا نظم (جو کہ تاریخی اعتبار سے شاعری کا بین الاقوامی سرخیل رہی ہے) کو بھی کرنا پڑتا ہے، مگر نظم کے دامن میں ساخت کے حوالے سے بہت گنجائشیں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر نظم کا ایک فارمیٹ ہے جسے سانیٹ کہا جاتا ہے، جہاں مصرعوں کی تعداد اور قوافی کی ترتیب ہمیشہ معین رہتی ہے۔

اب یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ موضوعاتی اعتبار

سے سانیٹ ایک رومانوی صنف ہے۔ اگر کوئی
شاعر کسی دیگر حسایت پر طبع آزمائی کرنا
چاہے تو بہت سی اصناف اور بھی موجود ہیں۔
اگر کسی شاعر کو مجبور کر دیا جائے کہ اس نے
صرف سانیٹ لکھنی ہے تو سوچیے اسے کس قدر
وقت کا سامنا کرنا ہوگا؛ چہ جائیکہ سانیٹ لکھنے
پر اسی قدر شعرا کو مجبور کر دیا جائے جتنے شعرا
نے فارسی اور اردو میں غزلیں کہی ہیں۔ یقیناً نہ
سانیٹ میں یہ کمال موجود ہے اور نہ ہی کسی
جینوئن شاعر میں۔ اب اسی صورت حال پر اگر
غزل کو پرکھا جائے تو ناقدین کا اعتراض بجا
اور منطقی دکھائی دیتا ہے۔

اب یہ غزل کا معجزۂ خاص ہے کہ اس قدر
صائب اعتراض کے باوجود یہ زندہ، قائم
اور مربوط رہنے پر مصر بھی ہے اور کامیاب
بھی۔ مگر اس معجزۂ خاص کا ظہور بعض وسیلہ
ہائے خاص کا مرہونِ منت ضرور رہا ہے۔

ولی دکنی نے غزل کو بلوغت بخشی، لیکن جب یہ
بلوغت اپنی نازکی کھونے لگی تو میر نے اس کے
زبان و بیان کو وہ وسعت بخشی کہ دواوین کا
ایک پرشکوہ انبار کھڑا کر دیا۔ بعدازاں جب یہ
بلوغت اور زبان و بیان بعض مخصوص زاویوں
کی زنجیر سے بندھے نظر آنے لگے تو غالب
نے غزل کو مضامین کے ایک صفرۂ سیاہ (بلیک
ہول) میں تبدیل کر دیا کہ ایسا کوئی موضوع نہ
رہا جو غزل میں اپنی جگہ نہ بنا سکتا ہو۔

اگلی صدی آئی تو روایتی، فلسفیانہ اور سائنسی
سانچے تبدیل ہونے لگے۔ مشینوں اور سرمایہ
دارانہ نظام نے انسانی عالی خیالی کے مقابلے
میں زمینی حقائق اور نوعِ انسانی کی مجموعی زبوں
حالی کو پوری شد و مد سے لاکھڑا کیا۔ مابعد
الطبیعیات کے کئی اجزا طبیعیات میں نظر آنے
لگے۔ زندگی تلخ بھی ہوگئی اور بے حد بدل بھی گئی۔
ترقی پسندوں نے یہ جانا کہ یہ نئی حسایت
صرف نظم یا نظمیہ آہنگ ہی میں جلوہ گر ہو سکتی
ہے۔ انھوں نے بجا تخمینہ لگایا۔ غزل کا
آہنگ اب نئی دنیا سے مطابقت کھونے لگا
تھا۔ ہر دور کی طرح غزل کے مستقبل پر بے
شمار سوالات اٹھنا شروع ہو گئے۔

ایسے میں شعرا کی ایک نئی کھیپ سامنے آئی
جس نے غزل کے دامن میں ایک نئے
آہنگ کی کشیدہ کاری کا مشن اپنایا۔ شہزاد
احمد، احمد مشتاق، ظفر اقبال اور شکیب جلالی
نے دنیا کے تبدیل شدہ نظام کو غزل سے ہم
آہنگ کر دیا۔ غزل کے قالب میں پھر سے
ایک نئی روح پھونک دی گئی۔

نئی ترکیب، نظامِ تعلیم، نیا فنِ تعمیر، نئی
ایجادات، نئے سائنسی انکشافات، جدید
علوم ردیہ، امروزی کاروباری نظام وغیرہ یہ
سب روایتی مضامین اور چاشنی کے ہمراہ

غزل کی لہر میں داخل ہو گئے۔ غزل نے پھر اپنے خوش فکر ناقدین کی زبانوں پر تالے ڈال دیے۔ غزل نے ایک بار پھر اختراعِ مجدد (Re-Invention) کا مرحلہ طے کر لیا۔

لیکن ارتقا کس کو بخشتا ہے؟

بڑی بڑی مشینیں مائیکرو چپ میں بدل گئیں، جنگوں کی ہیئت بدل گئی، ذرائعِ ابلاغ ادارت کی قید سے آزاد ہو گئے، کمالاتِ کسب، علومِ نظری کو کھا گئے، شخصی آزادی اور قید و بند دونوں کی تعریفیں بدل گئیں، ایمان اشتباہ کا شکار ہو گیا، سچ اور جھوٹ میں امتیاز تقریباً ناممکن ہو کر رہ گیا، منبع ہائے آگاہی، قلتِ کتب خانہ سے نکل کر کثرتِ پردہ میں چھپ گئے، امارتِ فن حقارتِ تفریح میں ڈھل گئی - انسان اکیسویں صدی میں داخل ہو گیا۔

سرمایہ دارانہ نظام کا عفریت بھلے چنگوں کو نگل گیا۔ دنیا صرف دو حصوں میں تقسیم ہو گئی: خریدار اور فروشندہ (Buyer and Seller) آرٹ جیسی جنس آپ ہی ضعیف ہو گئی جس کا اثر شاعری پر بھی پڑا۔ نظم اپنی تمام تر دگرگونی کے باوجود بقا کی جنگ لڑنے پر مجبور ہو گئی تو غزل بیچاری کس کھاتے میں رہتی؟ غزل کے مرگ کا شور و غوغا پھر سر اٹھانے لگا، مگر اب کے حالات مختلف تھے۔

شاعری، بہ حیثیتِ مجموعی، ہنر در حال مرگ کے مرحلے تک آ پہنچی۔ نظم نے تو یہ زبوں حالی کبھی دیکھی ہی نہ تھی، اس لیے اسے جنگ کے پلے ہوئے جوان کہاں میسر آتے۔ فارسی شعرا تک نے نثری نظم اور گیت و نغمہ میں پناہ ڈھونڈنا شروع کر دی۔ ایسے میں اردو غزل کے علم بردار اپنی جگہ کھڑے رہے (اور نظم نگار بھی)۔ کون یہ سوچ سکتا تھا کہ شاعری اپنی بقا کے لیے اردو جیسی مقامی سی زبان میں اپنا مسیحا ڈھونڈے گی؟

مجھے یوں لگ رہا ہے کہ شاعری، اور بالخصوص اردو شاعری، کی بقا کے لیے ایک مسیحا دیارِ غزل سے ابھرا ہے جس نے دریافت نامی اس مجموعے سے اردو غزل میں ایک نئی روح پھونکی ہے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ فن، زبوں حالی یا یوں کہیے کہ حالتِ مرگ کا شکار کب ہوتا ہے؟ جب یا تو وہ خود ارتقائی عمل سے کنارہ کشی اختیار کر لے؛ یا پھر اس کے وصول کنندہ (یعنی ناظر و قاری وغیرہ) اپنے ارتقا سے اسے متصل نہ پا سکیں۔ ایسے میں فن کی ترسیل جاری تو رہتی ہے مگر فن کے کارپرداز ہی بازارِ فن میں واحد خریدار نظر آتے

ہیں۔ عوام فن کے ذوق سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں اور فن سمٹ کر صرف فنکاروں کے مباحث تک محدود ہو جاتا ہے۔ فن کا تعمیری کردار عنقا اور تفریحی کردار نمایاں ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہی حال ہم آج کی شاعری کا دیکھ رہے ہیں۔ شاعر (اور اچھے شاعر) بے شمار ہیں مگر ان کا تخلیق کردہ اعلیٰ ادب صرف شعرا کی وصولی کے لیے رہ گیا ہے۔ عوام کے لیے سیٹیوں، نعروں اور ہاؤ ہو والی شاعری ہی رہ گئی ہے جو معاشرے کی تعمیر کے لیے ذرہ برابر بھی فائدہ مند نہیں۔

سبب صرف یہ نہیں کہ عوام کا مجموعی مذاق کچھ شاعروں نے اپنے معاشی فوائد کے لیے بے انتہا پست کر دیا ہے بلکہ بنیادی سبب یہ ہے کہ عوام کو اب شاعری سے تفریح کے علاوہ کچھ اور کشید کرنے کی صورت نظر نہیں آ رہی۔

کائنات جتنی پھیل چکی ہے، انسان اتنا ہی تنہا ہو چکا ہے؛ اور یہ عمل ابھی جاری ہے۔ اشفاق ناصر کی حالیہ شاعری اور اس کی خاص و عام میں مقبولیت پر نظر ڈالیں تو دل کو ڈھارس ملتی ہے کہ ابھی قارئین کی ایک بڑی تعداد شاعری کے ڈھانچے پر محض تفریح کا ماس چڑھانے پر آمادہ نہیں۔ ہاں، شاعری کو ایک ایسی نئی روح ضرور چاہیے جو نہ صرف سنجیدہ قارئین کو انگیج رکھے بلکہ شاعری کے لیے نئے سنجیدہ قارئین بھی پیدا کرے۔

اس قدرے طویل تمہید پر معذرت خواہ ہوئے بغیر اب ذرا اس طرف چلتے ہیں کہ دریافت ارتقائے غزل میں ایک مور و نیاز موڑ کیوں ہے اور کیسے یہ مستقبل میں ہونے والی شاعری کو شکل دیتی دکھائی دیتی ہے۔

تمہید میں ہم نے یہ تو دیکھ لیا کہ اکیسویں صدی کا انسان کن مسائل کا شکار ہے اور شاعری کیوں اس کے لیے محض تفریح یا خوش بینا ہو کر دیکھیں تو گداز طبع کا محور ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ دریافت نے ایسا کیا کیا کہ شاعری کا گم شدہ تربیتی پہلو بھی مائل بہ احیا نظر آنے لگا ہے۔

تین تصورات ذہن میں رکھیے:

ا) کون و مکاں ب) خوددرُونی

ج) روشِ زندگی

کون و مکاں میں مکان، یعنی Space، سے تو ہم آگاہ ہیں ہی، اور وسیع تر تناظر میں ہم زمان کو بھی مکان ہی کا حصہ مان لیتے ہیں۔ اہم سوال یہ ہے کہ "کون" سے کیا مراد ہے؟

عالمِ موجودات میں زمان و مکان کے علاوہ جو بھی ہے وہ "کون" کہلاتا ہے، جس میں بعد از انفجارِ بزرگ (Big Bang) کی جملہ مرئی و غیر مرئی مخلوقات، مادہ اور اس

سے ہی تمام اشیا، توانائی، مادۂ سیاہ، آواز و خاموشی، تصوراتِ طبیعیات بشمول کشش، شعاع، رفتار وغیرہ، تصوراتِ کیمیا، تصوراتِ نباتات، طب، علومِ غریبہ (Occult Sciences) اور اصولِ ریاضی وغیرہ سب شامل ہیں۔

خود دُرونی (SelfInner) میں انفرادی نفسیات، طبع، روحانیت اور عقائد وغیرہ شامل ہیں۔

روشِ زندگی سماجی طرزِ عمل، قوانین، رسومات، طرز ہائے حکومت اور سفارت وغیرہ سے عبارت ہے۔ انسانی زندگی انہی تین تصورات کے گرد گھومتی ہے اور ان تصورات کا جمالیاتی احاطہ بھی اسی قدر ضروری ہے جتنا کہ عملی اتصال۔

آج کا انسان مذکورہ جمالیاتی پہلو کو یکسر نظر انداز کر بیٹھا ہے، جس کا نتیجہ مسلسل تنازعات، جنسی انحرافات، شور شرابے اور اسفل ترین سطحیت کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ آرٹ، اور بالخصوص شاعری، اس سارے منظرنامے میں صدائے طوطی در نقار خانہ کی مثل ہے۔

سبب اس کا وہی ہے جو اوپر بیان ہوا، یعنی آرٹ کا ارتقا مجموعی انسانی ارتقا کی تیز رفتاری کا مقابلہ نہیں کر سکا۔ کچھ تو ہے جو آرٹ اپنے قدر دانوں کو موجودہ دور میں دینے میں ناکام رہا ہے۔ اشفاق ناصر کا یہ مجموعہ اسی نامعلوم یا گم شدہ عنصر کی دریافت سے عبارت ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ دریافت صرف شاعری، یا بالخصوص غزل، کو ہی نہیں بلکہ آرٹ کو مجموعی طور پر ایک نئی زندگی دینے کی کوشش بھی ہے۔ اس بیانیے کو سمجھنے کے لیے بھی دو تصورات ذہن میں رکھنا ہوں گے:

ا) فینٹسی ب) رومانس

فینٹسی: حقیقت کے دائرے کو پھیلانے کا فن

فینٹسی بنیادی طور پر یہ سوال اٹھاتی ہے:

اگر حقیقت ہماری موجودہ سمجھ سے کہیں زیادہ وسیع ہو تو؟

اس کی روح ماورائیت میں ہے۔ یہ ایسی کائنات تخلیق کرتی ہے جہاں اژدہے زندہ ہوں، درخت بولتے ہوں، وقت پلٹ سکتا ہو اور ایک معمولی انسان عظیم ہیرو بن سکتا ہو۔ فینٹسی میں اشیا اپنی ظاہری صورت سے زیادہ معنی رکھتی ہیں۔ ایک پہاڑ محض پتھروں کا ڈھیر نہیں ہوتا؛ وہ دیوتاؤں کی آرام گاہ، کسی قدیم تہذیب کی یادگار یا ایک سوئے ہوئے دیو کا وجود بھی ہو سکتا ہے۔ فینٹسی کا مقصد حقیقت سے فرار نہیں بلکہ حقیقت کو ایک نئے زاویے سے دیکھنا ہے، جیسے ایک شاعر روزمرہ کے منظر میں بھی ایک پوشیدہ

جہان دریافت کر لیتا ہے۔ فن بالعموم اور شاعری بالخصوص انسانی زندگی اور رویوں کو ہمیشہ فینٹسائز کرتے رہے ہیں۔

رومانس: جذبے کو گہرا کرنے کا فن

رومانس ایک مختلف سوال پوچھتا ہے:
انسانی دل سب سے زیادہ کس چیز کی آرزو کرتا ہے؟

اس کا مرکز احساس اور جذبہ ہے۔ رومانس دنیا نہیں بناتا، وہ دل کی دنیا کو وسیع کرتا ہے۔

اس میں محبت، ہجر، وصال، قربانی، حسرت اور وفا کو اس شدت سے پیش کیا جاتا ہے کہ ایک نگاہ پوری کائنات بن جاتی ہے اور ایک جدائی پوری عمر کا صحرا۔

ادب میں لیلیٰ مجنوں اس کی بہترین مثال ہے ۔ وہاں صحرا اصل موضوع نہیں بلکہ عاشق کا باطن ہے۔ مجنوں کا دل ہی ایک نئی کائنات تخلیق کر دیتا ہے۔

یہاں ایک ممکنہ الجھن کو مختصراً دور کرنا مناسب ہے کہ رومانس اور رومانویت میں فرق ہے۔ رومانس کا بنیادی موضوع انسانی جذبہ ہے جبکہ رومانویت کا بنیادی موضوع انسان ہے۔ ہم یہاں رومانس پر بحث کر رہے ہیں۔

دونوں کا سنگم بہت سی عظیم تخلیقات میں فینٹسی اور رومانس ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے۔
دانتے کی آسمانی و جہنمی سیاحت فینٹسی ہے، مگر اس کی روح بیاتریچے کی محبت ہے۔

ہیر رانجھا ایک عاشقانہ داستان ہے، مگر اس میں عشق رفتہ رفتہ ایک روحانی اور ماورائی کیفیت اختیار کر لیتا ہے۔

اگر ایک جملے میں فرق بیان کرنا ہو تو شاید یوں کہا جا سکتا ہے:
فینٹسی تخیل کا اُس کائنات کی تلاش میں نکلنا ہے جو ابھی وجود میں نہیں آئی، جبکہ رومانس تخیل کا اُس دل کی تلاش میں نکلنا ہے جو ابھی مکمل نہیں ہوا۔

یا پھر:
فینٹسی ناممکن دنیاؤں کا خواب دیکھتی ہے،
اور رومانس ناممکن محبتوں کا۔

اور شاید عظیم ادب کا اصل معجزہ یہی ہے کہ ہر سچا عشق اپنی ایک فینٹسی تخلیق کر لیتا ہے، اور ہر بڑی فینٹسی کے باطن میں کسی گم شدہ محبت کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

مگر یہ ادب کی روایتی توجیہ ہے جس نے گزشتہ زمانوں میں تو انسان کا حق ادا کیا ہے، مگر آج کے انسان کے مسائل پر ہم تفصیلاً اوپر بات کر چکے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے ادیبوں نے بنیادی طور پر انسان کو فینٹسائز کرنے کا ہنر سکھایا اور جہاں جہاں ضرورت محسوس ہوئی وہاں رومانس کی آمیزش سے اسے بدلتی حساسیت سے ہم آہنگ بھی کیا، اور

یہ بڑا کام تھا۔ لیکن آج فینٹسی کے پیمانے بدل چکے ہیں۔ بات صرف یہ نہیں کہ کئی اشیا فینٹسی کے زمرے سے نکل کر طبعیات کے دائرے میں آ چکی ہیں؛ مسئلہ یہ ہے کہ اس ارتقا نے اس تغیر کے عمل سے تحیر کو نکال باہر کیا ہے۔

کسی بھی قسم کی دگرگونی سے ماڈرن انسان کی حیرت کی رگ نہیں پھڑکتی۔ فینٹسی اپنے روایتی معنوں میں آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکی ہے۔

مگر اس سے قطعاً یہ ثابت نہیں ہوتا کہ انسان فینٹسی کی ضرورت سے ماورا ہو چکا ہے۔ الٹا یہی تو ایک مسئلہ ہے جو آج کے انسان کو گھن کی طرح چاٹ رہا ہے کہ ادب اور فن اس کی فینٹسائز کرنے کی طلب کو مطمئن نہیں کر پا رہے۔ اسی واسطے میں یہ تھیسس قائم کرنے کی کوشش میں ہوں کہ جب فینٹسی کی روایتی شکل ہی برقرار نہیں تو رومانس کی آمیزش اسے کیا سہارا دے گی۔

اشفاق ناصر کے اس شعری مجموعے نے مجھ پر یہ عقدہ وا کیا کہ اب فنکاروں کو فینٹسی اور رومانس کی آمیزش پر نہیں بلکہ فینٹسی کی رومانی دگرسازی پر توجہ دینا ہوگی۔ یہ ادبی اور فنی فلک کا ضروری ارتقا ہے۔ کائنات سے اسرار کے پردے اٹھتے چلے جا رہے ہیں جبکہ انسان کا دروں اسرار کی دبیز دھند میں لپٹتا ہی چلا جا رہا ہے۔ آج بروں جس قدر بے مصرف ہو چکا ہے، اسے انسان کی داخلیت سے منطبق کیے بنا آرٹ نشاطِ ثانیہ کے مرحلے میں داخل نہ ہو پائے گا۔

اشفاق ناصر نے اس مجموعے کی شکل میں آرٹ، ادب اور شاعری پر یہی احسان کیا ہے۔ مجموعے کی ثابت ردیف "ہے مجھ میں" اسی سفر کی طرف پہلا قدم ہے:

پڑے ہیں کونے میں کون و مکاں مرے اندر
نظارہ کیسا عجیب و غریب ہے مجھ میں

....

امید ہے قارئین کو اندازہ ہو چلا ہوگا کہ اوپر کون و مکاں کی تعریف کیوں بیان کی گئی تھی۔ آج کا انسان ارتقا کے جس مرحلے میں ہے، وہاں اب یہی حساسیت اسے ادب اور آرٹ کے ساتھ منسلک رکھ سکے گی۔ اور اسی لیے میں اس اصرار سے دست بردار نہیں ہو پاؤں گا کہ دریافت کوئی ادبی تجربہ نہیں بلکہ ایک بہت عظیم ارتقائی موڑ ہے۔

دریافت کی ردیفِ ثابت دراصل قادرالکلامی کے فنی اظہار کا محض مظہر نہیں بلکہ آنے والی ادبی حساسیت کا ایک اشاریہ ہے۔

بادی النظر میں یہ احساس ہو سکتا ہے کہ ایک ہی ردیف میں سو سے اوپر غزلیں کہنا شاید شاعر کے لیے اپنی فنی مہارت کو منوانے کی خواہش ہے مگر ایسا قطعاً نہیں۔

ذرا مندرجہ ذیل نکات پر نظر ڈالیے:

ا) "ہے مجھ میں" کی ردیف انسان کے داخل سے عبارت ہے، جو مستقبل میں فینٹسی کو رومانٹک کرنے کے لیے ضروری ہے؛

ب) پورے مجموعے میں صرف ردیف ثابت ہے، جبکہ جو جو بحور اس ردیفِ ثابت کی متحمل ہو سکتی تھیں وہ سب شاملِ حال ہیں؛

ج) ان ممکنہ بحور میں جتنے بھی قوافی استعمال کیے جا سکتے تھے وہ استعمال میں لائے گئے ہیں۔

ان تین نکات سے بلاشبہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اشفاق ناصر قادر الکلام شاعر ہیں، مگر یہ امر بالکل واضح ہے کہ یہ اظہار اس مجموعے کا مطمحِ نظر ہرگز نہیں۔

ارتقا کے اس مرحلے پر ضروری تھا کہ غزل کی یہ اصطلاحِ تنگنا میں جتنے بھی زاویے ممکن ہوں بروئے کار لائے جائیں۔ اور اشفاق ناصر نے نہ صرف یہ ثابت کیا ہے کہ انسانی خارج کی کوئی بھی نمود اس کے داخل سے ماورا نہیں، بلکہ شاید اس بحث کو بھی جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے کہ غزل اپنی طبعی عمر پوری کر چکی ہے یا ایسا کبھی ہو پائے گا۔

فی الحال میرا کام دریافت کے اس تعارف سے پورا ہو چکا ہے۔ اس تمام بحث کے تناظر میں اشفاق ناصر نے فکری سطح پر کیا کیا گل کھلائے ہیں، اس کا بیان یوں بھی ممکن نہیں کہ اس مجموعے میں شامل سیکڑوں اشعار میں سے کوئی دو بھی آپس میں مماثلت نہیں رکھتے۔

ویسے بھی یہ لمحہ نقاد کی پیدائش سے پہلے کا لمحہ ہے۔

یہ انسانی، ادبی اور فنی ارتقا کا وہ موڑ ہے جہاں قاری اور ادب اپنا نیا تعلق قائم کرنے میں کسی تیسرے وجود کی ضرورت سے آزاد ہیں۔

آج قاری کو صرف دریافت کی شاعری اور اس سے نمودار ہونے والی نئی حساسیت کو گلے سے لگانا ہے۔

مجھے کامل یقین ہے کہ جو راستہ اشفاق ناصر نے ہموار کیا ہے، اس پر صرف شاعری نہیں بلکہ جملہ فنکار اس طور سے چلیں گے کہ فن اور فن کے قدردانوں کے انطباق کی اگلی رونقیں پھر سے لوٹ آئیں گی۔ بقول مرزا غالب:

خارہا از اثرِ گرمیِ رفتارم سوخت
منتے بر قدمِ راہروان است مرا

(میری تیز رفتاری کے اثر سے راہ کے کانٹے جل گئے ہیں۔
آنے والے مسافروں کے قدموں پر میرا یہ احسان ہے)

ہر دور میں کسی نہ کسی جری کو تو یہ ادق قدم اٹھانا ہی ہوتا ہے، آج یہ قدم اشفاق ناصر اٹھا رہا ہے۔

☆☆☆☆☆

ادب برائے زندگی

طاہر شبیر

حضرت آدمؑ کی زندگی میں ہی قابیل نے ہابیل کو قتل کیا تھا۔ اور اس قتل کی وجہ قابیل کی جنسی ہوس پرستی تھی۔ اس طرح ظالم اور مظلوم کے دور کا آغاز ہوا۔ قابیل ظالم تھا اور ہابیل مظلوم۔ اس کے بعد آنے والی دُنیا کے ہر دور میں مالی اور جنسی ہوس پرستوں نے اپنی خواہشات کی راہ میں رکاوٹ بننے والے لوگوں کو ظلم کا نشانہ بنایا اور مزاحمت حد سے زیادہ بڑھنے پر اُنھیں قتل بھی کرتے رہے۔ ظلم و استحصال کا یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

دُنیا کا ہر مذہب یہی تعلیم دیتا ہے کہ اگر ذہنی سکون چاہیے ہو تو خواہشات کو قابو میں رکھو۔ خواہشات دو قسم کی ہوتی ہیں - مالی خواہشات اور جنسی خواہشات۔ جیسے جیسے یہ خواہشات بڑھتی جاتی ہیں انسان کی بے سکونی بڑھتی جاتی ہے۔ سکون اُنہی لوگوں کو ملتا ہے جو اپنی خواہشات کو قابو میں رکھتے ہیں۔ خواہشات کو قابو میں نہ رکھنے والے قابیلوں کے ہابیل قتل ہوتے رہتے ہیں۔

"دُنیا کا ازل سے یہی دستور رہا ہے
ہابیل ہوا قتل ہے قابیل کے ہاتھوں"

....

ہر دور میں راہِ حق پہ چلنے والوں یا حرفِ حق کہنے والوں کا قتل کیا جاتا رہا ہے کیونکہ ہر دور کی استحصالی قوتیں یہ برداشت نہیں کرتیں تھیں کہ اُن کے ظلم و بربریت یا لوٹ مار کی راہ میں کوئی رکاوٹ بنے۔ یہ لوگ اپنے راستے کی ہر رکاوٹ کو طاقت کے ذریعے ہٹانے کی کوشش کرتے تھے اور اکثر اُنھیں کامیابی ملتی رہی۔

اسی طرح "سقراط" کو دیکھا جائے تو وہ وقت کے خداؤں کے خلاف ملک کے نوجوانوں کو اپنی تعلیمات کے ذریعے شعور دیتا تھا۔ وہ حکمرانوں کے جھوٹے مذہبی عقائد اور سماجی یا سیاسی نظریات کی مخالفت کرتا تھا۔ ایتھنز کے نوجوانوں کی بڑی تعداد اُس کی تعلیمات سے متاثر ہو کر حکمرانوں کے مذہبی عقائد اور سیاسی احکامات کو ماننے

سے انکار کر دیتی تھی۔ اسی وجہ سے حکمرانوں نے سقراط کو ملکی عدالتوں کے ذریعے موت کی سزا سنائی۔ جس شخص کو موت کی سزا سنائی جاتی تھی اُسے زہر کا پیالہ پینا پڑتا تھا۔ عدالتی فیصلے میں یہ بھی کہا گیا کہ اگر سقراط ملک کی حدود سے باہر چلا جائے تو اُس کی سزا معاف ہو جائے گی اور سقراط کو زہر کا پیالہ نہیں پینا پڑے گا۔ سقراط کے شاگردوں نے اُسے مشورہ دیا کہ وہ کہ مُلک کی حدود سے باہر چلا جائے اس طرح اُس کی جان بچ جائے گی۔ سقراط نے اپنے دوستوں اور شاگردوں کا مشورہ ماننے سے انکار کر دیا یوں سقراط زہر کا پیالہ پی کر زندہ جاوید ہو گیا۔

اسی طرح سیّد الشہداؑ حضرت امام حسینؑ سے کہا گیا تھا کہ اگر وہ یزید ملعون کی بیعت کر لیں تو اُن سے جنگ نہیں کی جائے گی اس طرح وہ اپنی جان بچا سکتے ہیں۔ لیکن امام حسینؑ نے یزید کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ اب ظالم اور مطلق العنان حکمران بن کر حکومت کر رہا تھا۔ امام حسینؑ نے کربلا میں اپنی اور اپنے خاندان کے افراد کی قربانی دے کر رہتی دُنیا تک لوگوں کو حق کی خاطر جان قربان کرنے کا پیغام دیا تھا۔

اب ہم آتے ہیں برصغیر پاک و ہند کی علمی اور ادبی تحریکوں کی طرف جن میں علی گڑھ تحریک یا سرسیّد تحریک کا نام سرفہرست ہے۔

سرسیّد احمد خان نے برطانیہ کا دورہ کیا اور وہاں کے تعلیمی اور ادبی نظام کا جائزہ لیا تو اُنھیں احساس ہُوا ملک میں جو شاعری کی جاتی ہے اُس میں ہجر و وصال، زُلفِ جاناں اور عشق و محبت کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا جبکہ یورپ کے شعرا اپنے سماجی اور سیاسی مسائل اور اُن کے حل کے بارے میں شاعری کرتے ہیں۔ اس طرح اُن کی شاعری میں مزاحمت اور انقلاب کی بات ہوتی ہے۔

اسی طرح برصغیر کے نثری ادب میں جنّوں اور بھوتوں یا طوطے مینا کی کہانیوں اور کوہ قاف کی پریوں کی داستانیں ہوتی ہیں۔ اس طرح برصغیر میں جو ادب تخلیق ہوتا تھا وہ ادب برائے ادب تھا، جس میں کوئی مقصدیت نہیں ہوتی تھی۔ یہ ادب بچوں اور عورتوں کا دل بہلانے کے لیے تخلیق کیا جاتا تھا۔

سرسیّد احمد خان نے برطانیہ سے واپسی پہ مولانا شبلی نعمانی، الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا محمد حسین آزاد کو ساتھ ملا کر فیصلہ کیا کہ اب مُلک میں ادب برائے ادب کے بجائے ادب برائے زندگی کا آغاز کیا جائے گا اور اب جو ادب تخلیق ہو گا اُس کا مقصد لوگوں کے سیاسی اور سماجی شعور کو بہتر بنانا ہو گا۔ سرسیّد تحریک کے ان پانچ ارکان کو اُردو ادب کے ”ارکانِ خمسہ“ کہا جاتا ہے۔ جن میں سرسیّد احمد خان مولانا شبلی نعمانی، الطاف حسین حالی اور ڈپٹی نذیر احمد

ترقی پسند خیالات رکھتے تھے۔ جبکہ مولانا محمد حسین آزاد کے خیالات قدامت پسند تھے لیکن وہ ادب برائے زندگی اور بامقصد ادب لکھنے کے حامی تھے۔

جب سرسیّد احمد خان نے مسلمانوں سے کہا کہ مسلمان مرد انگریزی سکولوں میں داخل ہو کر سائنس اور انگریزی پڑھیں تو مُلک کے علماء اُس کے خلاف ہو گئے۔ برصغیر کے علماء نے اعلان کیا کہ سرسیّد احمد خان کافر ہو گیا ہے وہ مسلمانوں سے کہتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو انگریزی اور سائنس پڑھائیں۔ پھر سرسیّد احمد خان نے بڑے حوصلہ اور تحمل سے مسلم علماء کا مقابلہ کیا اور اپنے مشن کو جاری رکھا۔ اس طرح وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جیسا تعلیمی ادارہ بنانے میں کامیاب ہوئے جہاں مسلمان نوجوان جدید علوم کی تعلیمات حاصل کرتے تھے۔

سرسیّد احمد خان نے مسلمان مردوں سے تو کہا کہ وہ سائنس اور انگریزی پڑھیں لیکن انھوں نے مسلمان عورتوں سے کبھی نہیں کہا کہ وہ سائنس اور انگریزی پڑھیں۔ سرسیّد تحریک نے کبھی آزادیِ نسواں اور مزدوروں یا کسانوں کے پسے ہوئے طبقات کے حقوق کی بات نہیں کی۔ سرسیّد تحریک کے تمام ارکان ملک کے حکمران طبقات اور اعلیٰ افسران سے میل جول رکھتے تھے اور وہ اپنے سماجی مقام کو چھوڑ کر مُلک کے عوام اور پسے ہوئے طبقات کے ساتھ مل کر رہنے یا کام کرنے کو تیار نہیں تھے۔

سرسیّد کے عہد میں ہی روس، جرمنی اور یورپ کے دوسرے ممالک میں کارل مارکس اور اینگلز کی کیمونزم کی تحریک زوروں پر تھی۔ یہ تحریک سرمایہ دارانہ ظلم و جبر کے خاتمے اور مزدوروں کے اقتدار کی بات کرتی تھی۔ کارل مارکس اور اینگلز سے پہلے روس اور جرمنی میں جو ادب تخلیق ہوتا تھا وہ قدامت پسند ادب تھا۔ اُس میں سماجی مسائل اور اُن کے حل کا کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا۔ کارل مارکس اور اینگلز نے شاعروں اور ادیبوں کو سماجی مسائل اور اُن کے حل کرنے کے بارے میں ادب تخلیق کرنے کا مشورہ دیا۔ کارل مارکس نے کہا کہ ادب کو سیاست سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ مارکس اور اینگلز اُن حربوں کے سخت نقاد تھے جو آرٹ اور ادب کو سیاست سے الگ کر کے ''ادب برائے ادب'' یا 'آرٹ برائے آرٹ'' کے نظریے کو فروغ دیتے ہیں۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ حقیقت نگار لکھاریوں کو ترقی پسند علمی نظریے کی عکاسی کرنی چاہیے۔ ترقی پسند نظریات سے سرشار ہو کر حقیقی مسائل سے نبرد آزما ہونا چاہیے۔ اسی وجہ سے اُنھوں نے ادب میں مقصدیت کی حمایت کی۔ اسے نظریاتی اور سیاسی صف بندی کا نام دیا۔

مارکس اور اینگلز دونوں اس بات کے قائل تھے کہ ترقی پسند ادب کو اُس عہد کے اہم

عوام کو سچائی سے پیش کرنا چاہیے۔ ترقی پسند نظریات کو پھیلانا چاہیے اور سماج میں ترقی پسند قوتوں کے مفادات کا دفاع کرنا چاہیے۔ ادب میں پارٹی رجحان کی جدید اصطلاح اُن کے اسی خیال کو ظاہر کرتی ہے۔ مارکس اور اینگلز نے حقیقت پسند مصنفین، شیکسپیئر، سروینٹیز، بالزاک اور پشکن وغیرہ کے کام کی تعریف کی۔ مارکس نے انیسویں صدی کے انگریز حقیقت نگاروں ڈکنز، تھیکرے، برونٹس اور گاسکیل کو شاندار ناول نگاروں کا گروہ قرار دیا۔ جن کی واضح اور فصیح و بلیغ کتابوں نے تمام پیشہ ور سیاستدانوں، تبصرہ کاروں اور اخلاقیت پسندوں سے بھی بڑھ کر دُنیا میں سیاسی حقائق پیش کیے۔

اینگلز نے فرانسیسی حقیقت پسند لکھاری ''بالزاک'' کی تحریروں کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا! ''انسانی مزاح'' کے بارے میں لکھتے ہوئے بالزاک نے قاری کو فرانسیسی سماج کی حیرت انگیز حقیقت پسندانہ تاریخ پیش کی ہے۔ جس کی معاشی تفصیلات سے (مثلاً منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد کی تنظیم نو) میں اُس دور کے تمام مورخوں، معیشت دانوں اور شماریت دانوں کی تحریروں سے زیادہ سیکھا۔

کارل مارکس اور اینگلز کی اس تحریک نے آگے چل کر چین اور روس کے عظیم انقلابات برپا کیے اور کمیونسٹ انقلاب کی یہ تحریک ایشیا افریقہ اور جنوبی امریکہ کے بہت سے ملکوں میں پھیل گئی۔ کارل مارکس اور اینگلز کی اس ترقی پسند ادب اور سوشلسٹ انقلاب کی تحریک سے متاثر ہو کر لندن میں زیرِ تعلیم ہندوستانی طلباء نے ہندوستان میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کا فیصلہ کیا۔ اس تنظیم کی بنیاد پہلے لندن میں 1934 میں رکھی گئی۔ جس کے بانیوں میں نمایاں نام سیّد سجاد ظہیر، ملک راج آنند اور ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر کے تھے۔ جب یہ لوگ ہندوستان آئے تو انھوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین آف انڈیا کی بنیاد رکھی۔ جس کا پہلا اجلاس 10 اپریل 1936 کو لکھنؤ میں ہُوا۔ اس اجلاس کی صدارت منشی پریم چند نے کی۔ اس اجلاس میں منشی پریم چند نے طویل صدارتی خطبہ پڑھا۔ اس اجلاس میں اعلان کیا گیا کہ ادب برائے زندگی، ادب برائے جدوجہد اور ادب برائے انقلاب ہی ہمارا منشور ہے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین نے کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے ساتھ مل کر آزادیِ نسواں، عورتوں کے سماجی حقوق، مزدوروں اور کسانوں کے پسے ہوئے طبقات کے حقوق کی کھل کر بات کی۔ اس تحریک کے نمایاں ارکان میں منشی پریم چند، سید سجاد ظہیر، ملک راج آنند، جاں نثار اختر، سیّد سبطِ حسن، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر رشیدہ جہاں، ظہیر کاشمیری، محمود الظفر، احمد علی، ساحر

لدھیانوی، حمید اختر، کیفی اعظمی، مخدوم محی الدین، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر اور فیض احمد فیض کے نام شامل ہیں۔ یہ تحریک بڑی تیزی سے سارے ہندوستان میں پھیل گئی اور اس کے ارکان نے اعلیٰ درجے کا مزاحمتی اور انقلابی ادب تخلیق کیا، جس سے لوگوں کے سیاسی اور سماجی شعور میں اضافہ ہوا۔

قیامِ پاکستان کے بعد انجمن ترقی پسند مصنفین بھی دو حصوں، انجمن ترقی پسند مصنفین ہندوستان اور انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان میں تقسیم ہوگئی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کا پہلا اجلاس 1949 میں باغِ جناح لاہور میں ہُوا اور احمد ندیم قاسمی کو انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کا سیکرٹری جنرل منتخب کیا گیا۔ 1951 میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے ارکان کو پنڈی سازش کیس کی وجہ سے جیلوں میں بند کردیا گیا اور پھر 1954 میں انجمن ترقی پسند مصنفین پر پابندی لگادی گئی۔

اس تنظیم کی مخالفت کرنے والے ادیب اور شاعر "ادب برائے ادب" لکھنے کی بات ہی کرتے رہے۔ اسی طرح حکمران طبقے اور اُس کے پروردہ ملاؤں نے بھی اس تنظیم کی ہمیشہ مخالفت کی کیونکہ یہ تحریک آزادیٔ نسواں، عورتوں کے حقوق، عورتوں کی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرنے کی بات کرتی تھی۔ یہ تنظیم مزدوروں اور کسانوں کے پسے ہوئے طبقات کے حقوق کی بات کرتی تھی۔

ترقی پسند سوچ رکھنے والی ادبی اور سیاسی تنظیموں کی مخالفت کرنے والے رجعت پسند لکھاری اور مذہبی انتہا پسند ہمیشہ مزدوروں اور کسانوں کے حقوق اور آزادیٔ نسواں یا عورتوں کی کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم کی مخالفت کرتے رہے۔ یہ طالبانی سوچ رکھنے والے لوگ آج بھی افغانستان اور پاکستان کے قبائلی علاقوں میں لڑکیوں کے سکولوں کو مسمار کرتے ہیں اور عورتوں کی تعلیم کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ اسی طرح یہ مذہبی انتہا پسند سوشلزم اور پسے ہوئے طبقات کے حقوق کی بات کرنے والوں پر کفر کے فتوے لگاکر اُنھیں قتل کرتے رہتے ہیں۔ اس کی ایک مثال 13 اپریل 2017 عبدالولی خان یونیورسٹی مردان کے طالب علم مشعال خان کا وحشیانہ قتل ہے۔ جسے مذہبی انتہا پسند تنظیم کے دہشت گرد طلباء نے صرف اس لیے تشدد کرکے قتل کردیا کہ وہ سوشلزم کی بات کرتا تھا۔

ادب برائے ادب، گُنگنے والے درباری ادیب ہمیشہ ترقی پسند مصنفین کی اس لیے مخالفت کرتے رہے کہ اُن کے آقاؤں کو یہ بات قبول نہیں کہ مزدوروں اور کسانوں کے پسے ہوئے طبقات کے حقوق اور انقلاب کی بات کی جائے۔

☆☆☆☆☆

زعیم رشید کی ''ہینڈ میڈ نظمیں'': جدید اردو نظم میں باطنی کرب، سماجی شعور اور تخلیقی انفرادیت کا مطالعہ

ارشد محمود ارشد

اردو نظم کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہر عہد نے اپنے فکری، سماجی اور تہذیبی تقاضوں کے مطابق نظم کو نئے امکانات سے روشناس کرایا ہے۔ اقبال نے نظم کو فکری بلندی عطا کی، راشد اور میراجی نے اسے جدید شعور سے آشنا کیا، مجید امجد نے داخلی کائنات اور کائناتی احساس کو نئی زبان دی، جبکہ بعد کے شعرا نے جدید انسان کی تنہائی، بے یقینی اور شناخت کے بحران کو موضوع بنایا۔ اسی سلسلے میں زعیم رشید کی کتاب ''ہینڈ میڈ نظمیں'' جدید اردو نظم میں ایک اہم اور قابلِ توجہ اضافہ ہے۔

یہ مجموعہ پہلی مرتبہ 2022 میں اور دوسری مرتبہ 2023 میں شائع ہوا۔ تقریباً ایک سو ساٹھ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں ستر سے زائد نظمیں شامل ہیں جو شاعر کے فکری سفر، داخلی تجربات اور عصری شعور کی بھرپور نمائندگی کرتی ہیں۔ کتاب کا مطالعہ یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ زعیم رشید نظم کو محض اظہار کا وسیلہ نہیں سمجھتے بلکہ اسے زندگی کے پیچیدہ تجربات کو دریافت کرنے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ان کے ہاں نظم ایک مکالمہ بھی ہے، ایک سوال بھی، ایک اعتراف بھی اور ایک احتجاج بھی۔

کتاب کا عنوان ''ہینڈ میڈ نظمیں'' ابتدا ہی میں قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ موجودہ دور مشینی رفتار، مصنوعی اظہار اور فوری تخلیق کا دور ہے، ایسے میں ''ہینڈ میڈ'' کا لفظ خلوص، انفرادیت اور ذاتی لمس کی علامت بن جاتا ہے۔ گویا شاعر یہ بتانا چاہتا ہے کہ اس مجموعے کی ہر نظم کسی تیار شدہ سانچے میں نہیں ڈھلی بلکہ زندگی کے

براہِ راست تجربے سے جنم لینے والی تخلیق ہے - یہی احساس پورے مجموعے میں نمایاں رہتا ہے۔

زعیم رشید کی ،، پہلی نظم ،، اور دوسرا عشق" محبت کے روایتی تصور سے مختلف ایک نفسیاتی اور داخلی کیفیت کی ترجمان ہے۔ شاعر محبت سے بچنے کی کوشش کرتا ہے، خود سے عہد کرتا ہے، مگر محبت تمام ارادوں کو شکست دے دیتی ہے۔

کئی وعدے کیے خود سے
بہت سی قسمیں کھائی تھیں
محبت پھر نہیں کرنا
بڑا پختہ ارادہ تھا
مگر یہ عام سی لڑکی
یہ اب میری محبت ہے

ان سادہ مصرعوں میں محبت کی وہ حقیقت پوشیدہ ہے جو انسان کی مرضی سے نہیں بل کہ اس کے وجود پر وارد ہوتی ہے۔ نظم کا سب سے خوب صورت پہلو یہ ہے کہ شاعر اپنے جذبات کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے مگر تخلیق اسے بے نقاب کر دیتی ہے۔

مگر نظموں میں اُس کے نام سے میں پکڑا جاتا ہوں

....

یہ مصرع شاعر کے تخلیقی شعور کا بھی اظہار ہے کہ سچا شاعر اپنی شاعری میں خود کو بھی مکمل طور پر نہیں چھپا سکتا۔

اسی طرح ''آئینہ'' اس مجموعے کی اہم ترین نظموں میں شمار کی جا سکتی ہے۔ اس نظم میں شاعر نے جدید معاشرے کی تلخ حقیقتوں کو نہایت سادہ مگر طنزیہ لہجے میں بیان کیا ہے۔ معاشی محرومی، سماجی رویے، بے جا نصیحتیں اور انسانی منافقت اس نظم کے بنیادی موضوعات ہیں:

زندگی ناکام گزرے تو مصیبت یہ بھی ہے
زندگی کے نام سے نا آشنا افراد بھی
پند و نصیحت کے لیے آ جاتے ہیں

....

یہ محض ایک شخص کا تجربہ نہیں بلکہ ہمارے معاشرے کی اجتماعی نفسیات ہے، جہاں ناکامی کو سمجھنے کے بجائے اس پر تبصرے کیے جاتے ہیں۔ شاعر آگے چل کر کہتا ہے:

جانتا ہوں،
خود نہیں معلوم ان کو!!
مشورہ کیا خاک دیں گے

یہ طنز دراصل ان تمام سطحی دانشوروں پر ہے جو زندگی کے حقیقی تجربے سے گزرے بغیر دوسروں کی رہنمائی کا دعویٰ کرتے ہیں۔

نظم کا آخری حصہ داخلی خود کلامی کی بہترین مثال ہے:

خود سے بھی آہستہ باتیں کیجیے
کروٹیں لیتی تمنا جاگ جائے گی زعیم!

....

یہ مصرعے شاعر کی داخلی حساسیت اور نفسیاتی شعور کو نمایاں کرتے ہیں۔

''وارفتگی'' زعیم رشید کی علامتی اور تجریدی شاعری کا عمدہ نمونہ ہے۔ اس نظم میں شاعر نے

براہ راست بیان کے بجائے تصویری کیفیت پیدا کی ہے۔ چاند، رات، خوشبو، خاموشی، پھول اور سرد موسم جیسے عناصر مل کر ایک ایسا شعری منظر تشکیل دیتے ہیں جسے محسوس تو کیا جا سکتا ہے مگر آسانی سے مکمل طور پر بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہی جدید نظم کا حسن ہے کہ معنی ایک ہی سطح پر نہیں رہتے بل کہ مختلف قراءتوں کے امکانات پیدا کرتے ہیں۔

''موجود'' وقت کے فلسفے پر لکھی گئی نہایت خوب صورت نظم ہے۔ شاعر ماضی کی حسرتوں اور مستقبل کے خدشات سے نکل کر حال کے لمحے کو جینے کی دعوت دیتا ہے۔

آج کا دن دوبارہ نہیں آئے گا
آج دیکھو مجھے
آج مل لو مجھے
اور پھر
کل نہیں آئے گا
کل نہیں آئے گا

یہ تکرار نظم کی موسیقیت کو بھی بڑھاتی ہے اور قاری کے ذہن پر ایک گہرا اثر بھی چھوڑتی ہے۔ شاعر گویا یہ باور کراتا ہے کہ زندگی ہمیشہ موجود لمحے میں بسر ہوتی ہے، نہ کہ یادوں اور اندیشوں میں۔

سماجی شعور کے حوالے سے ''دنیا بدل رہی ہے'' اس مجموعے کی نہایت اہم نظم ہے۔ شاعر ایک ایسے معاشرے کی تصویر پیش کرتا ہے جہاں غربت اور سرمایہ داری آمنے سامنے کھڑی ہیں۔ نظم میں سترہ سالہ لڑکی کی تصویر صرف ایک کردار نہیں بل کہ پورے سماجی نظام کی علامت ہے۔

مستقبل کے خواب کا فرغل اوڑھے
صبح سویرے چوراہے پر
منی سکرٹ میں سترہ سالہ چھٹی پرانی
غربت ------

یہاں ''غربت'' کو جسمانی وجود عطا کر دیا گیا ہے۔ یہی نظم کی سب سے بڑی فنی خوبی ہے۔ شاعر براہ راست نعرہ نہیں لگاتا بل کہ ایک منظر دکھاتا ہے، اور یہی منظر قاری کے ذہن میں سوالات پیدا کرتا ہے۔

مختصر نظم ''آخری خواہش'' اپنی سادگی میں دل ہلا دینے والی تاثیر رکھتی ہے۔

ذرا سی پنشن پر پلنے والے
غریب تنخواہ دار بیٹے کے بوڑھے بابا کو
موت آئے
تو وہ مہینے کے پہلے دن ہو

یہ چند سطریں ہمارے معاشرے کے متوسط طبقے کی پوری معاشی تاریخ بیان کر دیتی ہیں۔ یہاں جذباتیت نہیں، حقیقت کا درد ہے۔

''بدن سے مکالمہ'' میں شاعر خواب، خوف اور لاشعور کے درمیان ایک نفسیاتی منظر تخلیق کرتا ہے۔ پوری نظم میں داخلی اضطراب نمایاں ہے۔ شاعر خواب کو محض خواب نہیں رہنے دیتا بل کہ اسے انسانی نفسیات کے ایک پیچیدہ استعارے میں تبدیل کر دیتا ہے۔

اسی طرح ''دکھ'' تخلیق، زمین، اولاد، محرومی اور امید کی علامتوں سے تشکیل پانے والی نظم ہے۔
میں اس پر پھوٹے ہوئے شگوفوں کو اپنی
تخلیق کہہ رہا ہوں
اور آخر میں
مگر یہ کالی گھٹائیں، بارش---
ابارش پر تلی ہوئی ہے،،
یہ اختتام پوری نظم کو ایک نئے معنوی دائرے میں داخل کر دیتا ہے۔ یہاں بارش، جو عام طور پر زندگی کی علامت سمجھی جاتی ہے، الٹا تخلیق کے لیے خطرہ بن کر سامنے آتی ہے۔ یہی علامتی الٹ پھیر شاعر کے تخلیقی شعور کی نشاندہی کرتی ہے۔
زعیم رشید کی زبان اس مجموعے کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ وہ مصنوعی پیچیدگی پیدا نہیں کرتے۔ ان کی زبان بظاہر آسان ہے لیکن اس آسانی میں گہرے معنی پوشیدہ ہیں۔ ان کے ہاں روزمرہ زندگی کے الفاظ بھی شعری وقار اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ ضرورت سے زیادہ لفظوں کے استعمال کے بجائے مختصر جملوں سے زیادہ اثر پیدا کرتے ہیں۔
ان کی شاعری میں محبت، سماج، مذہب، خواب، تنہائی، معاشی مسائل، وجودی سوالات اور تخلیقی کرب ایک دوسرے سے الگ نہیں بل کہ ایک ہی شعری کائنات کے مختلف زاویے ہیں۔ یہی ان کی نظموں کو محض ذاتی واردات سے بلند کر کے اجتماعی تجربہ بنا دیتا ہے۔
''ہینڈ میڈ نظمیں'' کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ شاعر قاری پر اپنے خیالات مسلط نہیں کرتا بل کہ اسے سوچنے کی آزادی دیتا ہے۔ اس کی نظم سوال اٹھاتی ہے، راستہ دکھانے کا دعویٰ نہیں کرتی۔ یہی جدید نظم کی بنیادی خصوصیت ہے۔
مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ''ہینڈ میڈ نظمیں'' زعیم رشید کی تخلیقی بصیرت کا نمائندہ مجموعہ ہے۔ اس میں محبت کی لطافت بھی ہے، زندگی کی تلخی بھی، سماجی شعور بھی، داخلی کرب بھی، علامتی اظہار بھی اور فکری سنجیدگی بھی۔ یہ کتاب جدید اردو نظم کے سنجیدہ قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہے کہ زعیم رشید اپنے عہد کے ان شعرا میں شامل ہیں جو نظم کو محض اظہار کا وسیلہ نہیں بل کہ انسانی تجربے کی دریافت سمجھتے ہیں۔
یہ مجموعہ نہ صرف شاعر کے فکری ارتقا کا آئینہ ہے بل کہ معاصر اردو نظم میں اس کی انفرادی شناخت کا بھی مضبوط حوالہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''ہینڈ میڈ نظمیں'' کو جدید اردو نظمیہ ادب میں سنجیدگی سے پڑھنے اور اس پر مزید تحقیقی و تنقیدی کام کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ میری دعا ہے کہ زعیم رشید کے قلم کاٹ اسی طرح معاشرتی رویوں کے نقاب الٹتی رہے۔

☆☆☆☆☆

تعمیری ابہام کا حامل نظم گو:

فلسفیانہ مباحث میں الجھنے اور الجھانے کے بجائے نہایت سپاٹ پیرائے میں طوالت کا دامن چھوڑ کر کیا ہے۔

نوید صادق صاحب ایک کثیر الجہت شخصیت کے مالک ہیں، جو بلاشبہ اعلیٰ پائے کے انجینئر، محقق، نقاد، مدیر اور شاعر ہیں اور سب سے بڑھ کر ایک اچھے انسان ہیں اور یا یوں کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ ان میں بے شمار خوبیاں مجتمع ہیں اور یہ خوبیاں ان کی نظموں میں جا بجا جزوی یا کلی طور پر مرتسم دکھائی دیتی ہیں۔ وہ نہ صرف اعلیٰ پائے کے ادیب ہیں بل کہ انسان دوستی ان کی شخصیت کا خاصہ ہے۔

اور ان کا شاعرانہ طرزِ احساس انسانی اقدار کی کوکھ میں نمو پاتا ہے اور یہ فیصلہ انتہائی مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ بڑے انسان ہیں یا بڑے ادیب۔ مگر بڑا انسان اپنے ہر تشخص میں بڑا ہی رہتا ہے۔

ان کی نظم نہ صرف روایت کی پاسدار ہے بل کہ اپنے افکار و نظریات کی بدولت جدت سے ہم آہنگ ہو کر انفرادی روش اختیار کرتی دکھائی دیتی ہے:

وہ ہمیشہ دوستوں کی مدد کرنے کو مستعد و تیار رہتے ہیں۔

ان کے شاعرانہ افکار عالیات میں شعری رویوں سے مماثلتوں کے باوجود جداگانہ انداز بہت حد تک نمایاں ہے۔

انصر منیر

ان کی کتاب دوراہیہ میں شامل نظموں کا
مطالعہ کیا جائے تو یہ احساس کروٹیں بدلنے
لگتا ہے کہ نوید صادق محسوسات کا آدمی ہے
جیسا کہ ان کی نظم:

''میں داستانوں کا آدمی ہوں''

میں وہ ایک روایت شناس انسان کے طور پر
ہمارے سامنے آشکار کرتے ہیں کہ کیسے
انسان نفسانفسی کے دور میں جغرافیائی طور پر
بے حد قریب رہ کر بھی قلبی اور نفسیاتی سطح پر
میلوں دور رہتے ہے۔
نوید صادق کی نظم پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے
کہ وہ روایت شناس ہو کر بھی انفرادیت
سے دامن گیر ہیں اور اپنی نظم کو اپنے اردگرد
رونما ہونے والے واقعات سے تراشنے کا
استادانہ فن رکھتے ہیں۔
بادی النظر میں ان کی نظمیں اپنی تخلیقی اور
جمالیاتی فضا کے لحاظ سے ابتدا میں ایک عام
فہم بات کو لے کر چلتی ہیں اور آخر تک آتے
آتے حیرتوں کے جہاں میں گم کر دیتی ہیں
ان کی نظم:

پانی افوہ پانی

پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی انسان
اپنی لاش اپنے کندھوں پر اٹھا کر پھرتا ہے مگر
ساتھ ہی ساتھ اس حیات سوختہ سے اپنی
کمٹمنٹ کو اچھائی احسن طریقے سے نبھا رہا
ہے بل کہ وہ اپنے گرد و پیش کے مناظر کو
پورے جوش و خروش اور توجہ سے دیکھتا اور
محسوس بھی کرتا ہے۔
ان کی نظم ''میں اب سونا چاہتا ہوں'' میں
سے ایک ٹکڑا دیکھیے:

دریاؤں کا پانی شہر میں داخلہ چاہتا ہے
خاموش
ہمارے آنگن میں ایک چڑیا پر پھیلائے بیٹھی ہے
اڑنے کو تیار ہے
لیکن میں اب سونا چاہتا ہوں

یقین کریں وہ سونا چاہتے ہیں مگر ان کی
داخلی اور خارجی وارداتیں انھیں ایک حد
درجے بیدار انسان کے روپ میں ڈھالتی
دکھائی دیتی ہیں تاکہ اردگرد کا کوئی منظر تجسیم
ہونے سے چوک نہ جائے۔
ان کی نظمیں اپنے گرد و پیش سے نفسیاتی و
جمالیاتی سطح پر ہم آہنگ ہو کر تخلیق کے پیکر میں
ڈھلتی ہیں۔
ان کی نظم ''میرا کیا ہے'' دیکھیے، تو، یوں
محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے کمرے میں
موجود چیزوں کو نظم کرتے ہیں جو بظاہر
ایک عام بات لگتی ہے مگر بے ثباتی، وقت

کی بے ہنگم رفتار، مصروفیت ایسی علامات ہیں جو یک بہ یک جہان معنی کا در کھول دیتی ہیں اور انسان پڑھ کر تحیر میں مبتلا ہو جاتا ہے اور سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ انسان کس طرح اپنے گرد و پیش سے محو کلام ہو سکتا ہے

یقین کریں مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ نوید صادق چلتے پھرتے اپنے گرد جس منظر یا واردات کو دیکھتے ہیں وہ خود بخود نظم کے قالب میں ڈھلنے لگتی ہے ان کی نظم: ''سب ریت ہے'' میں بے ثباتی کو انتہائی سہل انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

اس معروضے میں راقم الحروف نے یہ محسوس کیا ہے کہ نوید صادق اپنے ماحول سے جڑے جذبات و احساسات کی تطہیر کرتے ہوئے اپنی نظموں میں اپنے اظہاریے کو بالکل جداگانہ انداز میں زیب قرطاس کرتے ہیں۔

مجموعی طور پر ان کی نظموں میں اگر دیکھا جائے تو تحیر بے ثباتی، سادگی، تنوع، وابستگی، ذات کا نفسیاتی اظہار حقیقی منظر نگاری، توکل، رشتوں کی اہمیت، یاس و حسرت، بے لوث مزاجی، اداسی، اچھوتا و منفرد انداز تکلم، کم مائیگی تنہائی۔ الیہ۔

اکتاہٹ۔ امید افزائی۔ نسٹیلجیا، دھیما انداز دل آویز انداز ایسے اظہاریے ہیں جو ان کی نظموں کا اختصاص ہیں۔

اور بلاشبہ انہیں عہد حاضر کے نمائندہ نظم نگاروں کی صف میں لاکھڑا کرتے ہیں۔

ایک اور بات جو انھیں دوسرے نظم نگاروں سے ممتاز و منفرد کرتی ہے وہ ان کا پرتحمل لہجہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کا اسلوب نہایت جداگانہ اور دل پذیر ہے جس میں وہ شاعرانہ محاسن کا خیال ایک ماہر لسانیات کے طور پر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ وقت کی نبض پر ہاتھ رکھ کر ایک روح عصر کے طور پر ہمارے سامنے اپنے مافی الضمیر کو بیان کرتے ہیں۔

بنظر غائر اگر ان کی نظموں کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی نظموں میں ایک حساس انسان نمودار ہوتا ہے جو اپنی انفرادی وضع قطع کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے گرد و پیش کو عمیق نگاہی سے دیکھتے ہوئے اپنے تجربات کو نہایت عمدگی سے نظم میں متشکل کرتا ہے۔

وہ شام وہ ہم وہ تم ---- زمانہ
دورانیہ مختصر رہا ہے

☆☆☆☆☆

تین پہر کی زندگی

ڈاکٹر طلعت شبیر کی کتاب ''ابوجی'' سوانحی ادب کا ایک شاہکار معلوم ہوتا ہے۔ ہم اسے خاکہ نگاری، یادنگاری، رپورتاژ، نثری نظم یا ایک ذاتی کلامیے کا متن بھی کہہ سکتے ہیں۔ ایسا کلام جو اس قدر رنگ بدل سکتا ہے اور کسی ایک ہیئت پر انسانی ذہن کو ٹکنے نہیں دیتا، لازم ہے کہ اپنے اندر اس فنکارانہ فریبِ نظری کا خاصہ رکھتا ہے جو متن کے گہرے معنی تک اُترنے کے لیے بڑے بڑے لکھاریوں کے ہاں پائی جاتی ہے۔ غالب اس کی ایک بڑی مثال سمجھے جاتے ہیں یا فکشن میں کافکا کا نام لیا جاسکتا ہے۔

میں نے آج صبح جب اس کتاب کے ورق اُلٹے تو ابھی اندھیرا تھا۔ ملگجا اندھیرا یا سرمئی اُجالا، ہم اسے چھپٹی اندھیرا بھی کہہ سکتے ہیں۔ کتاب کے نفسِ مضمون کی طرح وقت کے اس پہر کو بھی کئی نام دیے جاسکتے ہیں۔ لیکن میں اس سرمئی اندھیرے میں ڈوب گیا۔ جب اُبھرا تو دیکھا کہ سورج نکل چکا ہے اور نیلا آسمان ہر جانب نکھرے نکھرے موسم کی خبر سنا رہا ہے۔

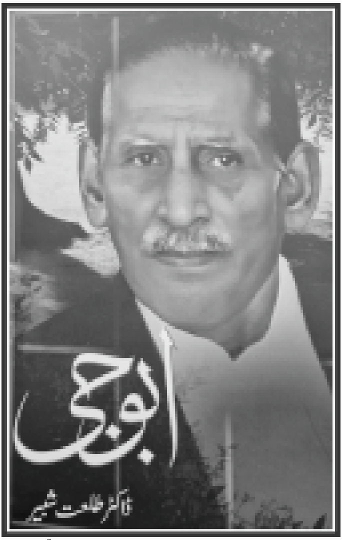

جس طرح ایک دن ایک پوری زندگی کی علامت بنتا ہے۔ اسی طرح یہ کتاب بھی تین ابواب میں ایک پوری زندگی کی علامت ہے۔ یعنی صبح، دوپہر اور شام --- الف لیلہ میں بھی لکھا ہے۔ دو ہی دن ہیں دُنیا میں۔ ایک آرام کا اور ایک تکلیف کا۔ اسی طرح اس کتاب میں بھی تین پہر کی داستان پوری زندگی کی داستان بن جاتی ہے۔

کتاب کا نام ''ابوجی'' پہلی نظر میں ہی بتا دیتا ہے کہ یہ ایک بچے کی آواز ہے۔ یہ آواز آخر تک ایک بچے کی آواز ہی رہی۔ بیٹا چاہے کرنیل ہی کیوں نہ بن جائے ایک باپ کی نظر میں وہ بچہ ہی ہوتا ہے۔ مصنف اس کتاب میں ہر جگہ ایک فرماں بردار بچے کے منصب

یاسمین

سے آگے نہیں بڑھا۔ یہ روحانی منصب اسے جان سے زیادہ عزیز رہا ہے۔ مادی ترقی میں بھلے وہ کرنل تک ترقی کر گیا لیکن روحانی طور پر وہ ایک طفلِ مکتب ہی رہا۔ کیوں کہ اُس کے سامنے ایک مہذب، جہاں دیدہ، پیکرِ خلوص ومحبت اور زندگی سے بھری ہوئی شخصیت تھی۔

یہ کتاب ایک بیٹے اور باپ کی داستانِ محبت ہے۔ بیٹا اُس نسل سے تعلق رکھتا ہے جس کے لیے باپ سب کچھ ہوتا ہے۔ اور باپ اُس برگزیدہ، پاکیزہ، چنیدہ، اور قربانی وایثار کی مجسم نسل کا نمائندہ ہے جس کو ہم آہستہ آہستہ کھو رہے ہیں۔ یہ معاشرہ اِس صدی میں ایک ایسے المیے سے دوچار ہونے والا ہے جس کا مداوا اب قیامت تک ممکن نہیں ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے مرنے سے ایک ایسی کمی سامنے آئی ہے جو دنیا بھر کے خزانوں کو جمع کر دینے سے بھی پوری نہیں ہوسکتی۔ سلیم احمد کی ایک غزل یاد آتی ہے:

دل کے اندر درد آنکھوں میں نمی بن جائیے
اس طرح ملیے کہ جزوِ زندگی بن جائیے
جس طرح خالی انگوٹھی کو نگینہ چاہیے
عالمِ امکاں میں اک ایسی کمی بن جائیے

....

یہ نسل عالمِ امکاں میں ایسی کمی بننے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ اِس نسل نے ایک عظیم تہذیب سے رس لے کر اُس دشوار زندگی کو سکون اور راحت کے اسباق پڑھائے تھے۔ زندگی کے کڑوے گھونٹ کو میٹھا بنانے کا ہنر سیکھا تھا۔ اُس تہذیب میں ایثار ایک عظیم قدر کے طور پر سامنے آتا تھا۔ اُس تہذیب میں حاصل کرنا نہیں دے دینا مقصد تھا۔ اُس تہذیب میں دینے والا ہاتھ نظر نہیں آتا تھا۔ اُس تہذیب میں لفظوں کی کفایت سب سے زیادہ اہم تھی۔ لوگ کنائے اشارے میں سب کچھ سمجھ جاتے تھے۔ تعلیم تک رسائی نہیں تھی لیکن دانش بے بہا تھی۔ ہر گلی محلے میں صاحبِ دانش موجود رہتے تھے۔ اُس تہذیب میں محبت اظہار کا نہیں احساس کا نام تھا۔ اُس تہذیب میں فانی اور لافانی کو دل کی گہرائی سے سمجھ کر دنیا میں رہنے کا سلیقہ سمجھایا جاتا تھا۔ اُس تہذیب میں حقیقت اور مجاز کو لوگ بچپن میں سیکھ لیتے تھے۔ اُس نسل کا باپ لمحہ لمحہ اپنی زندگی کو اولاد پر خرچ کر دیتا تھا اور پتا بھی نہیں لگنے دیتا تھا۔

ڈاکٹر طلعت شبیر نے ایک بیٹے کی حیثیت سے اپنے والد (مرحوم) کو ہم سے متعارف کروایا ہے لیکن ہم سب اُن سے پہلے ہی متعارف ہیں۔ میرے والد ہوں یا طلعت شبیر کے والد ہوں یا آپ سب کے والد ہوں۔ یہ ایک ہی خاندان کے لوگ ہیں۔ افسوس صوفیانہ طرزِ زندگی کے یہ بے مثال نمونے ہمارے آئیڈیل نہ بن سکے۔ آج یہ کہانی سُن لیں کل شاید ہم اِس کہانی کو سنانے کے لیے کسی سامع کو تلاش نہ کر پائیں۔ ہماری اگلی نسلیں اس عظیم نعمت سے محروم نظر آتی ہیں۔

وہ لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیے
پیدا کیے تھے چرخ نے جو خاک چھان کر

☆☆☆☆☆

خیبر پختونخوا کی پہلی مزاح نگار خاتون...... ڈاکٹر فائزہ شہزاد

خیبر پختونخوا کے روشنیوں کے شہر پشاور سے تعلق رکھنے والی مزاح نگار خاتون ڈاکٹر فائزہ شہزاد ہمہ جہت شخصیت کی مالک ہیں۔ کالم نگار، افسانہ نگار، ادبِ اطفال کی لکھاری، مصنفہ اور مزاح نگار ہیں۔ حال ہی میں ان کی مزاحیہ تحریروں کا مجموعہ ''بولوں کہ نہ بولوں'' سن 2026 میں منظرِ عام پر آچکا ہے اور ادبی حلقوں سے کافی داد و تحسین حاصل کر چکا ہے۔ انھوں نے کتاب کی اشاعت کے ساتھ خیبر پختونخوا کی پہلی مزاح نگار خاتون کا اعزاز بھی حاصل کرلیا ہے۔

ان کی کتاب ''بولوں کہ نہ بولوں'' بنیادی طور پر ایسی مختلف مزاحیہ تخلیقات کا مجموعہ ہے جو ذاتی تجربات و حوادث، مشاہدات و احساسات، جذبات، یاداشتوں، روایتی زندگی کے حالات اور واقعات سے مزاح کے ادبی فن پارے تشکیل دیے ہیں۔ ان کے مضامین ماضی اور حال کے بہترین امتزاج اور بدلتے رجحانات کے عکاس ہیں۔ بعض مضامین طنز و مزاح سے بھرپور آپ بیتی کے عکاس ہیں۔ اپنی آپ بیتی اور ذات کے قالب میں مزاح کو اس طرح لپیٹ لیتی ہیں کہ عنوان، مضمون، لفظیات، موقع محل اور جذبات کی اثر آفرینی طنز کو آشکارا کر کے اصلاح اور خوبی کے ساتھ دل کے سکون کا سبب بنتی ہے۔ ان کے مزاحیہ تحریریں محض تفریح کا وسیلہ اور قلبی اظہار بیان نہیں بلکہ ماضی کی خوشگوار یادیں، تلخ تجربات، طرزِ معاشرت و سماج کے رویے، مثبت اور منفی کرداروں اور عناصر کا ملاپ، زندگی کے نشیب و فراز، مصلحتیں اور انسانی قدروں کی انمول منظر کشی بھی ان کا خاصہ ہے۔ ان کی تحریروں کا سب سے اہم اور کلیدی نکتہ طنز و مزاح کی چاشنی میں اپنی ذات کو کشید کر کے زندگی کے مختلف رنگ ازخود دکھاتی ہیں۔ خواتین کی زندگی

ہمایون خان

کے حقیقی رنگ کو اپنی ذات کے احاطے میں مزاح کے طور پر پیش کرتی ہیں۔ خواتین کی خواہشیں، مستقبل کے خواب اور غیر یقینی رویوں کو "ساس اور بہو" کے رشتے میں بیان کرتی ہیں۔ اپنی تحریر انوکھی خواہش میں (ساس) بننے کی خواہش اور خواب کو یوں بیان کرتی ہیں:

"مجھے بچپن ہی سے ساس بننے کا شوق ہے۔ بہر حال وہ کچی عمر کی کچی باتیں سمجھ کر ہنسی میں ٹال گئے مگر میری خواہش روبروز پروان چڑھتی جارہی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے بچپن سے غور کیا تھا کہ عورت کی عزت صرف ساس بن کر ہوتی ہے۔ سب اس کے آگے پیچھے پھرتے ہیں ورنہ تو کوئی اُسے پوچھتا بھی نہیں"۔

ان کے ہاں طنز و مزاح، گُدگُداہٹ سے بھرپور فقرے، شوخیاں، شرارتیں، معنوی مقصدیت، پختہ فنی ہنرمندی، معاشرے اور سماج کی حقیقی تصویریں ملتی ہیں۔

ان کی تحریروں میں لب و لہجے کی شگفتگی، شائستگی، برجستگی اور اپنے عہد کی وابستگی اور نمائندگی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ ان کی سچائی، خودداری، خلوص، ہمدردی اور سماجی خاصیت بدرجہ اتم تحریروں میں گُل مل گئی ہے۔ یہ تحریریں ان کی ذاتی زندگی سے ہوتی ہوئی اَدب کا حصہ بنی ہیں۔ دلچسپ، نرالے اندازِ بیاں، شگفتہ فقروں اور مزاحیہ پیرائے میں اپنی عادات، خواہشات، احمقانہ کچی پکی سوچیں، مصروفیات اور شوق انسانی ونفسانی کو طنز و مزاح کے اَدبی سانچوں میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ لڑکیوں کے رشتے سے پہلے معصومیت، لااُبالی پن اور معصومانہ حرکتوں کو اپنی تحریر "خوشی کے رنگ" میں یوں ظاہر کیا ہے:

"بس امی نے فوراً دو کلو مٹھائی منگوائی اور میں نے دل و جان سے خوشی خوشی سبز کاغذ میں مٹھائی پیک کی اور اس پر سُرخ رنگ کے مارکر سے دل اور تیر کا نشان بنا کر یہ بڑا بڑا "مبارک ہو" لکھا۔ دل تو تھا کہ اماں ساتھ لے جائیں اور میں بھی ایک نظر دیکھ لوں مگر اماں نے کہا ارے ننھی کچھ دِنوں کی تو بات ہے وہ خود ہی آ جائیں گے"۔

فائزہ شہزاد نے معاشرتی اور سماجی رویوں کے ساتھ ساتھ عوامی نفسیات، سیاسی رویے، اخلاقی رویے اور زندگی کے گزر بسر کو مزاح کے خوب صورت اَدبی انداز اور رنگ میں پیش کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں تمام تر رویے اپنی اَدبی لطافتوں، رنگینیوں اور تفریح سمیت کھل کر سامنے آتے ہیں۔ یہ ہنسنے ہنسانے، طنز و مزاح اور اَدبی تفریح محض وقتی نہیں ہوتی بلکہ زندگی کے حقیقی رویوں، نفسِ انسانی، حیاتِ انسانی اور سماجی رویوں کی پہچان بن کر آشکارہ ہوتی ہیں۔

فائزہ شہزاد کا اندازِ بیاں، اسلوب، کہانی اور تحریر کی فنی و فکری گہرائی سے کشید تخلیقی عمل اور طنز و مزاح کا تڑکا اور شوخی و ظرافت سے بھرپور قالب مزاح کی عمدہ مثال ہے۔ ان کی مزاحیہ تحریریں اور موضوعات دل چسپ اور دل موہ لینے والے ہیں۔ یہ تحریریں پڑھنے والے کو نہ صرف اپنی طرف راغب کرتی ہیں

بلکہ پڑھنے والے محظوظ بھی ہوتے ہیں۔

اُنھوں نے بڑے دلفریب اندازِ بیاں میں آج کے دور کے نت نئے رسم و رواج، فیشن اور فنکشنز پر طنز کے چوٹ لگائے ہیں۔ آج کے رسم و رواج کو بے جا لوٹ مار اور لوگوں کے ان روّیوں کو مزاح میں لٹیروں سے تشبیہ دی ہے۔ اپنے مزاحیہ مضمون "ہائے یہ ڈاکو، یہ لٹیرے" میں یوں لکھتی ہیں:

رضیہ خالہ کے گھر ہر مہینے کوئی نہ کوئی فنکشن ہوتا ہے اور اس فنکشن کی آڑ میں صرف دوسروں کی جیب پر ڈاکہ ڈالنا ہوتا ہے۔ رضیہ خالہ کے گھر سے آیا کارڈ میرا دل جلا رہا ہے۔ یہ پوتے کے عقیقے کا کارڈ ہے۔ ابھی پچھلے مہینے شوہر کی ترقی ہوئی تھی تو اُس کی دعوت ہوئی تھی۔ اُس سے پچھلے مہینے "عمرہ" کر کے آئے تو اُس کے کارڈ ایسے بانٹے جیسے کوئی ریوڑیاں بانٹتا ہے۔ کسی نے نہ بھی جانا ہو تو مجبوری میں جانا پڑتا ہے کہ پھر ناراضگیاں اور گلے شکوے ہو جاتے ہیں۔

اب یہ جیب پر زبردستی ڈاکہ ہی ہوا نا"۔

فائزہ شہزاد کی مزاحیہ تحریروں میں بھی فن اور فکر کے ساتھ ساتھ سادگی، محبت، وفاداری، مسکراہٹ کا ملی امتزاج اور مزاح کی انواع و اقسام میں ان کی تحریروں کی ادبی، لسانی و فنی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہیں۔ ان کے مزاح میں شیرینی، حُسن، مٹھاس، تلخ و شیریں جذبے، پل پل واقعات و حالات کی کارستانی اور روزمرہ کے معاملات کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ اپنی ذات کو والدین کے چراغ کی طرح رگڑے تو کبھی مسائل کے بھنور سے طنز و مزاح کے پہلوؤں کو متور و تاباں کیے ہوئے ہے۔

ان کی تحریروں میں ماضی کی روایتیں، رسم و رواج، زندگی اور کھانے پینے کے انداز، مہمانوں کی قدر و منزلت اور ہر رویے میں ماضی کی عزت و تکریم طنز و مزاح کے فریم میں جُڑی ہوئی ملتی ہے۔ ماضی کی قدرتی، فطرتی اور نفسِ انسانی کی حقیقی محبتیں، خلوص اور تھک و دو کا ذکر یوں کرتی ہیں کہ پچھلے زمانے میں نہ صرف انسانوں کی بڑی عزت کی جاتی تھی بلکہ حتیٰ کہ "مُرغا" اور مُرغی کو بھی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اپنے مضمون "مُرغی یا مُرغا" میں یوں رقم طراز ہیں:

"ایک زمانہ تھا کہ "نسلِ مرغان" کی ہر طرف بڑی عزت و تکریم تھی (آج کے دور کی طرح نہیں کہ ہر گلی، محلے ہر چھوٹے بڑے ہوٹل اور ڈھابے پر بے چارے مُرغ بغیر لباس کے لٹکے نظر آتے ہیں ذرا جو کوئی عزت ہو) شاید ہمارے بزرگ اُسے وضو کر کے ہی ہاتھ لگاتے تھے۔ بہت نایاب اور نادر تھے۔ یہ مُرغیاں اور مُرغے بڑے بڑے شیر اور شیرنیوں جیسے اُونچے قد اور دیسی نسل کے۔ جب نانی کے گھر جاتے تو صبح انڈا دینے کے بعد مُرغی کی جو آواز آتی تھی کانوں میں رس گھولتی تھی اور مُرغے کی صبح صبح بانگ ایسا جوش اور ولولہ پیدا کرتی تھی کہ دل چاہتا تھا فوراً لفٹ رائٹ شروع کر دیں"۔

ان کی تحریروں میں طنز و مزاح کے مختلف رنگ،

زندگی کے آہنگ، سماجی رویوں اور سماج کے ساتھ ذاتی وانسانی اور نفسیاتی جنگ جاری رہتی ہے۔ بعض تحریروں میں منفرد اور ندرت فن کی مہارت سے ایسے موقع محل اور مزاح کھینچا ہے کہ حیات انسانی کے مختلف کردار اور رویے آشکارہ ہو جاتے ہیں ان کے مزاح میں لفظیات کی لذت، برجستہ فقروں کی ادبی عظمت، مضمون اور عنوان کی حلاوت، فن کی مہارت، مزاحیہ عبارت، تخلیقی جسارت اور عہدِ حاضر کی نزاکت ان کی مزاحیہ تحریروں کو فن کے بام عروج پر پہنچاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ مزاح کے نرالے، ندرت اور دل موہ لینے والے تڑکوں سے تحریروں کو دلچسپ بناتی ہیں۔ ہلکے پھلکے مزاح میں خوب صورت، ادبی اور شوخ شرارت سے بھرپور اور برملا فقرے ان کی مزاح نگاری کو مزید تقویت بخشتی ہے۔ ان کی تحریر ''روپ بہروپ'' انھوں نے انسانی رشتے، ناطوں عادتوں رویوں اور انسانی نفسیات کا مزاح کے ساتھ احاطہ کیا ہے۔ اقتباس ملاحظہ کریں:

''ہمارے ماموں کے بیٹے احمر کا رشتہ جس کے ہاں بھی گیا وہاں سے کورا جواب ملا، کیونکہ ایک تو کریلا وہ بھی نیم چڑھا والی کہاوت شاید ان کے لیے ہی بنی تھی۔ خاندان میں سب والدین کا خیال تھا کہ جس نے اپنی بیٹی کو اندھے کنویں میں گرانا ہو وہ احمر کو اپنی بیٹی دے۔ ویسے تو ممانی بھی کچھ کم نہ تھی۔ بقول ماموں جان باقی مردوں کو تو ستر (70) حوریں ملیں گی مگر مجھے کوئی دو، چار زیادہ ہی ملیں گی۔ اس عورت (بیگم) کی وجہ سے ہی میں پچاس کی عمر میں اسی (80) کا نظر آتا ہوں''۔ بعض تحریروں میں انھوں نے اپنی ذات کو محور بنا کر کبھی ہنستی کھل کھلاتی ہیں تو کبھی روتی اور واویلا کرتی ہیں۔ کبھی زندگی اور شوخی سے بھرپور تو کبھی خاموشی اور چپ اختیار کر لیتی ہیں۔ اس طرح دوسروں کے لیے ہنسانے، رُلانے اور خاموش پیغام و پیام دے کر آئینہ دکھانے کا ہنر استعمال کرتی ہیں۔ ان کی مزاحیہ تحریریں ذہن، ذات، تخیل، سوچ، عقل و دانش، فنی وفکری پاکیزگی، مثبت نشوونمائی عنصر، سماجی وروایتی بصیرت اور اخلاقی شعور کی جیتی جاگتی دستاویز ہے۔

عام زندگی اور انسانی نفسیات اور رشتوں کا ذکر ان کی مزاحیہ تحریروں میں جا بجا ملتا ہے۔ زندگی کے حُسن، رنگینی اور شادی شدہ حضرات کے مسئلے مسائل اور روزمرہ کے معاملات کو بڑی خوب صورتی سے مزاح کے ذریعے آشکارہ کرتی ہیں۔ اپنی تحریر ''اشکوں کا سیلاب'' میں اس طرح لکھتی ہیں:

اُف منی کے ابا میں تو بھول گئی، چھوٹے کا دودھ ختم ہے۔ منی کے پیمپر لانے ہیں۔ اسد کے اسکول کے جوتے پھٹ گئے ہیں۔ مینا کی اُردو کاپی لانی ہے۔ چلیں اُٹھیں اُٹھیں، شاباش اور وہاں سے پھر واپسی پر مجھے وہی والے گول گپے کھلانے ہیں جو آپ روزانہ اماں کے بہانے مجھے دے کر جاتے تھے''۔

ان کی تحریروں میں ماضی کی یادیں، ماضی کی

زندگی کی تصویروں کے ساتھ حقیقی زندگی کی تصویریں، تجربات، مشاہدات اور جذبات کو احساس کی کسوٹی پر پرکھ کر زندگی کے سچ کو طنز و مزاح کے روپ میں پیش کرتی ہیں۔ ان کی تحریروں میں خواتین، ان کی زندگی، ان کے مسائل و مشکلات، روزمرہ کے معاملات و معمولات کو ایک حقیقی آئینے میں دکھاتی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی تحریروں میں جدید دور کی بعض چیزوں اور انسانی رویوں پر بھی طنز ملتا ہے۔ آج کے دور کے موبائل اور انسانی بے حسی کو اپنی تحریر ”زمانے کے انداز بدل گئے“ میں یوں بیان کرتی ہیں:

”پھر اکیسویں صدی کیا آئی کہ سب کچھ ہی بدل گیا اور جدید ٹیکنالوجی کی بدولت محبوب آپ کے قدموں میں ہو گیا۔ جی ہاں موبائل نے خوش قسمتی کے سب در کھول دیے۔ اب نہ ابا کا ڈر، نہ اماں کا خوف، نہ ہی دن، دو پہر رات کا انتظار۔ بس یہ جیب سے موبائل نکالا اور شروع۔ پل پل کی خبر کہاں جا رہے ہو؟ کب آ رہے ہو؟ کوئی دیکھے نہ دیکھے منگیتر تو دیکھے گا/گی۔ اُنھوں نے ثابت کر دیا ہے کہ خواتین بھی بہترین مزاح لکھ سکتی ہیں۔ ان کا مزاح معنوی اثر آفرینی کے ادبی لوازمات سے بھرپور استفادہ کرتا ہے۔ مسائل، محرومیوں، غربت، تنگ دستی اور نامساعد حالات سے مزاح پیدا کرنا اور اس میں پُر مسرت اور پُرسکون حالات کا مثبت آئینہ اور اُمید دکھانا ان کی تحریروں کو جلا بخشتی ہے۔ ان کی تحریریں مزاح برائے اصلاح اور ادب برائے اصلاح سے مزین ہیں جس سے انسان کو مزاح بھی ملتا ہے اور سیکھنے، زندگی بسر کرنے کے جامع اور مثبت پہلو بھی ملتے ہیں۔ اس طرح اُنھوں نے مزاح، مزاح میں آج کل موبائل پر لوگوں کے ”اسٹیٹس لگانے“ کا بیان مزاحیہ انداز میں کیا ہے۔ اپنے ایک مضمون ”اسٹیٹس“ میں یوں لکھتی ہیں:

”جب موبائل سکرین پیج سسٹم کلک کیا تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں وہاں تو اسٹیٹس کا ایک الگ ہی جہان آباد تھا۔ سب سے پہلے نام اپنی کام کرنے والی ماسی کا اور اس کا اسٹیٹس پڑھ کر ایسا لگا کہ نوبل انعام یافتہ کیمیادان تو یہی ہے۔ اتنے میں دوسرے نام کو دیکھا تو بچوں کے قاری صاحب نے گویا ساری دھرتی کو ہی ہلا کر رکھ دیا تھا اور سوائے ان کے باقی سب جہنم رسید ہو چکے تھے۔ جنت کا ٹکٹ صرف ان کے پاس تھا“۔

الغرض ڈاکٹر فائزہ شہزاد کا مزاح سے بھرپور مجموعہ ”بولوں کہ نہ بولوں، خیبر پختونخوا کے اَدبی منظر نامے میں طنز و مزاح کی دھنک اَدبی حلقوں کے لیے قوسِ قزاح کی چمک، معاشرے کے بگاڑ، ناہمواریوں، نااہل سماجی رویوں کے لیے نمک اور مزاح کے زمرے میں خواتین کے لیے مثبت دستک کی حیثیت رکھتا ہے۔ مصنفہ مزاح کے مختلف پہلوؤں کو ماضی اور حال کا تقابلی مشاہدہ اور تجزیہ کر کے ازحد برداشت پر ثابت قدم لیکن دل و دماغ میں گدگداہٹ بھی جاری و ساری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قلم گوئی سے کام لے کر ازحد خود گویا ہیں کہ ”بولوں کہ نہ بولوں“۔

☆☆☆☆☆

"گنجے، آدھے گنجے اور مزید گنجے" (طنز و مزاح)

انسانی سر کا بالوں سے خالی حصہ ہی آئندہ زندگی میں اس کی مالی و اقتصادی حالات کا تعین کرتا ہے---!!!
ہم توہمات پر ایمان نہیں رکھتے مگر یقین کریں کہ اس پیشگوئی نے ہمیں بھی چکرا کر رکھ دیا تھا اسے سننے کے بعد اول تو ہم حیرت کے سمندر میں ڈوب گئے اور جب تعجب کی اتھاہ گہرائیوں سے کسی طور نکل آئے تو اپنے پورے سر پر احتیاط سے ہاتھ پھیر کر یہ تسلی کرنے کی کوشش کی کہ ہمارے سر کا وہ کون سا حصہ ہے جہاں بال جھڑنے کے امکانات زیادہ ہیں اور جو نقش اول کے طور پر پہلے بالوں سے خالی ہو کر ٹنڈ میں تبدیل ہو سکتا ہے ظاہر ہے اس عملی تجربے سے ہمارا مقصد اپنی خوش نصیبی یا سیاہ بختی کا قبل از وقت تعین ہی تھا تا کہ بروقت خوش فہمی یا خام خیالی میں مبتلا ہو کر اپنی فکر و پریشانی میں مناسب حد تک اضافہ کر سکیں؛ مگر ہمارا مشاہدہ کچھ زیادہ اطمینان بخش ثابت نہیں ہوا کیونکہ عمر عزیز کے چالیس برس پورے ہونے کے باوجود ابھی ماشاء اللہ ہمارے پورے سر پہ گھنے بال موجود تھے اور فی الوقت یہ اندازہ لگانا بہت مشکل تھا کہ یہ گھنے بال آخر کس طرف سے جھڑنا شروع ہوں گے

پیشگوئی سن لیجئے؛ کہنے والوں کا کہنا ہے کہ وہ لوگ جن کے سر کے بال نقطہ آغاز یعنی ماتھے کی طرف سے گر جائیں اور پیشانی و سر کے درمیان قائم قدرتی حد فاصل مٹ کر دونوں حصے ایک ہو چکے ہوں تو وہ آنے والے وقتوں میں انتہائی مالدار ثابت ہوں گے اور عنقریب ان کے پاس دھن دولت ہاتھ باندھ کر دوڑتی ہوئی چلی آئے گی پیشگوئی میں مزید کہا گیا کہ ایسے افراد جن کے سر کے سامنے والے حصے تو پیشانی تک بالوں سے ڈھکے ہوئے ہوں مگر درمیانی کھوپڑی بالوں سے خالی ہو کر سر کے بیچوں بیچ کرکٹ گراؤنڈ قسم کا گول میدان معرض وجود میں آ چکا ہو، عموماً بدقسمت اور بے مراد ہی ثابت ہوتے ہیں، سو ان لوگوں کی ساری زندگی مالی لحاظ سے پریشانیوں اور مایوسیوں کی نذر ہو جاتی ہے (یہاں البتہ پیشگوئی یہ بتانے سے قاصر رہی ہے کہ جن صاحبان کے پورے سر ہی بالوں سے خالی ہوں اور ایک بھی بال نہ اگا ہو ان کا مستقبل کیا ہوگا اور وہ بھلا کون سے زمرے میں

نور کمال شاہ

حساب ہوں گے)

پتہ نہیں کس ستم ظریف نے گیسوانہ رقابت کے سبب سے اور یا گنجوں اور آدھے گنجوں سے اپنی فطری دشمنی کی بنیاد پر یہ بے سروپا مفروضہ گھڑا ہے۔ جانے یہ مفروضہ ان کے پاس آیا کہاں سے اور اس نظریے کا ماخذ کیا تھا کچھ اندازہ نہ ہوسکا

کہتے ہیں تصورات اور توہمات بچپن ہی سے ہمارے معصوم ذہن میں تخلیق پاتے ہیں جو آگے چل کر زندگی کو ہمارے لئے مشکل تر اور پیچیدہ بنانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں جہاں تک ہماری ذات کا تعلق ہے تو یہ اندازہ ہماری حد تک تو سوفی صد درست ہی ثابت ہوا ہے خاندان کے بڑے بوڑھوں نے بچپن سے ہماری حیاتی کے آغاز ہی میں نار، ناری، ناگ اور نمونیہ سے ڈرانے کے علاوہ ہمارے معصوم ذہن میں جنوں، بھوت پریت اور چڑیلوں کا خوف اس قدر کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا کہ پھر ہم ڈر کے مارے عمر بھر کبھی سنبھل ہی نہیں پائے سو ہم ان مہربانیوں کو ان بزرگوں ہی کی عطا سمجھتے ہیں البتہ گنج پن کا خوف خود ہمارے اپنے تجربے اور ذاتی مشاہدے ہی کی پیداوار ہے خدا بخشے دادا جان مرحوم کو جانے کہاں سے یہ کشف ہوا تھا کہ سر مونڈوانے سے بالکل تازہ تازہ نئے بال اگنا شروع ہوجاتے ہیں جن کا ذہن کے ساتھ ساتھ انسانی دل و دماغ پر بھی نہایت مثبت اثر پڑتا ہے اور پورا انسانی وجود ایک عجیب طرح کی تازگی و توانائی محسوس کرنے لگتا ہے چنانچہ اسی تازگی کے حصول کے لیے ہمیں بار بار اس تلخ عمل سے گذارا گیا بال ابھی انچ بھر ابھرے نہیں کہ فوراً ہی محلے کے نائی کو بلوا کر استرا پھروا دیا ہم روتے اور چیختے چلاتے رہتے مگر جانے کیسے ظالم لوگ تھے، کسی کے دل میں بھی ہمارے لیے رحم کے جذبات کبھی پیدا ہی نہ ہو پائے---

نتیجتاً ہماری فریاد فقط اس شاعرانہ درد تک ہی محدود ہو کر رہ گئی----

آج ہم دار پہ کھینچے گئے جن باتوں پر
کیا خبر کل وہ زمانے کو نصابوں میں ملیں

....

ہاں البتہ اتنا ضرور ہوا کہ اس بے رحمانہ اور غیر انسانی سلوک کے بدلے حجام لوگ قدرتی طور پہ شروع ہی سے ہماری نفرت کے سزاوار ٹھہرے ہیں اور یہ دشمنی ہنوز جاری ہے----

اپنے ہی گھر کے بزرگوں اور محلے کے حجام کی ملی بھگت سے برپا اس ظلم اور خدا ناترسی کا نتیجہ یہ نکلتا کہ ٹنڈ کروانے کے بعد ہم کئی کئی دن کسی کو منہ دکھانے کے قابل ہی نہ رہتے بلکہ ہفتوں تک گھر والوں، دوستوں اور بہی خواہوں سے منہ اور سر دونوں ہی چھپاتے پھرتے کیونکہ ان لوگوں کی مکروہ ہنسی اور مضحکہ خیز قہقہے ہم سے کبھی برداشت ہی نہ ہو پاتے اس کے علاوہ چھوٹوں اور ہم عمروں

کے ساتھ ساتھ بڑے بھی تفنن طبع کی خاطر اکثر ہمارے گنجے سر پہ چپت مار مار کے ہمیں درد سے بے حال کر دیا کرتے تھے (شاید ان دنوں نئے ٹنڈ پر چپت مارنا بھی تازہ بالوں کے اگنے کے لیے ضروری خیال کیا جاتا ہو تبھی تو ہر کوئی اس کار خیر میں حصہ ڈالنا ضروری بھی سمجھتا تھا)

قارئین کرام! گنجوں میں کچھ تو بات ہو گی کہ جناب منٹو نے ''گنجے فرشتے'' اور محترم عطاء الحق قاسمی صاحب نے اس کے بعد ''مزید گنجے فرشتے'' جیسی تخلیقات لکھ کر نہ صرف اس مظلوم جنس کی جانب لوگوں کی توجہ مبذول کرائی بلکہ ان کے تجسس کو مہمیز بھی کر دیا۔

ہمارے ذاتی علم اور مشاہدے کے مطابق دنیا میں گنجوں کی عموماً دو قسمیں پائی جاتی ہیں؛ ممکن ہے تیسری قسم بھی ہو مگر ہو بھی تو وہ یقیناً کمیاب ہی ہو گی اولاً پیدائشی گنجے جن کو ہم فطری یا قدرتی گنجے کہہ سکتے ہیں یہ لوگ روز اول سے ہی بالوں کی نعمت سے محروم اور زلفوں کی جھنجھٹ سے آزاد ہوتے ہیں اصل میں ان افراد کا سر کبھی بالوں کے زیر احسان ہی نہیں رہتا یہ لوگ ہمیشہ اوروں کے گھنے بالوں کا تصور کر کے سرد آہیں بھرتے اور خود کو آئینے میں دیکھ دیکھ کر دوسروں کو کوستے رہتے ہیں ثانیاً وہ گنجے جو اپنی پیدائش کے وقت ہی سے بالوں سے محروم تو نہیں ہوتے مگر آگے زندگی میں کسی کٹھن مرحلے یا مشکل مقام پر اس بے بہا دولت سے محروم ہو جاتے ہیں ان گنجوں کی افزائش میں ہمارے کہنہ مشق حکیموں اور جلد کے ماہر ڈاکٹروں کا بھی بڑا ہاتھ ہوتا ہے یہ پیشہ ورانہ اوصاف سے متصف طبقے اپنے داؤں اور دواؤں کی مدد سے ایک معینہ مدت کے اندر ہی انہیں رہے سہے بالوں سے بھی محروم کر دیتے ہیں۔

کہتے ہیں اپنے حفیظ جالندھری صاحب بالوں کے لحاظ سے بالکل ہی فارغ البال تھے ایک دفعہ ایک عقیدت مند نے ازراہ ہمدردی ان سے پوچھ ہی لیا ''حفیظ صاحب! سر پہ بال نہ ہونے سے کوئی تکلیف تو نہیں ہوتی؟'' آرام سے بولے، ''تکلیف کیا ہونی ہے بھلا؛ البتہ وضو کرتے وقت یہ پتہ چلانا مشکل ہوتا ہے کہ منہ کہاں تک دھونا ہے اور سر کی مسح کہاں سے شروع کرنی ہے''

جہاں تک ہمارے علم اور مشاہدے کا تعلق ہے تو ہم نے آج تک کسی گنجے کو حسین اور جی دار نہیں دیکھا یہی وجہ ہے کہ کوئی گنجا آج تک کسی کہانی یا فلم کا ہیرو نہ بن سکا ایک زمانہ تھا جب ہماری فلموں کے ولن گنجے ہوا کرتے تھے اور ہمارے فلم ساز اگر کسی جانے مانے خوبرو ولن کو زیادہ بے رحم اور سنگدل ثابت کرنے پر تل جاتے تو وہ اسے باقاعدہ گنجا کر کے پیش کرتے تھے کیونکہ ''گنجا ولن'' گھنگریالے بالوں والے ولن

کے مقابلے میں زیادہ خوفناک اور خونخوار دکھائی دیتا ہے مگر مشکل یہ تھی کہ اکثر اوقات ولن اپنے بال کاٹنے پہ آمادہ ہی نہ ہوتے سو ولن کو راضی کرنے کے لیے ڈھیر ساری ناز برداریاں کرنے کے ساتھ ساتھ انھیں اکثر دو چند معاوضہ بھی ادا کرنا پڑتا تھا مایہ ناز ولن شفقت چیمہ اور اسی طرح کے کئی دوسرے ولن بہت دفعہ فلم سازوں کی اسی سازش کا شکار ہو کر "گنجے ولن" بنے ناظرین کے سامنے آئے اسی طرح بعض اوقات مضحکہ خیزی اور مزاح میں اصلیت کا رنگ پیدا کرنے کے لیے فلم میں کامیڈین کو بھی بالوں کی قربانی دے کر گنجا بننا پڑتا تھا اس اقدام کے پیچھے یہ فلسفہ کارفرما رہتا تھا کہ ناظرین کو اگر اداکاری سے نہ ہنسایا جاسکا تو انھیں کامیڈین کی مضحکہ خیز گنجی صورت دکھا کر بآسانی ہنسایا جاسکتا ہے اداکار سعید خان عرف رنگیلا (مرحوم) کی ہمت و حوصلے کی داد دینی چاہیے کہ انھیں کئی فلموں میں اسی قسم کے تلخ تجربوں سے گزارا گیا مگر اس بے چارے نے کبھی اف تک نہ کی ہمیں پکا یقین ہے کہ ننھا، لہری اور منور ظریف (مرحوم) بھی ضرور ایسی صورت حال سے بارہا دوچار ہوئے ہوں گے۔

جہاں تک ہم نے دیکھا ہے تو گنج پن فقط مردوں ہی کے لیے مخصوص ایک سزا ہے اور ان ہی کے ساتھ جچتا بھی ہے؛ ہم نے آج تک کوئی گنجی خاتون یا بالوں سے عاری محبوبہ نہیں دیکھی غالب گمان ہے کہ لڑکیوں کو بچپن میں کبھی ٹنڈ کروانے کے تلخ تجربے سے گزرنا بھی نہ پڑا ہوگا گنج پن کو رحمت سمجھنے والوں کو نوید ہو کہ ہم بے وقت گنجے ہونے کو زحمت اور کڑی سزا سمجھتے ہیں اور یہ فقط ہمارا نظریہ نہیں بلکہ ایک روشن حقیقت بھی ہے کہ ہمارے ہاں اس عمل کو باقاعدہ بطور سزا استعمال کیا جاتا رہا ہے "شوہر نے غصے میں آکر بیوی کے بال ہی کاٹ ڈالے" اور "شہریوں نے چور کو پکڑ کر اس کی ٹنڈ کروادی" جیسی خبریں ہمارے ہاں سننے کو عام ملتی ہیں کل ہی کے اخبار کی ایک ذیلی سرخی ہی ملاحظہ فرمائیے گا جس میں لکھا ہے کہ عین شادی والے دن جہیز میں موٹر سائیکل طلب کرنے والے دولھے کو لڑکی والوں نے استرا پھروا کر گنجا کرکے بارات سمیت واپس بھجوا دیا۔

اب آئیں ذرا گنج پن سے متعلق محترم شفیق الرحمٰن صاحب کی ایک دلچسپ تحقیق ملاحظہ کرتے ہیں جنھوں نے انتہائی عرق ریزی سے موضوع کو ایک بالکل ہی مختلف اور عجیب شکل میں پیش کیا ہے وہ لکھتے ہیں گنج پن دراصل ایک قوت کا نام ہے جو سو میں سے فقط تین افراد کے پاس ہی ہوتی ہے دراصل گنجے لوگوں کے بال ظاہری شکل تبدیل کرکے ایسی صورت اختیار کرلیتے ہیں جنھیں سمجھنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہوتا اور نہ ہی ہمارے حواس خمسہ انھیں محسوس کر

سکتے ہیں ممکن ہے مستقبل میں کوئی ایسی مشین ایجاد کرلی جائے جو اس انوکھی طاقت کو جانچ سکے وہ مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں: اب تک کے سروے کے مطابق زیادہ تر گنجے لوگوں میں اس طاقت نے ان کے سوچنے سمجھنے کی طاقت کو کمال درجہ تک بڑھا دیا ہے: مثلاً مشہور گنجے لوگوں میں شیکسپیئر، گیلیلیو، ڈالٹن اور ڈارون شامل ہیں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فیثا غورث جنھوں نے ریاضی کے بنیادی کلیے اور قوانین بنائے تھے وہ بھی گنجے ہی تھے۔

عتیق الرحمٰن صاحب کے تجزیے کے مطابق اس وقت دنیا میں ذہین ترین لوگوں میں سے 95 فیصد گنجے ہیں ان میں سے 90 فیصد قدرتی طور پر موجود ہیں جبکہ 5 فیصد خود سر منڈوا کر گنجے بن جاتے ہیں تاکہ وہ اس پراسرار طاقت کے مالک بن سکیں اور شاید وہ اسے حاصل بھی کر لیتے ہیں۔

گنج پن کی مزید وضاحت کرتے ہوئے وہ آگے لکھتے ہیں: انسان دو طرح سے گنجا ہو سکتا ہے ایک ظاہری اور دوسرا روحانی زیادہ ذہین انسان وہی ہوتا ہے جو ظاہری کے ساتھ ساتھ روحانی طور پر بھی گنجا ہو اگر ایک آدمی گنجا ہے مگر روحانی طور پر اُسے قبول نہیں کرتا تو وہ اس پراسرار طاقت کا مالک نہیں بن سکتا جو گنج پن کی وجہ سے اسے ملنی چاہیئے تھی چنانچہ ایسے لوگ گنج پن سے نجات کے طریقے ڈھونڈتے ہیں یا پھر مصنوعی طریقے سے اس حالت کو ختم کروا کر اس طاقت سے محروم رہ جاتے ہیں جو مستقبل میں ان کی کامیابی میں بے حد مددگار ثابت ہو سکتی تھی۔

یہ تو رہا تحقیق کا معاملہ؛ اس بات سے قطع نظر کہ اس تحقیق میں کتنی صداقت ہے، مثبت پہلو یہ ہے کہ اس تحقیق نے گنج پن کی بھیانک شبیہہ کو ہمارے سامنے دھندلا کر قابل قبول صورت میں پیش کر دیا ہے اور رپورٹ پڑھنے والے اب اطمینان سے اپنی گنج پن کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزار سکتے ہیں؛ خدا کرے ایسا ہی ہو-----

دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے!!!

ہاں اس سلسلے میں ہمارا مخلصانہ مشورہ یہی ہے کہ قدرتی ”گنجے“ بے شک اس رپورٹ کو نعمت مترقبہ سمجھ کے بغلیں بجائیں مگر ”گنج پن“ سے محروم لوگ روحانی قوت کے حصول کے لیے اگر کبھی ”گنجے“ بننا چاہیں بھی تو سوچ سمجھ کے ہی بنیں کہ کہیں حال شیریں زادہ خدوخیل صاحب کے افسانے کے ان ”دم کٹے“ بندروں جیسا نہ ہو جائے جنھوں نے مہذب بننے کی دھن میں خود اپنے ہی ہاتھوں اپنے ”دم“ کاٹ کر پھینک دیئے تھے--------

☆☆☆☆☆

ڈھانچہ خوشبو کا

صدیوں کی تاریک تہوں نے
اگل دیا،
اک لاکھوں سال پرانا ڈھانچہ
اس ڈھانچے پر کچھ نہ رہا تھا
آج بھی لیکن زیب گلو تھا
گھوڑے کے بالوں سے بٹی، رسی کا پھندا
یہ مجرم تھا؟ یا عاشق تھا؟ یا شاعر تھا؟
مجرم ڈھانچے،
صدیوں کی تاریک تہوں میں،
اپنے جرم چھپائے پڑے رہتے ہیں
ظالم، اپنے ظلم کی ممی بنے پڑے رہتے ہیں
عاشق ڈھانچے،
اپنی گرد میں گم رہتے ہیں
لیکن شاعر،
اپنے جرم عشق کو، مشک بنا دیتے ہیں
صدیوں کی تاریک تہیں،
یہ خوشبو دفن نہیں رکھ پاتیں
صدیوں کی تاریک تہوں نے اُگل دیا،
اک لاکھوں سال پرانا ڈھانچہ
ڈھانچہ خوشبو کا

خالد احمد

یہ زمانہ اُحد کے بعد کا ہے

شہر پر
سانحہ گزرنے سے
جو دراڑیں
دلوں کے بیچ پڑیں
اُن کے بھرنے میں کیا خبر
کتنا
درد جگنا تھا،
وقت لگنا تھا
لیکن
احساں غنیمِ ارذل کا
اُس کے
جنگی جنون سے کیسے
چھٹ گیا
پل میں نفرتوں کا غبار
ہوئے سب مل کے آہنی دیوار
سُن!
کسی گوشۂ غیابت سے
آ رہی ہے
اک آشنا آواز
کوئی سرگوشیوں میں
کہتا ہے
پڑھ!
جو قرطاسِ وقت پر ہم نے
بھید بین السطور لکھا ہے
شب کہاں تھی
سقوطِ ڈھاکہ کی
وہ شکستِ انا کا موسم تھا
دیکھ!
درماں سیاہ یاد کا ہے
یہ زمانہ
اُحد کے بعد کا ہے

جلیل عالی

"ہم میں سے ایک" (نثری نظم)

'روایت اور انفرادی ذہانت'

'معروضی تعلق' ......

انتہا، ابتدا، درمیان

تسلسل زمانی سے لاتعلق

مہذب تاریخ سے قبل یا مابعد

عُشاق کا ایک طویل قافلہ

جاں سے بیزار .... مگر جاں نثار

شکوہ صرف اُس سے

جو اچھوں میں سے ہے، اور اک احساس

جو نا موجود، نا معلوم اور شاید

(اب یاد آیا!)

نامُختتم بھی ہے!

سید افسر ساجد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خواب میں خواب کی تعبیر بتا دے مجھ کو
اے مرے آج! مرے کل کا پتا دے مجھ کو

قومی نغمہ

مل جل کر تعمیر کریں ہم آؤ ایسا پاکستان
جس کا ہر اک باشندہ ہو چلتا پھرتا پاکستان
چلتا پھرتا پاکستان

تب تک ہم کو دشمن سے کچھ خطرہ ہو ہی نہیں سکتا
کوئی ہماری راہ میں ہرگز کانٹے بو ہی نہیں سکتا
جب تک اپنے دل میں ہے بس ایک ہی جذبہ، پاکستان !
چلتا پھرتا پاکستان

ہم سب اس کے نام سے زندہ، پائندہ اس کے دم سے
ہم سب کی پہچان ہے اس کے سبز ہلالی پرچم سے
اس کا پرچم اپنا پرچم، چاند ستارہ پاکستان
چلتا پھرتا پاکستان

آنکھوں میں ہر دم رہتا ہے ہر منظر اس کا
اے مالک، تو قائم رکھیو ہر اِک بام و در اس کا
اپنی دولت پاکستان ہے، اپنی دنیا پاکستان
چلتا پھرتا پاکستان

اک دن سب کے خوابوں کی تعبیر بنے گا پاکستان
ان شاء اللہ جلد ہی اب کشمیر بنے گا پاکستان
ہم سب کا یہ پاکستان ہے کتنا پیارا پاکستان
چلتا پھرتا پاکستان

نسیم سحر

قائداعظم کے لیے

مخالفت کی فضا میں اپنائیت کا جوہر دکھا کے چھوڑا
ہوا تھی گو تند و تیز لیکن چراغ تُو نے جلا کے چھوڑا

تری نگاہوں کی ساحری سے کہاں کوئی بچ کے جا سکا ہے
جسے بھی اک بار تو نے دیکھا اسیر اپنا بنا کے چھوڑا

تجھے یہ دھن تھی کہ ساتھ تیرے طلوعِ صبحِ جمال دیکھیں
دیارِ شب کے مسافروں کو سحر سے پہلے جگا کے چھوڑا

سماعتوں کے درِ مقفل کھلے ترے اسم کے اثر سے
مغائرت کا طلسم توڑا پیامِ دل کا سنا کے چھوڑا

اداسیوں کی گرفت میں تھی حیات جب تیری آگہی نے
ہجومِ رنج و ملال میں بھی خوشی کا پرچم اڑا کے چھوڑا

بدن ترا یوں تو ناتواں تھا مگر ترا عزم سخت جاں تھا
ہوا جو کوہِ گراں مقابل رہِ سفر سے ہٹا کے چھوڑا

کمال تھی ناخدائی تیری کہ عین طوفان کے دنوں میں
ترا سفینہ کہ تھا شکستہ اسے کنارے پہ لا کے چھوڑا

فروغِ سرو و سمن کی خاطر نمو کا ماحول چاہیے تھا
تری بہار آفرینیوں نے نیا گلستاں لگا کے چھوڑا

گلزار بخاری

پرندہ آج تنہا ہے

یہ دُور تک پھیلی سفیدی
ایک بوسیدہ سی چادر کی طرح
اور رقص کرتے یہ فضا میں برف کے گالے
کسی اُجڑی ہوئی ڈالی میں سمٹی اک چمک
تنہائی کی صورت
پروں میں
بھیگتے پتّوں کی سُرخی میں مچلتی اک چمک
موسم کی شدت سے الجھتی ہے
پرندہ آج تنہا ہے
کوئی ساتھی نہیں
بس عزم ہے، اک آگ کی صورت دہکتا عزم
یا پھر گیت ہے بچھڑے ہوؤں کے نام
جو ٹھنڈی ہوا کے دوش پر
اک آرزو کی دُھن پہ اُڑتا ہے
بنفشی خواب جو سرما کے گہرے سُرمئی
منظر میں کِھلتا ہے
جہاں خاموش ہے
لیکن کوئی تو ہے جو سرگوشی میں کہتا ہے
کہ سارے رنگ اک دن لوٹ آئیں گے
سفیدی چاندنی بن کر فلک پر جا بسے گی
اک صدا سارے میں گونجے گی
دلوں میں آس کی چنگاریاں روشن تھیں
روشن ہیں۔

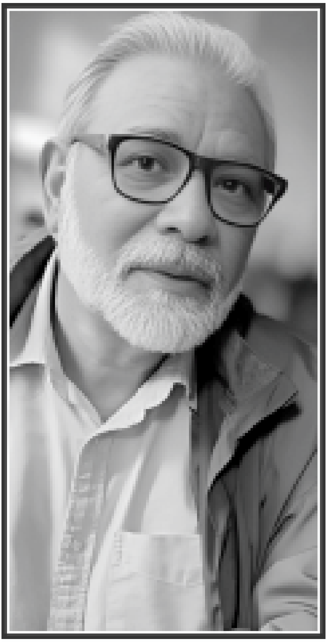

حامد یزدانی

ایک (مرحوم) دوست کے لیے

تری دوستی معتبر تھی مجھے
مگر کس قدر مختصر تھی مجھے

تری گرم جوشی پئے زندگی
خلوص و محبت کا گھر تھی مجھے

تری جستجو، تیری فکرِ سخن
نویدِ کمالِ ہنر تھی مجھے

تری گفت گو سے بھری انجمن
سخن زار کی رہ گزر تھی مجھے

پریشاں خیالی میں جو گم ہوئی
وہ سطرِ سخن نامہ بر تھی مجھے

فصیلِ عدم کی جو رونق بنی
وہ تصویرِ نقشِ دگر تھی مجھے

وہی شاخ کاٹی ہے تقدیر نے
کہ جو شاخ برگ و ثمر تھی مجھے

تجھے ڈھونڈتے ڈھونڈتے کھو گئی
وہی آنکھ جو راہبر تھی مجھے

شبِ تار کاٹوں گا اب کس طرح
وہ لو بجھ گئی جو سحر تھی مجھے

اُسے اب تلاشوں کہاں، کس نگر
وہ صورت جو قلب و جگر تھی مجھے

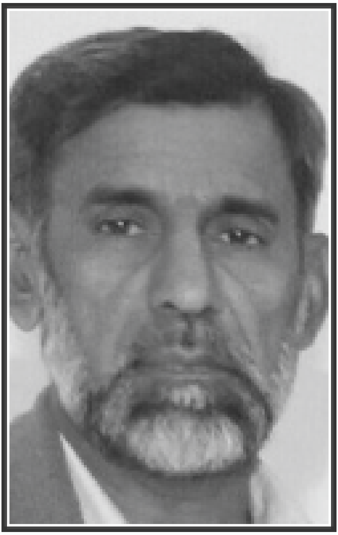

خورشید ربانی

بابِ خطا

وہی بابِ خطا ہے اور وہی آنکھیں
کسی بے کیف موسم سے شناسائی میں گم آنکھیں
بھلا سا خواب دیکھیں بھی تو کیا ہوگا
بس اک بابِ خطا ہی اُن پہ وا ہوگا

مگر یہ آئینہ ساماں آنکھیں
وحشتِ بے مہر کی تجسیم کرتی ہیں
ابد کے آئینہ خانے میں رقصاں خواہشیں
دستِ دعا سے خواب بُنتی ہیں

وہ پہلے بھی اسی بابِ خطا سے ہی گزر کر
اس طرف آئیں
سراسیمہ، پشیماں،
رائیگاں جذبوں کی بے کیفی میں حیرانی سے تکتی
بے یقیں آنکھیں
ہزاروں منظروں کی دلکشا رنگینیوں سے
خواب بُنتی تھیں
وہ آنکھیں خواب بُنتی تھیں
دھنک سے رنگ لیکر، چاند سے اسرار
لے کر، پھول سے خوشبو،
ہوا جیسے کسی ٹیلے پہ کچھ شکلیں بناتی ہو
کوئی بادل کا ٹکڑا نیم عریاں پیکروں
میں ڈھلتا جاتا ہو
کوئی بچہ لبِ ساحل گھروندہ اک بناتا
ہو

وہی بے کیف موسم ہے اور اب تک ہے
وہی بابِ خطا ہے اور وہی آنکھیں
وہی دستِ تہی ہے اور وہی حیرت!!

فیاض تحسین

رواں زمانے کی پُشت سے......

رواں زمانے کی پُشت سے،
اِک نیا زمانہ نکل رہا ہے
مِرا بڑھاپا،
نژادِ نو کی جوانیوں میں بدل رہا ہے

وہ ننھا بچّہ،
جو کل تلک میرا ہاتھ تھامے،
قدم قدم چلتا، گرتا، اُٹھتا،
کبھی کبھی کھلکھلا کے ہنستا،
کبھی اچانک ہی رونے لگتا
کبھی کھلونوں سے دیر تک کھیلتا، بہلتا،
کشادہ آنگن میں دانہ چُگتے کبوتروں کو
اُڑانے لگتا،
کبھی وہ بلّی سے ڈرتا
بکری کے میمنوں کو بھگانے لگتا

وہ کل کا بچّہ،
وہ آج کا اِک جوان رعنا
سُفید وردی، سُفید بُوٹوں،
سُفید بُراق کیپ میں میرے سامنے ہے
مری نظر اُس کے شولڈر پہ لگے نئے رینک
پہ جمی ہے

میں اُس کے سینے پہ، دائیں جانب،
سجیلے تمغوں کی پٹیوں کو کمال حیرت سے تک
رہا ہوں

وہ کل کا بچّہ،
جو کل تلک میرا ہاتھ تھامے،
حیاتِ فردا کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا،

کئی زمانوں کے بعد،
میں اُس کا ہاتھ تھامے،
حیاتِ فردا کی سیڑھیوں سے اُتر رہا ہوں
نئے زمانے کی جنّتوں سے گزر رہا ہوں

محمد انیس انصاری

[اپنے پیارے بیٹے کیپٹن فہد ابوذر (پاکستان نیوی) کی پروموشن تقریب کے موقع پر۔ یکم جولائی 2026]

یاس کے اُگتے پھول

شہر کے آخری درخت سے
اُجالے کی آخری چڑیا کب کی ہجرت کر چکی ہے
اب گلیوں میں پھول اُگتے ہیں
ایسے پھول جن کی پنکھڑیوں پر
کم سن بچوں کی بھوک شبنم بن کر جم گئی ہے
زمیں کی کوکھ سے فصل نہیں! انتظار اُگتا ہے
چولہوں کی راکھ سے ہر شام ایک سیاہ تتلی جنم لیتی ہے
جو گھروں کی چھتوں پر بیٹھ کر روٹی کا نوحہ پڑھتی ہے
دُھوپ کے کندھوں پر افلاس کی چادر ہے
اور ہوا کے ہاتھوں میں پیاس سے نڈھال پیالے
ندی کے کنارے ایک بوڑھا برگد
اپنی جڑوں میں بھوک چھپائے کھڑا ہے
اور اُس کے سائے میں کوئی مسافر پڑاؤ نہیں کرتا
ظلم اب تلوار نہیں اُٹھاتا
ظلم اب ریشم کے دستانے پہن کر مسکراتا ہے
رات کے ماتھے پر درد کا ایک چراغ جلتا ہے
جس کی لو میں مائیں بچوں کے چہروں پر
کل کی اُمید تلاشتی ہیں
مگر صبح کی پیشانی پر سورج نہیں اُگتا
صرف ایک بھیانک دھواں پھیلتا ہے
اور دھوئیں کی اوٹ سے
یاس کے پھول اُگتے ہیں

طلعت شبیر

[اخ تھو]

ہم نے چناؤ کو ہی دیوار میں چن ڈالا ہے
سب کے سامنے ہر معیار کو
ہر پڑتال کو
ہر سچائی کو
کاٹ کے
اس کی ننگی لاش کو چوراہے پر ٹانگ دیا ہے
جو تم نے کرنا ہے کر لو۔
ایوانوں میں
عدالتوں میں
اور ٹی وی پر
مالک کی ڈگڈگی پہ ناچنے والے ڈٹ کر بیٹھ گئے ہیں
ہم کس منہ سے اب بچوں کو
حق کی، سچ کی
سیدھے رستے کی، انصاف کی
کوئی بات سکھائیں گے
سارے سوال جواب، جمع تفریق
حوالے منطق استدلال
کسی نے پیر کے نیچے کچل دیئے ہیں

آسمان سے بندوقوں کی نالیاں نیچے لٹک رہی ہیں
جو اٹھتا ہے اس کے سر سے ٹکراتی ہیں

پیداوار نگلنے والے
اپنی پرائی روش کو چھوڑ کے
ساری زمین لپیٹ کے جیب میں ٹھونس رہے ہیں
بیوپاری ہیں
جو کچھ بچا کھچا ہے اس سے
اچھا اچھا چھانٹ رہے ہیں
اور آپس میں بانٹ رہے ہیں
بولنے والی سبھی زبانیں کاٹ چکے ہیں
توڑ مروڑ رہے ہیں بازو
اور شلواریں کھول رہے ہیں

میں کچھ پوسٹ نہیں کر سکتا
کھل کر بات نہیں کہہ سکتا
میں بندوق نہیں رکھ سکتا
لیکن تھوک تو سکتا ہوں!

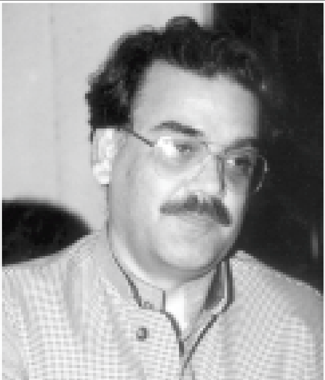

شاہنواز زیدی

بنامِ وطن

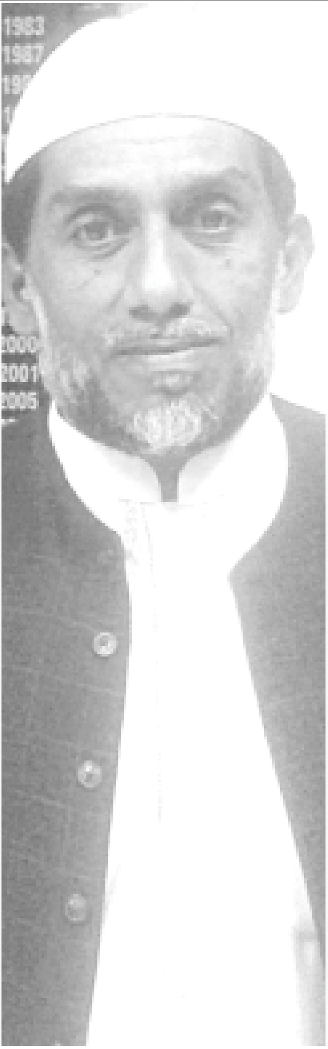

سوہنا سوہنا وطن ، پیارا پیارا وطن
مرحبا اپنی آنکھوں کا تارا وطن

یہ خدا کا کرم ہے ، نبی کی عطا
نسبتوں کا امیں ہے ہمارا وطن

غازیوں اور شہیدوں نے ہر دور میں
خون دے دے کے اپنا نکھارا وطن

قائد ، اقبال کی محنتوں کا ثمر
سب دعاؤں کا اک گوشوارہ وطن

جو بھی خطہ ہے جنت کی تصویر ہے
دیدنی ہے یہ سارے کا سارا وطن

کتنی قربانیوں سے یہ حاصل ہوا
نوجوانو سنبھالو خدارا وطن

ہوں عساکر کہ جمہور ، فیضان سب
مانتے ہیں اسے جاں سے پیارا وطن

فیض رسول فیضان

کیچڑ میں بھیگی بارش

پوری نیندیں
آدھے خواب بچالیتی ہیں
اور جو آدھے مرجاتے ہیں
ان میں بسنے والے لوگ
بے چہرہ ہوجاتے ہیں
اپنا اندر مار کے وہ سب
اپنا آپ بچالیتے ہیں
سورج کی کرنوں پہ لکھے
گیتوں کو
دھوپ تماشا کردیتی ہے
پورا سورج دیکھنے والی
آنکھیں اکثر مرجاتی ہیں
کانوں میں آ ہی جاتی آوازوں کو
کب روپ ملا ہے
مل بھی جائے
کورآنکھوں سے کون انھیں اب دیکھے گا
بارش کی بوندوں سے دھوکر
گائے جانے والے گیت
کون سنے گا
آنکھیں کیچڑ بننے والے گیتوں کو تو
پڑھ لیتی ہیں
سننے والے کان بھی کچھ سن لیتے ہیں
اور بتانے سے قاصر ہیں
خون کی خوشبو کب مرتی ہے
ذائقہ زندہ رہ جاتا ہے

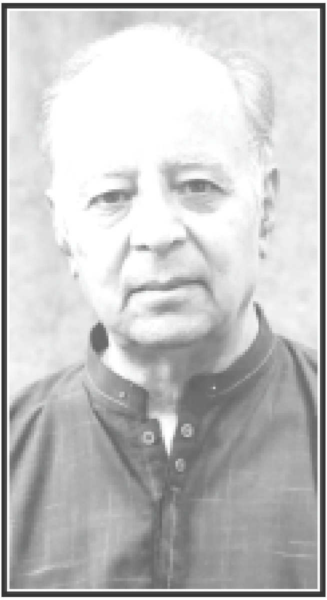

سمیع اللہ عرفی

مُقدّمہ قلم و قرطاس

اِستغاثہ!

اِدھر آؤ، میاں دانش! ہمیں کچھ بات کرنی ہے۔

ہمیں معلوم کرنا ہے، تمھارا مسئلہ کیا ہے؟
تمھارا تجربہ کیا ہے؟ تمھارا مُدّعا کیا ہے؟

دفترِ الزام

بہت لکھتے ہو شعروں پر، بڑی تفہیم کرتے ہو
بڑی باتیں بناتے ہو، بڑی تعمیم کرتے ہو

تغزّل اور تصنّع پر بڑے مضمون لکھتے ہو
سُخن کی ہر روایت کی نئی ترمیم کرتے ہو

کبھی ایہام کے حق میں، کبھی ابہام کے حق میں
بلاغت کے کئی در وا، کئی اقلیم کرتے ہو

عُروض و بحر کے صحرا میں برسوں سے اقامت ہے
زِحافات و علل کی بھی بڑی تقسیم کرتے ہو

ردیف و قافیہ، تمثیل، پیکر، رمز اور بحریں
ہر اک عنوان پر دن بھر بڑی تعلیم کرتے ہو

کبھی کہتے ہو معنیٰ ہی سُخن کا آخری جوہر،
کبھی لفظوں کی حُرمت کی بڑی تعظیم کرتے ہو

نوائے دانش

اگر اذنِ تکلّم ہو تو میں کچھ عرض کرتا ہوں

داورِ ادب اوّل

اجازت ہے! کہو سب کچھ، ہمیں معلوم کرنا ہے
تمہارا مُدّعا سُن کر اُسے مرقوم کرنا ہے

تاویلاتِ دانش

تغزّل یا تنوّع کا، نہ شعروں میں روانی کا
کہاں دعویٰ کیا میں نے سُخن کی ترجمانی کا؟

تخیّل جس طرح آیا، اُسے پابند کر ڈالا
نہ اُولیٰ پر تکبّر تھا، تفاخر تھا نہ ثانی کا

سُخن کی جاودانی کا کوئی دعویٰ نہیں مجھ کو
کسی قصّے کا، افسانے کا یا اُلجھی کہانی کا

قلم کاری کی فن کاری ہمیشہ عارضی سمجھی
فقط بُلبلہ سمجھا اُسے برتن میں پانی کا

ردیف و قافیہ، بحریں کہاں میرا علاقہ تھیں؟
مجھے معلوم ہی کب تھا، میاں، تازہ بیانی کا

داورِ ادب دُوئم

میاں دانش! مجھے بھی کچھ وضاحت چاہیے تم سے
حقیقت جان پاؤں، میں صراحت چاہیے تم سے

دفترِ الزام

بیانِ حُسن کے ہر باب پر افکار رکھتے ہو
اُنہی افکار کا اَحسن ہُنر اِظہار رکھتے ہو

تغزّل، رمز، ایہام و ادا کی شرح کرتے ہو
اُنہی میزان پر اپنا بھی کچھ معیار رکھتے ہو

جنھیں معیار کہتے ہو، جنھیں اسرار کہتے ہو
اُنہی پیمانوں پر اُترے کوئی اطوار رکھتے ہو؟

اگر ہر لفظ کی توقیر پر تم داد دیتے ہو
تو اُس توقیر کے شایاں کوئی اشعار رکھتے ہو؟

نوائے دانش

بہت بہتر، مرے مُنصف! میں کچھ کہہ
لوں، اجازت ہے؟

داورِ ادب دُوئم

اجازت ہے، میاں دانش! بیاں جاری رکھو اپنا
ہمہ تن گوش بیٹھے ہیں، تمھاں جاری رکھو اپنا

تاویلاتِ دانش

میں گُم گشتہ صداؤں کو فقط آگے سُناتا تھا
جو کچھ دل پر گزرتی تھی، اُسے نوحہ بناتا تھا

نہ میری ذات کا دعویٰ، نہ میری فکر کا چرچا
میں اِک بے نام سی خوشبو کا بس رستہ بناتا تھا

جو روشن حرف ملتے تھے کسی خاموش لمحے سے
اُنہی کو لفظ کی صورت میں دُنیا کو دکھاتا تھا

فقط اِتنا ہی کہتا تھا کہ اُڑنا چھوڑ مت دینا
نئے اُڑتے پرندوں کو کہاں میں آزماتا تھا

جہاں کچھ داد مل جاتی، بجا لیتا تشکّر میں
سُخن کے بادشاہوں کے میں پاؤں چھو کے آتا تھا

داورانِ اَدب اوّل و دوم

بڑا ہی منہمک ہو کر تمھاری گفتگو سُن لی
جو شعروں میں بیاں کی ہے، وہ ساری گفتگو سُن لی

ابھی ہم اور سوچیں گے، تمھیں پھر سے بلائیں گے
بہت کچھ اور پوچھیں گے، بہت ہم آزمائیں گے

دُعائے دانش

خُدائے لم یزل! سُن لے، کوئی مصرع عطا کر دے
مری سوچوں کو وُسعت دے، مری چُپ کو صدا کر دے

مرے ہر لفظ کے پیچھے ترا ادراک پنہاں ہو
مجھے خود سے شناسا کر، مجھے خود پر ہی وا کر دے

مری پرواز کا حاصل نہ شُہرت ہو، نہ تحسیں ہو
مری مٹی کا ہر ذرّہ فقط ذوقِ لِقا کر دے

مرے ہونے کا ہر دعویٰ مرے ہونے پہ بوجھل ہے
مجھے دعووں سے خالی کر، مجھے حق آشنا کر دے

مجھے ہونے نہ ہونے کی طلب سے ماورا کر کے
مجھے قطرہ نہ رکھ، مولا! مجھے دریا نُما کر دے

یہ عقل و فہم اور دانش کبھی غالب نہ ہوں مجھ پر
مجھے بس وہ بصیرت دے، جو ظلمت کو ضیا کر دے

دانش عزیز

نظم روٹھ گئی ہے

نظم روٹھ گئی ہے
احساسات سے عاری جملے
کورے کاغذ پر پھول کاڑھتے ہیں
لفظوں کے دھاگوں کے رنگ پھیکے ہیں
اجلے کاغذ پر انکی بدرنگی
بدرنگ جذبوں کی طرح نمایاں ہے
سوچ کی آلودگی کو کوئی بھی خوشبو اوڑھا دو
لہجوں کا گدلا پن نہیں چھپتا
خیال کی کسوٹی پر کوئی مصرعہ نہیں جچتا
محبت روٹھ جائے تو
دل کی طرح خیال بھی
بنجر ہو جاتے ہیں
سیم زدہ زمینوں پر
پھول نہیں کھلتے
نظم ادھوری رہ جاتی ہے"

نائلہ راٹھور

اندھیروں کا تمسخر

کم نگاہی کے بطن سے جنم لیتا ہے
ایک دھندلا خواب
جسے تعبیر کی روشنائی پوچھتی ہے

زندگی
جلتے بجھتے لمحوں میں
کتنی بھیانک
پھر بھی خوبصورت ہے

نہ جانے
کتنے رخ
ہماری آنکھوں سے اوجھل
ہمارے سامنے واضح ہیں

وہ کنول کا پھول
کدھر گیا؟
جسے محبت کی چنبیلی نے چھوا تھا

وہ خیال کی ڈھارس
کہاں چھپ گئی؟
جو جھیل کنارے آباد تھی

کیا باغ کے قریب
صحرا کی خالی حویلی کا عکس
تیرس کی قید سے نکل آیا ہے؟

کہیں سے
روشنی کی سچائی
ضرورت کی تقسیم لے آؤ
مجھے اندھیروں کا تمسخر نہیں چاہیے

اندھیرے چارسو
گم شدہ آوازوں کے تعاقب میں
مجھے شور کی ترغیب
گمنامی میں رہنے کا مشورہ دیتے ہیں

اور وہ
محبت کا آفتاب
دنیا کی نگاہوں سے اوجھل
کہاں غائب ہے؟

امجد بابر

چلو وہ عہد وفا آج توڑ دیتے ہیں

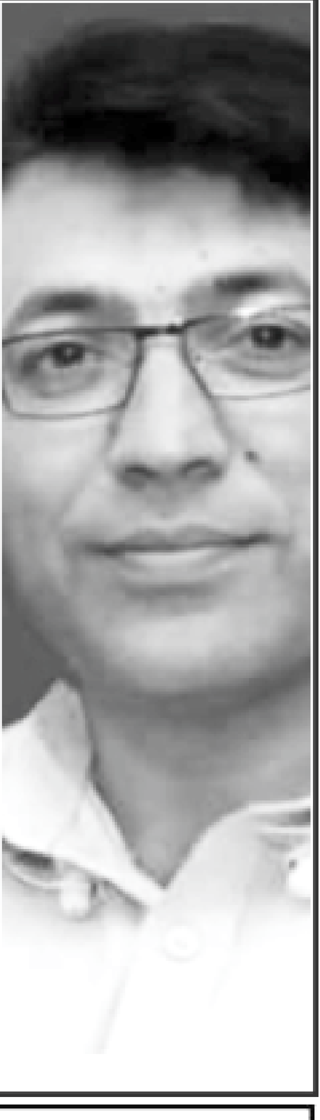

عابد خان عابد

وہ عہد جو کبھی کھلتے گلاب کی مانند
تمہارے جوڑے میں سجتا تھا میرے کار میں
وہ عہد جو کبھی الہام صبح کی صورت
شبِ ملامت جاں پر اترتا رہتا تھا
وہ عہد جو دلِ ویراں کی روشنی تھا کبھی
جو عہد عشق پرستوں کی بندگی تھا کبھی
چلو وہ عہد وفا آج توڑ دیتے ہیں
جو عہد آج پرانی کتاب کی مانند
عذاب ہجر میں دیمک زدہ پڑا ہے کہیں
جو عہد مرقد جاں کی اداسیوں پہ چلی
خیال یار کی شمعیں بجھائے دیتا ہے
جو عہد آج فقط ریگ دشت فرقت ہے
جو عہد اج فقط باعث ندامت ہے
اسی کا نام وفا ہے تو چھوڑ دیتے ہیں
چلو وہ عہد وفا آج توڑ دیتے ہیں

مرا چاند

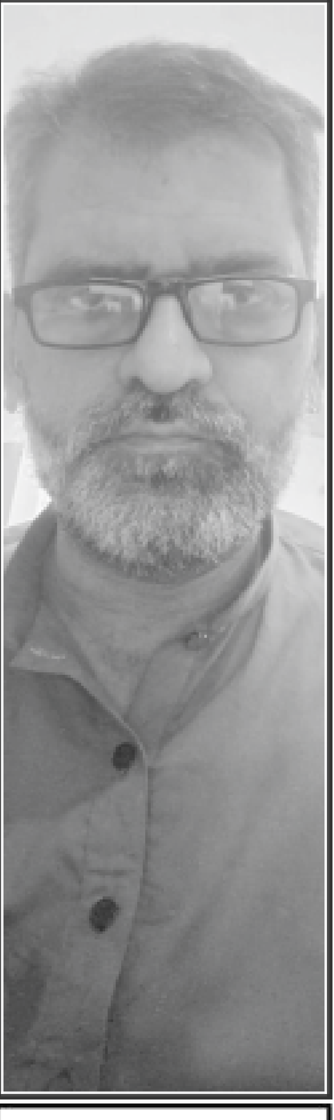

محمد عبداللہ

کارِ جہاں کے شور سے پرے
شبِ تنہائی کے
آخری پہر میں
کبھی محبت سے،
کبھی بے پروائی سے
جلوہ گر ہوتا ہے

پل بھر میں
اپنی دودھیا روشنی لیے
میرے جسم کی ہر پور پر پھیل جاتا ہے
مجھے سہلاتا ہے
آنکھوں کو قرار دیتا ہے
دل کا چراغ روشن کرتا ہے

صدیوں سے
اک وعدۂ فردا پہ
میں اُس سے جدا ہوتا ہوں
مرا چاند
پل پل مجھے یاد کرتا ہے

ادھورا پن

عمران شاہد

محبت کی ناکامی

آدھی روح چرا لیتی ہے

تم...

میری دوسری محبت تھیں

میری حیاتِ ثانیہ

اور اب

جب تم بھی چھوڑ گئی ہو—

تو میں نے من میں جھانک کے دیکھا

اب میرے دامن میں بچا کیا ہے؟

--------انتخاب--------

- خالد احمد -

--------نعمان منظور--------

مجھ کو خرید پیار بھرے بول، بول کر

قیمت چکا مری، سرِ بازار دوستی

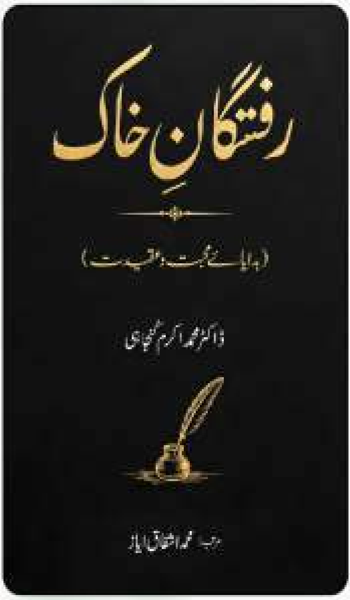
رفتگانِ خاک
مرتب: محمد اشفاق ایاز

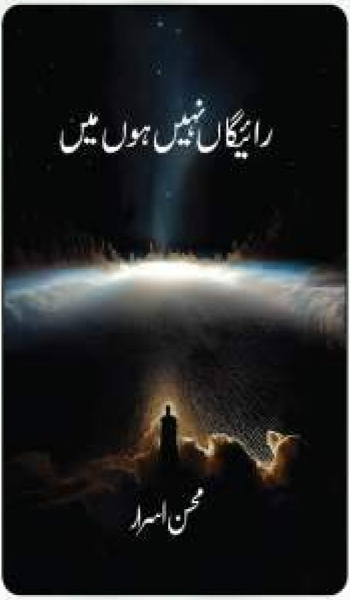
رائیگاں نہیں ہوں میں
محسن اسرار

غزلیات

روزنِ شب
احمد ساقی

14th
August
Happy Independence Day
یوم آزادی مبارک